زندگانیِ بے نظیر

سید محمد عبد الغفور شہباز

(سوانح عمری نظیر)

زندگانیٔ بے نظیر

(سوانح عمری نظیر)

تالیف
سیّد محمد عبدالغفور شہباز

مرتب
سیّد محمد حسنین

ترقی اردو بیورو نئی دہلی

سنہ اشاعت : 1981 — شک 1903
© ترقی اردو بیورو، نئی دہلی
پہلا اڈیشن : 1000
قیمت :
سلسلۂ مطبوعات ترقی اردو بیورو 247

Zindagani-e-Benazeer
by S. M. Shahbaz
Edited by S. M. Hasnain

Rs. 19/-

اس کتاب کی طباعت کے لیے حکومتِ ہند نے رعایتی قیمت پر کاغذ فراہم کیا

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8 آر کے پورم نئی دہلی 110022
طابع : اے جے پرنٹرس نئی دہلی

پیش لفظ

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے حکومت ہند کی وزارت تعلیم و ثقافت کے تحت ترقی اردو بیورو کے ذریعے جن لائحوں اور منصوبوں کو عملی شکل دی جارہی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مختلف جدید علوم پر کتابیں ماہرین سے لکھوائی جائیں اور ان علوم سے متعلق اہم مغربی و مشرقی کتابوں کے تراجم شائع کیے جائیں جو نہ صرف زبان بلکہ قوم کی ترقی میں بھی مفید و معاون ثابت ہوں۔

اس منصوبے کے تحت ترقی اردو بیورو اب تک خاصی تعداد میں کتابیں شائع کر چکا ہے۔ ان میں شعروادب، تنقید، لسانیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، تجارت، زراعت، امور حکومت، معاشیات، عمرانیات، قانون، طب، فلسفہ اور نفسیات پر اعلیٰ کتابوں کے علاوہ تعلیم بالغان، بچوں کے ادب، سائنس اور تکنیکی علوم سے متعلق ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جو اردو کی نصابی ضرورتوں کو بھی کسی حد تک پورا کر رہی ہیں۔ ان موضوعات پر اچھی آسان اور معیاری کتابوں کی جو کمی اردو حلقوں میں شدت سے محسوس کی جارہی تھی وہ بیورو کے ذریعہ آہستہ آہستہ پوری ہو رہی ہے۔ ترقی اردو بیورو کی شائع کردہ کتابیں حسن طباعت کا ایک معیار قائم کرتی ہیں اور ان کی قیمت بھی نسبتاً کم رکھی جاتی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان کتابوں کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بیورو کے جامع منصوبوں کے تحت اردو انسائیکلو پیڈیا، اردو لغت (کلاں) اردو لغت (برائے طلبہ)، انگریزی اردو لغت، اردو انگریزی لغت، بنیادی متون کی اشاعت، اردو کتابیات کی تیاری اور مختلف علوم کی اصطلاح سازی کے کام بھی جاری ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے ہمیں ملک بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔

زیر نظر کتاب ترقی اردو بیورو کے اشاعتی پروگرام کا ایک جز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو داں حلقوں میں اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

کے۔ کے۔ کھلر

ڈائریکٹر، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

فہرست

دیباچہ سوانحِ عمریِ نظیر	7
باب 1:	
نظیر کی پیدائش	12
نظیر کی طفولیت	14
نظیر کے مشاغلِ لہو و لعب	28
باب 2:	
نظیر کی تعلیم و تربیت	46
نظیر کی جوانی	62
نظیر کی میلے ٹھیلوں میں شرکت	84
نظیر دہلی سے آگرے جاتا ہے	105
باب 3:	
نظیر کی شادی	109
نظیر کی پیری	128
نظیر کے اخلاق	136
نظیر کا مذہب اور مذاقِ تصوف	149
نظیر کا مذاقِ موسیقی	166
باب 4:	
نظیر کے شاگرد	173
اشعارِ نظیر کا تتبع ہے	187

نظیر کی تشبیہ برن سے 191
نظیر اُردو کے شیراز کا سعدی ہے 194
اُردو کے شعراء میں شیکسپیر ہونے کی صلاحیت کس میں ہے 197
مضامین کے اعتبار سے نظیر کے کلام کی قسمیں 223
نظیر کے کلام نظم کی قسمیں 225
نظیر کی تصانیف 230

باب : 5

نظیر کی شاعری پر عام رائے 237
غزلوں پر رائے 242
رُباعیوں پر رائے 271
قصیدوں پر رائے 274
تصانیف نثر پر رائے 278
نظیر کے لطائف 280
نظیر کے صنائع 282

باب : 6

کلامِ نظیر کے عیوب 315
نظیر کا باغ 344
نظیر کا مٹھائی کا پٹل 354
نظیر کی عورتیں 357
نظیر کی کتاب الامثال 358
نظیر کی نسبت لوگوں کی رائے 371

دیباچۂ سوانحِ عُمریِ نظیر

اللہ اللہ! وہ بھی کیا دن تھے۔ میری صبح زندگانی تھی اور مہر پدری کا آغاز طلوع۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور دھیمی دھیمی شعاعیں پھیل رہی تھیں۔ تفہیم کے جھکولوں سے شاخ و برگ پیڑ سے جھوم رہے تھے۔ تعلیم کے دریچے سے میں گلستاں بوستاں کی سیر کر رہا تھا۔ بیل بوٹوں سے آنکھوں کو تازگی حاصل ہوتی تھی اور پھول پتّیوں سے دماغ معطّر ہوتا تھا۔ اسی عالم میں جناب والد ماجد کے گلبنِ حافظہ پر کسی روز نظیرؔ کا بُلبُل طبع چہکا۔ نغمہ یہ تھا:-

گر شال اُڑھائی تو اسی شال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

میٹھے سُر اور پیارے بول۔ وجد ایک امر ضروری تھا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا کہ اس نغمے نے کیا مزہ دیا[1]۔ وہ صدا آج تک کانوں میں گونج رہی ہے اور خالی از لطف نہیں۔ بُلبُل تو چہک کر اُڑ گیا مگر ٹُوں[2] اب تک دل میں گڑی ہوئی ہے۔

یاد پڑتا ہے انھیں دنوں میں یہ زمزمہ بھی سُننے میں آیا تھا۔

عاشق ہے تو مولیٰ کو ہر اک رنگ میں پہچان

اور شاید یہ برڈن آو سونگ[3] بھی:-

---

[1] غالباً یہ 1868 یا 1869 کا واقعہ ہے۔ (ش)

[2] ٹُوں۔ زبان۔ منقار پرندہ (م)

[3] برڈن آو سونگ انگریزی میں آستائی کو کہتے ہیں چونکہ ٹیپ بھی آستائی کا کام دیتی ہے لہٰذا اس پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ یہ انگریزی اصطلاح اس مقام پر بغرضِ لطفِ ابہام لائی گئی ہے۔ (ش)

سب ٹھاٹھ[1] پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا[2]

ایک گلابی ورق پر نستعلیق ترکیبوں سے یہ خط و خال بھی نُہ مرکس کی نظر ہوئے تھے۔

خدا گر مجھ گدا کو سلطنت بخشے تو اے یارو
بخالِ ہندوشش بخشم سمرقند و بخارا را
نظیرؔ اس طرح سے تضمین کر تو مصرعۂ حافظ
کہ بر نظمِ تو افشاند فلک عقدِ ثریا را

مقبولیت نے جو تخم مزرعِ دل میں نصب کیا تھا تو مدتوں نسیان اور تغافل کے پتھر کے نیچے دبا رہا۔ جب کلکتے[3] میں ایڈیٹری نے میرے لیے کرسی خالی کی تو وہاں بعض عنایت گستر ہاتھوں نے اس پتھر کو ہٹایا اور اس تخم کو از سرِ نو پھلنے پھولنے کا موقع ہاتھ آیا۔

اخبار جس کا میں ایڈیٹر تھا چونکہ ہندوستان کے انگریزی دارالسلطنت سے نکلتا تھا اور بادشاہ کمپنی کے زیرِ اہتمام لہٰذا دارالسلطنت کہلاتا بھی تھا۔ اس کے مالک معمولی تعلیم کے پنجابی تھے۔ پڑھے لکھوں کی صحبت میں بیٹھتے اُٹھتے چشم بد دُور کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ گئے تھے۔ ایک دن سڑک پر کوئی خوش آواز فقیر نظیرؔ کا کلام (شاید کوڑی نامہ) صدا میں پڑھتا جا رہا تھا۔ سن کر بے ساختہ ان کی زبان سے یہ فقرہ نکلا "اس شخص کا کلام بھی کتنا پاکیزہ ہوتا ہے"۔ اسی دن سے نظیرؔ کی طرف پھر بکر بڑے زور سے خیال رجوع ہوا اور آج تک رجوع ہے۔ اسی زمانے سے پھر یہ معمول ہوا کہ جب کوئی کلام نظیرؔ کا نظر سے گزرتا، شوق سے دیکھتا۔ توجہ سے اس کے مطالب پر غور کرتا اور دل سے محظوظ ہوتا۔ جس قدر زیادہ اس کا کلام پڑھتا گیا، اس کی عظمت بڑھتی گئی۔

جنوری 1885 میں جب بیمار ہو کر کلکتے سے گھر آیا تو ان دنوں مجھ کو اس کے کلام سے خاص عشق تھا۔ اتفاق سے مکان پر چند نامے نظیرؔ کے ایک کتاب میں مجلّد ملے۔ عبدالرحمٰن خان شاکر نے بعض دیندارانہ اور عقیدت مندانہ خیال سے ان کو انتخاب کر کے نیلگوں کاغذ پر لکھا چھپایا

---

[1] ٹھاٹھ۔ اسباب۔ مال و متاع۔ دھن دولت۔ جائداد (ش)

[2] بنجارا۔ اناج کی سوداگری کرنے والا۔ ایک قوم کا نام جو غلے کی سوداگری کرتی ہے۔ بیوپاری چل بیچے سو بنجارا۔ رکھے سو ہتیارا۔ (ش)

[3] مابین 1880 و 1881 (ش)

تھا۔ یہ مجموعہ وہی تھا جو جناب والا کے ہاتھ میں، میں نے کسی زمانے میں دیکھا تھا۔ بڑے شوق سے دیکھا اور نہایت دل لگا کر اس کی بندشوں اور خیالات کو اخذ کیا۔ جا بجا بعض عیوب بھی تھے، مگر خوش عقیدگی کی نظر بندی سے اصلاً نظر نہ آئے۔ کسی شاعرِ عرب نے سچ کہا ہے:۔

وعین الرضا عن کل عیب کلیلۃ

نظیرؔ کے دامن میں جہاں کہیں دھبے نظر آتے تھے، معتقدین کی نظریں صابون بن کر صاف دھو دیتی تھیں۔ میرے بزرگوں میں ایک مولوی ہو گزرے ہیں۔ اکرم علی ان کا نام تھا اور گوہر تخلّص۔ طبیعت رسا رکھتے تھے اور اشعار آب دار نکالتے تھے۔ ایک روز میں ان کے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ ان میں کچھ اوراق ایسے بھی نکلے جن میں نظیرؔ کے بہت سے اشعار، مشہور غزلیں اور منتخب نامے درج تھے۔ ان اشعار سے جہاں فائل کی خوبی اور انتخاب کرنے والے کا سلیقہ ظاہر ہوا، ایک عقدہ یہ بھی حل ہوا کہ نظیرؔ کا کلام جہاں ملتا تھا، شعراء اپنے ذہن کو قوت اور طبیعت کو فیض پہنچانے کے لیے بطور یاد داشت غنیمت جان کر لکھ لیا کرتے تھے اور مدتوں نقلِ محفل رکھتے تھے۔

یوں ہی درجہ بدرجہ نظیرؔ کی مقبولیت ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ دو ایک نظمیں بھی میں نے اس کی تقلید میں لکھیں مثلاً اتفاق نامہ، آئینۂ تہذیب۔ جب بتدریج میں نظیرؔ کا حد سے زیادہ معتقد ہوا تو طبیعت اس کے حالات کی جویا ہوئی۔ مدتِ اول تذکرے کل اُلٹ ڈالے، مگر تفصیل خاطر خواہ ہر جگہ عنقا۔ دوسرا ہوتا تو ہار کر بیٹھ رہتا مگر دل کی لگی بُری ہوتی ہے۔ دل اس پر بھی خواہ مخواہ اپنے ارادے پر اڑا رہا کہ نظیرؔ کے سوانح عمری مرتّب کیے جائیں، اور مفصّل مرتّب کیے جائیں اور تذکرہ نویسوں کی بدخیالی سے اس ناصحِ شفیق پر جو ظلم ہوئے وہ مٹائے جائیں، اور بزور مٹائے جائیں۔ کسی شاعر ہندی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جن ڈھونڈا تن پائیاں، گہرے پانی پیٹھ

تلاش میں بڑی برکت ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر اتنے حالات طے کہ خود میرے خیال میں بھی نہ تھے۔ سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ نظیرؔ کا کلیات لکھنؤ سے منگوایا اور نہایت غور سے اس کا مطالعہ کیا۔ ہر نظم سے ایک نتیجہ اس کے حالاتِ زندگی کے متعلق نکالا اور ہر شعر سے اس کے کلام کی خوبی کے وجوہات مستنبط کیے۔

کلیات جو ہاتھ آیا، زمانۂ موجودہ کی نفاست پسندی اور قطع و برید قانونی کی وجہ سے

ناتمام تھا۔ مخدومِ اکبر حکیم اصغر حسین فرخ آبادی کی عنایت سے مطبع احمدیِ آگرہ کے نسخے نے اس داغِ ناتمامی کو مٹایا۔

پہلے جو کلیات آیا تھا وہ منشی نول کشور کے مطبع کا تھا۔ دل نے کہا منشی صاحب ہی سے خط و کتابت کرو۔ کلیات چھاپا ہے۔ شاید بعض جزئی حالات بھی جانتے ہوں۔ منشی صاحب کو جو خط گیا تھا اس کا جواب منشی[1] جالیا پرشاد صاحب نے عنایت کیا۔ خط[2] میں منجملہ اور مضامین کے ایک مضمون یہ بھی تھا کہ میاں نظیر ہر سال فرخ آباد کو جایا کرتے تھے۔ فرخ آباد کے تعلق نے حکیم صاحب کی طرف ذہن کو منتقل کیا۔ انھوں[3] نے اپنے داماد احمد[4] علی خاں کا پتہ دیا جو اُن دنوں آگرے میں تشریف رکھتے تھے۔ احمد علی خاں نے مرزا نوازش علی بیگ کا نشان[5] بتایا جو میاں نظیر کی نواسی کے اکلوتے داماد ہیں۔ مرزا نوازش علی بیگ سے معلوم[6] ہوا کہ میاں نظیر کی نواسی ابھی جیتی جاگتی ہیں اور میاں نظیر کے بہت سے حالات ان کو معلوم ہیں۔ غرض یوں رسلسلہ بسلسلہ اصل چشمۂ مقصود تک پہنچا اور پہنچا تو سیراب بھی ہوا۔

جون 1892 میں ایک ضرورت سے میں آگرے گیا ہوا تھا۔ اسی زمانے میں بیک کرشمہ دو کار مرزا نوازش علی بیگ کی نوازش سے بھی فائدہ اُٹھایا۔ ان کی خوش دامن سے بھی مل کر خوش خوش دامنِ مقصود بھر لایا۔ میاں نظیر کے مزار کی بھی زیارت ہوئی۔ ان کی غیر مشتہر تصانیف سے چار پانچ کتابیں بھی ہاتھ آئیں۔ میاں غلام محمد رہا ہنوز قیدِ حیات سے آزاد نہ ہوئے تھے۔ ان سے بھی کچھ استفسارات رہے۔ استفسار کی یہ ابتدا تھی مگر پھر تو اس کا سلسلہ اس قدر بڑھا کہ جو شخص آگرے کی طرف کا ملتا اس سے کچھ نہ کچھ حالات دریافت کر لیتا۔ فقیر بھیک مانگنے آیا ہے، لب و لہجے سے آگرہ کا معلوم ہوا، بٹھا کر اسی سے کچھ باتیں پوچھ لیں۔ کوئی سیاح صاحب کتابیں بیچتے ہوئے تشریف

---

[1] سکریٹری اودھ اخبار لکھنؤ (ش)

[2] نمبری 1882 مورخہ 11 ر جولائی 1891 (ش)

[3] بذریعہ مراسلہ 28 ر اکتوبر 1891 از فتح گڑھ ضلع فرخ آباد (ش)

[4] انسپکٹر رکاب گنج۔ آگرہ (ش)

[5] بذریعہ مراسلہ 26 ر اکتوبر 1891 (ش)

[6] بذریعہ خط و بالمشافہہ (ش)

لائے ہیں، اکبرآباد کی بہت باتیں بیان کرتے ہیں۔ اگر انہی سے کچھ حقیقت دریافت کرلی۔ جب لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ میں اس قدر نظیر کے حالات کا جویا ہوں تو بعض اشخاص خود بے پوچھے بھی بتانے لگے۔

چونکہ نظیر کے مزاج پر موزونی کے ساتھ مزاح بھی غالب تھی تو خاص اس پہلوئے طبیعتِ انسانی کی تحقیق کے لیے اپنے زمانے کے بعض قدیم نمونۂ طباعی وظرافت کی بھی مدتوں صحبت رکھی اور ان کے اخلاق وعادات حرکات وسکنات کا برسوں دُوربینِ تحقیق سے مشاہدہ کیا۔ غرض بقول سعدیؒ۔

تمتّع زہر گوشۂ یافتم　　　ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

ماخذ تو اس قدر قلیل مگر کتاب باعتبار مضامین خاصی عمرو عیّار کی زنبیل! اس کا سارا بھید بند ہے دو لفظوں میں تفتیش اور تخیل۔ تفتیش نے تخیل کو ابھارا تخیل نے تفتیش کو چمکایا۔ دونوں مل کر مضمون کو لے اُڑے

واں پہنچی ہے فریاد کر لپٹے نظر آتے　　　دُم دار ستارے ہیں، فریاد کی دُم میں

رُباعی

کیا اک تمھیں نور کی دکھائیں قمری　　　ہر دم جو پڑی الاپتی ہے ٹھمری
شہباز کے ہاتھ میں وہ قمری ہے قلم　　　ٹھمری ہے نظیر کی سوانح عُمری

اشتہار میں اس کتاب کا نام نظیر نامہ مشتہر ہوا تھا۔ اس خیال سے کہ نظیر مشہور ناموں ہی سے ہے۔ مگر اتفاق سے بعض تاریخی نام ایسے عمدہ نکل آئے ہیں کہ ان کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ تاریخ کہتی ہے۔ زندگانیٔ بے نظیر، کہو، یا اکبرآباد کے نظیر کی سوانح عُمری۔ اشتہار کہتا ہے، نظیر نامہ سے بہتر کوئی نام نہیں۔ تجویز کشمکش میں ہے۔ اشتہار اور تاریخ کی کشمکش میں "دل آویز" بیچ بچاؤ کو اُٹھ کھڑا ہوا اور پاؤں پڑکر دونوں کو راضی کیا۔ اب چاہے "نظیر نامۂ دل آویز" کہہ دیجیے یا "زندگانیٔ بے نظیر" یا "اکبرآباد کے نظیر کی سوانح عمری" ایہام کا فتویٰ ہے۔

خیر الامور اوسطہا

جام باغ، حیدرآباد، دکن
20 اگست 96

دیباچہ طراز
محمد عبدالغفور شہباز

باب ۱

نظیر کی پیدائش

محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ ہو اور شہر میں رنگ رلیاں نہ منائی جائیں، کوئی کہنے کی بات ہے۔ درو دیوار سے رنگ ٹپکتا تھا اور گلی گلی سے راگ اُبلتے تھے۔ لال قلعہ لالوں لال تھا اور چاندنی چوک مالا مال۔ لیکن عام قاعدۂ قدرت کے مُطابق اس راگ رنگ کے زمانے میں بھی بعض گھر نوحہ و شیون سے خالی نہ تھے۔ ہرچند زمانہ بہت گزر گیا ہے مگر خیال کی دُوربیں آنکھوں سے ہم اب بھی دیکھتے ہیں کہ شہر کے کسی گوشے میں خوش وقت ہمسایوں سے گھرے ہوئے گھر میں دو نیک بختیں نہایت ملول بیٹھی ہیں اور رفع ملال کی کچھ نسوانی معصومانہ تدبیریں سوچ رہی ہیں۔ بڑی بی کی پیشانی اور بھنوؤں پر تو ہم نے ایک خاص کھنچاوٹ پیدا کر رکھی ہے۔ صاحب زادی کی آنکھیں گو اشک بار نہیں مگر پُرنم ضرور ہیں۔ غم کی تصویر کوئی نقاش اس سے بہتر کھینچ نہیں سکتا۔ نگاہ بارِ غم سے اُٹھتی نہیں۔ ہر وقت جُھکی ہی رہتی ہے۔ رنگت گو زرد نہیں ہے مگر پھیکی ضرور پڑ گئی ہے۔ خون آہستہ آہستہ جسم میں گھٹ رہا ہے۔ بعض وقت گزشتہ مُصیبتیں یاد آ کر دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ یکایک رنگ فق ہو جاتا ہے اور دفعتہً آنکھوں سے غم آلود مگر خوش نما آنسوؤں کا سلسلہ جاری ہو پڑتا ہے۔ عاشق زارماں یہ منظر دیکھ نہیں سکتی۔ وہ بھی بلبلا اُٹھتی ہے اور پھر ساون بھادوں مل کر برسنے لگتے ہیں۔ بلکہ ع

یوں نہ برستے دیکھے ہوں گے مل کے کسی نے ساون بھادوں

لونڈی، مامائیں یہ سماں دیکھ کر ہمدردی کے رومال لے کر دوڑتی ہیں اور دل

سوزی کے ہاتھ سر پر رکھ کر خیر خواہی سے آنسو پونچھتی ہیں۔ آنسو تھمتے ہی پاس پڑوس کے اور مصیبت مندوں کا ذکر چھڑ جاتا ہے اور جھاڑ پھونک اور دعا تعویذ کے تجربے بطور علاج بیان ہونے لگتے ہیں۔ ملا سیانوں، درویشوں، مجذوبوں کی زندہ کرامتیں ایک نہیں بیسیوں چشم دید شہادت کے ساتھ بڑے زور سے مذکور ہوتی ہیں
بو علی قلندر اور نظام الدین اولیا اور قطب صاحب اور نصیر الدین چراغ دہلی اور شاہ سرمد کی اولاد بخشی کی نظیریں سیکڑوں پیش کی جاتی ہیں۔ خوش اعتقاد و نیک بختیں پہلے بے اعتنائی سے سنتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اُن کی توجہ اُدھر زیادہ مُڑنے لگتی ہے۔ پھر ہر بات وحی اور الہام کا رُتبہ بہم پہنچاتی ہے اور آخر یہ ہوتا ہے کہ بڑی بی بڑے اصرار سے فرماتی ہیں کہ خدا کے لیے میری بچی کے لیے بھی کوئی تدبیر سوچو بلکہ ہوسکے تو آج ہی فلاں شاہ صاحب کے ہاں جاؤ اور اُن کو خدمت سے خوشامد سے منّت سے سماجت سے جس طرح بنے ہمارے حال پر مہربان کرو۔

یہ دو نیک بختیں جن کا ابھی ذکر ہوا گو اُس وقت نہ ہوں مگر اب تو یقیناً نظیر کی ماں اور نانی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نظیر کی ماں کی اولادیں زندہ نہ رہتی تھیں۔ بارہ اولادیں ہوئیں اور بارہوں مر گئیں۔ دل کا ایک ناسور بہت ہوتا ہے جب بارہ بارہ ہوں تو پھر اس دل کے درد اور ٹیس کا کیا پوچھنا ہے۔ نسوانی تدبیریں زیادہ فوق العادۃ امور سے متعلق ہیں۔ ماما دائیوں کے ذریعے سے ایسی تدبیریں ایک نہیں سیکڑوں کی گئیں مگر کوئی بکار آمد نہ ہوئی۔ تجسّس کے سلسلے میں ایک بُزرگ ایسے بھی ملے جنھوں نے ماما کی زبانی نظیر کی نانی کو کہلا بھیجا کہ لونڈی ماماؤں کو کیا بھیجتی ہے۔ کام چاہتی ہے تو داماد کو بھیج۔ محمد فاروق نام کے اعتبار سے جو کچھ ہوں گے مگر معمولی تعلیم کے آدمی تھے۔ بارہ اولادیں کھو چکے تھے۔ ایک معتقد علیہ اور مشارٌ الیہ فقیر کا جو یہ پیام سُنا، مر کے بَل دوڑے۔ آنکھوں سے وہ پھُول اُٹھا لائے جو فقیر نے اُن کو اپنے گلشن کرامات سے عنایت کیے۔ یہ پھُول گنتی میں پانچ تھے۔ فقیر کی ہدایت تھی کہ اُن کو سُونگھ کر دریا میں ڈال دینا اور جو کیفیت ان پھولوں کی ہو پھر مجھ سے کہہ جانا۔ عقیدت میں شور بور جمنا کنارے پہنچے اور ایک خوشگوار تشویش کے ساتھ اُن پھولوں کو پانی میں پھینکا۔ اُن میں سے ایک

پھُول تو سیدھا پڑا، باقی سب پٹ۔ یہ خبر لے کر پھر فقیر کے پاس پہنچے۔ فقیر نے بشارت دی کہ جاؤ خوش ہو، ایک لڑکا تیرا زندہ ہوگا، زندہ رہے گا اور تیرے نام کو زندہ کرے گا۔ قابلیت اُس کی غنچے کی طرح شگفتہ ہوگی اور خوشبو اُس کی پھُول کی طرح تمام جگہ پھیلے گی۔ حسنِ اتفاق یہ کہ اسی کے بعد آثار حمل بھی ظاہر ہوئے۔ عقیدت دو بالا ہو گئی۔ نویں مہینے میاں نظیر دبستان عدم سے مکتب ظہور میں آئے۔ چونکہ کئی اولادوں کو مار کر ہوئے تھے، جُرم سنگین تھا۔ لہٰذا ناک کے ساتھ دونوں کان بھی چھیدے گئے۔ اِس سزا پر معصوم آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ بطور عذر گناہ خوش تر از گناہ، ناک میں بُلاق ڈالا گیا۔ کانوں میں دُر لٹکے۔ بُلاق نے نتھنوں سے سرگوشی شروع کی۔ دُر نے خدا جانے کانوں میں کیا پڑھ پھُونکا۔ زینت لے اُڑی۔ بھولا پن مُنہ دیکھتا رہ گیا۔

نظیر کی طفولیت :۔

ڈیڑھ پونے دو سو برس قبل لڑکوں کی پرورش اور تربیت کا کیا ڈھنگ تھا اس کا بیان اِس وقت میں آسان نہیں ہے۔ لیکن از بس کہ ہمارے ہندوستانی بھائی کن زر وٹیو[1] خیالات کے ہیں اور دستورِ قدیم کو چھوڑنا بہت کم پسند کرتے ہیں اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ قریب قریب کُل باتیں یہی ہوں جو اب رائج ہیں۔ زچّہ خانے سے لے کر مکتب خانے تک ساری باتیں وہی ہوں گی جو اب ہر شریف گھرانے میں دیکھی جاتی ہیں، چھٹی، چلّہ، تارہ دِکھائی، بگیر بچہ وغیرہ خدا جانے کیا کیا رسمیں ہوتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ نظیر کی پیدایش میں یہ سب باتیں نہ ہوئی ہوں گی۔ نظیر پیدا ہوا ہوگا تو کیا اس کی بُزرگ عورتوں نے اُس کے لیے

---

[1] کنزرویٹو یعنی قدیم دستور پر اَڑا رہنے والا گروہ جو پُرانی باتوں کا چھوڑنا اور نئی باتوں کا اختیار کرنا بہت کم پسند کرتا ہے۔ سر لیپل گریفن نے ہندوستانیوں کے کنزروٹزم یعنی قدامت پرستی کو ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو کے کسی پرچے میں نہایت مدلّل اور خوشگوار طریقے سے ثابت کیا ہے

کپڑے اور زیور نہ بھیجے ہوں گے[1]؟

جب نظیر پیدا ہوا ہوگا تو کیا محلّے اور قرابت کی عورتیں جمع نہ ہوئی ہوں گی؟ کیا ڈھول مجیرے لے کر میراثنیں نہ پہنچی ہوں گی ــــ؟ کیا زچّہ گریاں نہ گائی ہوں گی؟ کیا لوگوں نے دعائیں نہ دی ہوں گی؟ کیا بچے کی صورت شکل اور قوی پر راتے زنی نہ ہوتی ہوں گی؟ کیا لوگوں نے زچّہ اور بچّہ کو دعائیں نہ دی ہوں گی؟ کیا دائی دُہرا انعام نہ مانگتی ہوگی؟ کیا بنجیری کے تھال تیار نہ ہوتے ہوں گے؟ کیا سونٹھ سنٹھورے کا سامان نہ ہوا ہوگا؟ کیا بھانڈ بھگتیے اور ہیجڑے

---

[1] زچّہ خانے کا سامان کنہیا جی کے جنم میں خود نظیر یوں بیان کرتا ہے:۔

سب ناری آئیں گونے کی اور پاس پڑوسن آبیٹھیں　　کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں، کچھ گیت سنا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم مکھ رس بالک کا بلہاری ہوکر دیکھ رہیں　　کچھ تھال بنجیری کے رکھتیں، کچھ سونٹھ سنٹھورا کرتی تھیں
کچھ کہتیں تھیں "ہم بیٹھیں ہیں جگ آج کے دن کا لینے کو"
کچھ کہتیں "ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا دینے کو"

کوئی گُھٹی بیٹھی گرم کرے، کوئی ڈالے اسپند اور بھوسی　　کوئی لائی ہنسلی اور کھڑوے[2] کوئی کُرتہ ٹوپی، میوہ گھی
کوئی دیکھے رُوپ اس بالک کا، کوئی ماتھا چومے ہر ہری　　کوئی بھنوؤں کی تعریف کرے، کوئی آنکھوں کی، کوئی پلکوں کی
کوئی کہتی "عمر بڑی ہووے اے بر تمہارے بالے کی"
کوئی کہتی "بیاہ بہو لاؤ اس آس مُرادوں والے کی"

ہر چند یہ سامان ہندوؤں کے ہاں کا ہے لیکن مسلمانوں نے اکثر اس قسم کی باتیں ہندوؤں سے اخذ کی ہیں اس لیے اُن کے ہاں کا سامان بھی قریب قریب یہی ہے۔ محلہ اکبرآباد میں قاعدہ ہے کہ جب کسی کے گھر میں بیٹا ہوتا ہے تو یہ لوگ اپنی ڈھولک وولک لے کر آن موجود ہوتے ہیں اور گا بجا کر انعام طلب کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کے دیار کے ہنوڑیے کی جگہ ہیں۔

بیٹا ہوا کسی کے جو سُن پائیں ہیجڑے　　سُنتے ہی اُس کے گھر میں پھر آجائیں ہیجڑے
ناچیں بجا کے تالیاں اور گائیں ہیجڑے　　لے لے کے بیل[3] بھاؤ بھی بتلائیں ہیجڑے
اُس کے بڑے نصیب جہاں آئیں ہیجڑے

[2] کھڑوا ہندوؤں کا ایک زیور ہے جو کلائی پر پہنا جاتا ہے۔ (ش)

[3] وہ انعام جو ہیجڑوں اور چونے والیوں کو دیا جاتا ہے۔ دِلّی میں اسی کو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اَجمع نہ ہوئے ہوں گے۔

نظیر کا حُلیہ:۔

عورتوں اور اُن کی رعایت خاطر سے مردوں نے جو خوشی نیگ جوگ کے دینے لینے میں ظاہر کی ہو گی اور اس نومولودِ مسعود کے ہونے کی خوشی میں باجے گاجے سے کام لیا ہو گا اس کا تصوّر ہر شخص اچھّی طرح کر سکتا ہے، لیکن عاقل اور دُور اندیش عورتیں کم اور مرد زیادہ اُس لڑکے کے تیور سے اس کی ذہانت اور فطنت استنباط کرتے تھے اور اُس کی ہر ادا سے سمجھتے تھے کہ لڑکا ہونہار ہے۔ آنکھیں بڑی ہوں یا چھوٹی لیکن ان کی سرعتِ گردش، اُن کی چمک، پلکوں کی نرمی اور باریکی دِکھاتی تھی کہ ان چھوٹی کھڑکیوں سے ذہانت اور تیزی جھانک رہی ہے۔ بھنویں جُٹی ہوں یا علاوہ مگر اُن میں بال ایک انداز سے اُگے ہوتے تھے اور آنکھوں کی چودہ ورق کی کتاب کی فہرست نہایت اختصار کے ساتھ اپنی بغل میں دبائے ہوئے تھیں۔ سر بڑا نہ تھا تو چھوٹا بھی نہ تھا۔ متوسط درجے کا لیکن اس اصول ہندسی پر بنا ہوا تھا کہ اکثر عُمدہ قوائے ذہنی کو اس میں فراغت کی جگہ ملی ہوئی تھی۔ ناک بلند تھی اور اس کی بلندی پر غیریت اور عزّتِ نفس ننھی ننھی کُرسیاں بچھائے بیٹھی تھی۔ تھوڑی اعتدال کی تھی، نہ بہت مختصر نہ بہت نکلی ہوئی۔ پیشانی چوڑی اور اُونچی جس سے سیر چشمی ٹپکی پڑتی تھی۔ سینہ بہت چوڑا تھا، جس سے فراخ حوصلگی کا اندازہ ہوتا تھا۔

یہ تصویر جو ہم نے کھینچی ہے، نظیر کے اخلاق کے آئینے سے لی گئی ہے۔ اس کی نواسی کا دیا ہوا فوٹو[1] آگے چل کر پیش ہو گا۔

(صـ 15 سے آگے)

ہیجڑوں کے محاورے میں چھلّا بھی کہتے ہیں۔ (ش)

[1] عکسی تصویر

یہ عکسی تصویر دراصل وہ First hand information ہے جو شہباز کو نظیر کی نواسی ولایتی بیگم سے حاصل ہوئی۔ (م)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

نظیر چونکہ خاندان قریش سے تعلق رکھتا ہے اور قاعدہ ہے کہ قریشی عموماً سیاہ فام نہیں ہوتے، غالباً اُس کا رنگ گندم گوں ہوگا۔ گویا اُس کی رنگت بھی اس کی آدمیت کی شہادت دیتی تھی۔ قد کو بہت پست نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اُس کی کسی تحریر سے اس کا مکر و فن یا میلان فتنہ پردازی ثابت نہیں ہوتا۔ نہ بہت ہی طول بتا سکتے ہیں، اس لیے کہ حماقت کی جھلک بھی اُس کی کسی تحریر میں نہیں ہے۔ متوسط درجے کا قد و قامت ہوگا۔

جس زمانے میں نظیر ماں کی یا دائی ددّا کی گود میں نہالچے پر یا پالنے میں پڑا رہتا تھا اس زمانے میں بھی لوگ دیکھتے تھے کہ وہ اپنی ذہانت سے کس طرح کام لے رہا ہے۔ مُضغۂ گوشت محض، بے چارہ زیادہ ہل ڈل تو نہیں سکتا تھا لیکن چت پڑا ہے تو اسی حالت میں چھت سے نظر جمائے کبھی کڑیوں کی حالت پر غور کر رہا ہے، کبھی شہتیر اور کڑیوں میں امتیاز کے اسباب تجویز کر رہا ہے۔ رنگ اور بو اور آواز کے نکات میں غلطاں پیچاں ہے۔ پُتلیاں اس کی آنکھوں میں بعض وقت بڑی سُرعت سے گردش کرنے لگتی ہیں بعض وقت غور و فکر کے ٹھہراتے سے انتہا سے زیادہ ٹھہر جاتی تھیں۔ جاگتے وقت وہ اکثر فطرتی بے چینی سے گھڑی بھر میں بیسیوں پہلو بدلتا اور اکثر چیزیں جس تک اُس کا ہاتھ پہنچتا، اُن پر بار بار پہنچاتا اور ہر مرتبہ ایک نئی بات سیکھتا۔ ازبسکہ شگفتہ مزاج پیدا ہوا تھا، زیادہ لوگ اس کو روتا نہ دیکھتے۔ اکثر مُسکراتا اور ہنستا رہتا اور اگر مرض کی کوئی شکایت نہیں ہے تو پاخانے پیشاب اور بھوک پیاس کی اوقات کے علاوہ لوگ اس کو کبھی روتے نہ دیکھتے۔ اچھی صورتوں کا امتیاز اور اچھے لوگوں کی تمیز اس کو لڑکپن ہی سے تھی۔ خوبصورت اور صاف سُتھرے آدمیوں کی گود میں شوق سے جاتا اور جن کو میلا دیکھتا یہاں تک کہ جن کے چہرے پر داڑھی کچھ بہت بے قاعدہ گھنی ہوتی ان کی گود میں جاتے گھبراتا اور رو کر جلد الگ ہو جاتا۔ اس کے لب و دہن کی ساخت ایسی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ جلد بولنا سیکھے گا۔ نہ زبان موٹی نہ ہونٹھ موٹے، دونوں انداز کے مسوڑھوں اور

(ص 18 سے آگے)

ذکر ولایتی بیگم دیکھو منقول نسخہ صفحہ 129۔(م)

دانتوں کی ساخت، سہولت تلفّظ کے مناسب حال۔ تھوڑے ہی دنوں میں مم، ہپّا، امّا، ابّا وغیرہ کہنے لگا اور بہت جلد معمولی الفاظ اپنے مطلب کے اس کو یاد ہو گئے۔ اخذ اور حافظے کی قوت اتنی قوی تھی کہ جو بات سُنی نقش ہو گئی۔ ہرچند ایک زمانے تک بعض مخارج اس سے ادا نہ ہوتے تھے، جیسے ڑ، ش وغیرہ، مگر اس نقص میں اس کے بھولے پن نے وہ کمال پیدا کر دیا تھا کہ صحیح تلفّظ اس پیارے پیارے ننھے مُنّے مخارج کے ایجاد کیے ہوئے ناقص تلفّظ کے آگے ہیچ تھا۔ دانتوں نے کچھ دنوں تک اس کو ستایا، لیکن پیٹ سے اچھّے قویٰ لے کر نکلا تھا۔ اس سے بہ سہولت اس مشکل گھاٹی سے بھی نکل آیا۔ پوری بتّیسی تو نہ تھی، مگر ٹوٹی پھُوٹی جیسی تھی اس کو اپنی جبلّی خوش طبعی سے اکثر ناز کے ساتھ اپنے پاس والوں کو دن میں سینکڑوں بار دِکھاتا اور لوگوں کو یہ جھوٹے موتیوں کی لڑیاں دِکھا دِکھا کر اکثر نقدِ اُلفت حاصل کرتا۔

اس میں شک نہیں کہ نظیر کا لڑکپن نہایت خوشی میں گزرا ہے۔ اس کو اپنی ماں کے فراق کا صدمہ نہیں ہوا۔ اُس کو دُودھ کی طرف سے کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ یہ اکثر بیماری جھیلا نہیں کیا۔ اُس کے بُزرگ تشدّد اور مار پیٹ کے آدمی نہ تھے۔ اچھّے ماں باپ اور بُزرگوں کے زیرِ سایہ اس نے پرورش پائی اور ایک شگفتہ اور بے داغ دل لے کر دارالتربیت سے باہر آیا۔ وہ لڑکپن کو جہاں یاد کرتا ہے اس کی تعریف میں بے اختیار ہو جاتا ہے، جیسے آدم کو جنّت کی یاد آئی ہو! عشرتِ ایّامِ طفلی کے بیان میں یہ بند قابلِ ذکر ہیں:۔

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دُودھ کے چھُورے　　ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے
پانوں میں کالے ٹیکے، ہاتھوں میں نیلے ڈورے　　یا چاند سی ہو صورت یا سانورے و گورے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفلِ شیر خورے

گُل کی طرح سے ہر دم سینے پہ پھُولتے تھے　　پی پی کے دُودھ ماں کا، خوش ہو کے پھولتے تھے
ماں باپ ان کی خدمت سر پر قبولتے تھے　　ہاتھوں میں کھیلتے تھے جھولوں میں جھُولتے تھے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفلِ شیر خورے

نے دوستی کسی سے، نے دل میں اُن کے کینا   جانے نہ بے قرینہ، نے سمجھیں کچھ قرینا
نے گرمیوں سے واقف، نے جانتے پسینا   چھاتی سے ماں کی لپٹے خوش ان کو دودھ پینا
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

جو دیکھے اُن کی صورت لے پیار سے کھلائے   ہاتھوں اُپر اُچھالے، اور چھیڑ کر ہنسائے
چومے کبھی دہن کو، چھاتی کبھی لگائے   کوئی چُسنی مُنہ میں دیوے، کوئی جھنجھنا بجائے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

چھوٹا سا کوئی اُن کا کُرتا نکالتا ہے   یا چھوٹی چھوٹی ٹوپی سر پر سنبھالتا ہے
اں دودھ ہے پلاتی اور باپ پالتا ہے   نانا گلے لگاوے، دادا اُچھالتا ہے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

کیا عُمر ہے عزیزو، اور کیا یہ وقت ہے گا   جب گھُٹنیوں پہ آئے پھر اور کچھ تماشا
پانوں چلے تو واں سے پھر اور پیار ٹھہرا   سب زندگی کا حظ ہے اُن کو نظیرؔ، اہا ہا
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

دوسری جگہ طفلی کی تعریف میں پھر یہ بند بھی قابل ملاحظہ ہیں :-

کیا دن تھے یار وہ بھی تھے جب کہ بھولے بھالے   نکلے تھی دائی لے کر پھرتی کبھی دوالے
چوٹی کوئی رکھالے، بدھی کوئی پہنالے   ہنسلی گلے میں ڈالے، منّت کوئی بڑھالے
موٹے ہوں یا کہ دُبلے، گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم، نے حیا ہے   آگا بھی کھُل رہا ہے، پیچھا بھی کھُل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے، ننگے پھرے تو کیا ہے   یاں یوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے
کچھ کھالے اس طرح سے کچھ اس طرح سے کھالے   (الخ)

مرجاوے کوئی تو بھی کچھ ان کا غم نہ کرنا   نے جانے کچھ بگڑنا نے جانے کچھ سنورنا
ان کی بلا سے گھر میں ہو قند یا شکر نا   جس بات پر یہ مچلے پھر وہی کر گذرنا
ماں اوڑھنی کو بابا پگڑی کو بیچ ڈالے   (الخ)

جو کوئی چیز دیوے ست ہاتھ اوٹھتے ہیں — گڑ، بیر، مولی، گاجر، ے مُنہ میں گھوٹتے ہیں
باباکی مُونچھ ماں کی چوٹی کھسوٹتے ہیں — گردوں میں اَٹ رہے ہیں خاکوں میں لوٹتے ہیں
کچھ بن گیا سو پی لے کچھ بن گیا تو کھالے

جو ان کو دو سو کھالیں، پھیکا ہو یا سلونا — ہیں بادشاہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا
جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہی اُن کو سونا — پروا نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیے بچھونا
بھونپو کوئی بجائے پھرکی کوئی پھرالے — الخ

یہ بالے پن کا یار و عالم عجب بنا ہے — یہ عُمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشا ہے
اور سچ اگرچہ پوچھو تو بادشا بھی کیا ہے — اب تو نظیر میری سب کو یہی دعا ہے
جیتے رہیں سبھوں کے اُس اور مُراد والے

قیس کے پردے میں نظیر اپنی ناز پروردگی کا حال یوں بیان کرتا ہے :۔

پیدا ہوا تھا قیس جب اپنے پدر کے گھر — ماں باپ کو ہوئی تھی خوشی سب سے بیشتر
کُنبے کے لوگ بیٹھے تھے باہم سب آن کر — اِک دُھوم مچ رہی تھی خوشی کی اِدھر اُدھر
چومے تھا باپ قیس کے ہر لحظہ چشم و سر — رکھتے تھے ہاتھوں چھاؤں اُسے گرچہ بے خطر
ماں بھی لیے پھرے تھی اُسے اپنے دوش پر — فرزند کی خوشی میں لُٹاتی تھی سیم و زر
لیکن وہ ماں کی گود میں آکر نہ سوتا تھا
ہر وقت شور کرتا تھا، ہر لحظہ روتا تھا

مادر تھپک تھپک کے سُلاتی تھی کرکے پیار — پھرتا تھا باپ فال دِکھاتا بہ چشم زار
تعویذ ڈالتا تھا گلے بیچ بے شمار — لیکن اُسے قرار نہ آتا تھا زینہار
رہتا تھا اِک فقیر کوئی واں بزرگوار — جس دم وہ حال اس پہ کیا جا کے آشکار
سُنتے ہی اُس نے آہ کی اور ہوکے اشکبار — مجنوں کے باپ سے یہ کہا اس گھڑی پکار
"دُکھ پانے والے لڑکے جو دُنیا میں آتے ہیں
لچھن سب ان کے پہلے ہی پہچانے جاتے ہیں
لڑکا ترا یہ عاشق سرشار ہوئے گا" وغیرہ وغیرہ

شیر خواری کے عالم سے گزر کر جب نظیر دوڑنے اور چلنے پھرنے لگا اور کسی قدر ہوش سنبھالا تو وہ چُسنی اور جھنجھنے وغیرہ تو رُخصت ہوئے لیکن اور بہت سے دوسرے

کھلونوں نے اُن کی جگہ لی۔ دیوالی آئی تو اپنے ساتھ بیسیوں کھلونے دیوالی لے لائی۔

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اُدھار
کھلونے کھیلوں بتاسوں کا گرم ہے بازار ہر اِک دُکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دُکانیں لگا کے حلوائی پُکارتے ہیں کہ "لالہ دوالی ہے آئی"
بتاشے[1] لے کوئی، برفی کسی نے تُلوائی کھلونے والوں کی اِن سے زیادہ بن آئی
گویا اُنھوں کے واں راج آگیا دوالی کا

مٹھائی کے آدمی ہیں، جانور ہیں، مٹی کے بیل ہیں، گائیں ہیں، گھوڑے ہیں بیکیشن جی[2] اور رام و لچھمن کی ہزاروں طرح کی مورتیں ہیں۔ گائیں ہیں تو ان کے بچے چھاتی سے لگے دودھ پی رہے ہیں۔ اہیرن نازو انداز سے سر پر دہی کی مٹکی لیے مٹکتی چلی آرہی ہے —

عید آئی تو عید کے کھلونوں نے دُھوم مچائی

جو جو کہ اُن کے حُسن کی رکھتے ہیں دل سے چاہ جاتے ہیں اُن کے ساتھ لگے تا بہ عید گاہ
توپوں کے شور اور دوگانوں کی رسم و راہ میانے، کھلونے، سیر، مزے، عیش، واہ واہ!
ایسی نہ شبِ[3] برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

ابرک کی پالکیاں ہیں، قندیلیں ہیں، انواع الواع طرح کے خوبصورت پنکھے ہیں۔ سُرخ سُرخ پھڑیاں ہیں، لکڑی کی مطلا اور مذہب تلواریں ہیں، خوبصورت میانوں میں بند۔ چھوٹی چھوٹی مزے کی ڈھالیں ہیں۔ بزرگ عید گاہ گئے ہیں۔ وہیں سے لیتے آئے ہیں۔ میاں نظیر ہر اِک کھلونے کو دیکھ رہے ہیں۔ ہر ایک پر کچھ نہ کچھ

---

[1] بتاشے۔ (م)

[2] سری کرشن جی۔ (م)

[3] انشا۔ شبِ برات جو آئی تو دیکھیو انشا
کہ مچ رہی ہے پٹاخوں کی کیا پٹاخ پٹاخ (ش)

رائے دیتے جاتے ہیں۔ ابّا یہ اچھا ہے۔ اہاہا کیا ہی چمکتی ہوئی قندیل ہے۔ بیٹا تلوار اور ڈھال لو۔ اس سے تم سپاہی کہلاؤ گے۔ ابّا میں سپاہی نہیں بننا چاہتا۔ وہ ظالم ہوتے ہیں۔

شب برات آئی تو باپ پر فرمائش ہو رہی ہے۔ ابّا مجھے انار اور ہٹ[۱۰] پھول منگا دو۔ ہوائی بھی خوب ہوتی ہے۔ مہتابی کی بھی اچھی سیر ہے۔ جس وقت چھوٹتی ہے کالا آدمی بھی گورا دکھائی دینے لگتا ہے۔ گھنچکر لانا تو ذرا خوب دم کا ہو کر گھنٹے بھر تو چکر کھائے۔ لٹو، تومڑی، لوٹنے، زرکی، چھچھوندر، پٹاخے، گل کاری، کلھیا، قلم نڑی وغیرہ کا بھی فہرست میں مذکور ہے۔ باپ ہونہار بیٹے کی فرمائش سر آنکھوں سے بجا لاتے ہیں اور بیٹے کے بہانے سے آپ بھی آتش بازی کی سیر سے لطف اٹھاتے ہیں۔ نظیر اپنی مآل اندیشی سے معمولی بے خطر آتش بازیوں کے سوا کسی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ خطرناک آتش بازیوں کے جلانے میں محلے کے شریر لڑکے اور گھر کے نوکر چاکر مصروف ہیں۔ انار اور ہٹ پھول چھوٹ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے گھر میں پھلواری کھلی ہوئی ہے۔ کبھی گھر سے لڑکوں کے غول باندھ کر لڑنے جاتا ہے اور وہاں یہ سیر دیکھتا ہے۔

اگر کسی کے سر پہ چھچھوندر لگی کڑکی اُوپر سے اور ہوائی کی آکر پڑی چھڑی
ہو گئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی پاؤں سے لپٹی شور مچا کر قلم نڑی
کرتی ہے پھر تو ایسی ستم گاری شب برات

چہرہ کسی کا جل گیا، آنکھیں جھلس[۱۱] گئیں چھاتی کسی کی جل گئی باہیں جھلس گئیں
ٹانگیں بچیں کسی کی تو رانیں جھلس گئیں مونچھیں کسی کی پھک گئیں پلکیں جھلس گئیں
رکھے کسی کی داڑھی پہ چنگاری شب برات

دہلی شہر بڑا ہے۔ دن بھر میں سینکڑوں تماشے والے آتے ہیں۔ ابھی ریچھ والا آیا۔ ریچھ نچا کر اور ریچھ کے اور اپنے کرتب اور کشتی کی سیر دکھا کر چلا گیا تو مچھندر بندر

---

۱۰ آتش بازی کی ایک قسم۔ م

۱۱ جھلس۔ م

اور بکرا لے کر پہنچا۔ کچھ دیر اُن کی سیر رہی۔

جب ڈُگڈُگی بجائی کوچے گلی کے اندر　　کھڑکی کا حسن دیکھا تو پھر نچا کے بندر
لڑکے ہزاروں بولے: "آؤ میاں قلندر"　　بکرا بھی لا بٹھایا اس کام کا سمندر

سو مکر و فن بنانا، سو رنگ روپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

پھر ایک اُستاد گلہری کا بچّہ لے کر پہنچے:۔

کر جیسے گال پر لڑکوں کے چھوٹے زُلف کی ناگن　　سفیدی میں وہ کالی دھاریاں ایسی رہی ہیں بن
گلے میں ہنسلی، پاؤں میں کڑے اور ناک میں لٹکن　　کِناری دار پٹا جس میں گھنگھرو کر رہے چھن چھن

رہا ہے سر بسر گہنے میں بھر بچّہ گلہری کا

اُستاد کی تصویر بھی قابل ملاحظہ ہے:۔

بڑھے داڑھی کے بال، اور زرد مُنہ، آنکھوں میں آنسو بھرے　　وہ دیکھے تو بُری صورت، بُرا حال، اور پھٹے کپڑے
وہ کپڑے گو پھٹے تھے، پر ہم اپنے فن میں تھے پورے　　بندھی میلی سی پگڑی سر پہ، اور ٹکڑے انگرکھے کے

لگا رکھتے تھے ایسے وقت پر بچّہ گلہری کا

ملاحظہ کیجیے کس شان سے اُستاد گلہری کا بچّہ نکالتے ہیں:۔

کمر کو دیکھ ڈھونڈی جیب، پگڑی کو ٹٹول اس جا　　نظر سے اُس کی ہیں نے جب تو واں اس بات کو تاڑا

وہیں ہم نے نکالا ڈھونڈھ کر بچّہ گلہری کا

ریچھ والے قلندر تشریف لائے ہیں، اور یوں فرما رہے ہیں۔ قلندر کی تصویر کیا ہی ہو بہو ہے۔

لوہے کے کڑے جس پہ کھڑکتے تھے سراپا　　تھا ہاتھ میں اک اپنے سوامن کا جو سونٹا
بازار میں لے آئے دِکھانے کو تماشا　　کاندھے پہ چڑھا جھولتا اور ہاتھ میں پیالا

آگے تو ہم، اور پیچھے وہ تھا ریچھ کا بچّا

ریچھ کی تصویر:۔

ہاتھوں میں کڑے سونے کے بجتے تھے جھمک کر　　تھا ریچھ کے بچّے پہ وہ گہنا جو سراسر
وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پُر زر　　کانوں میں دُر، اور گھنگرو پڑے پاؤں کے اندر

جس ڈور سے یارو تھا بندھا ریچھ کا بچّا

جھمکے وہ جھمکے تھے پڑے جس پہ کرن پھُول　　مقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اُپر جھُول
اور اُن کے سوا کتنے بِٹھائے تھے جو گل پھُول　　یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پانو کی سدھ بھُول
گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچّا

لیجیے اب قلندر اپنے ریچھ کے بچّے کو نچاتا ہے:-

مدّت میں اب اس بچّے کو ہم نے ہے سدھایا　　لڑنے کے سوا ناچ بھی ہے اس کو سِکھایا
یہ کہہ کے جو ڈھپلی کے تئیں گت پہ بجایا　　اس ڈھب سے اُسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا
جو سب کی نگاہوں میں کھُبا ریچھ کا بچّا
پھر ناچ کے وہ راگ بھی گایا تو وہاں واہ　　پھر کہروا ناچا تو ہر اک بولی زبان "واہ"!
ہر چار طرف کہتی کہیں پیر و جواں "واہ"!　　سب ہنس کے یہ کہتے تھے "میاں واہ میاں واللہ!"
کیا تم نے دیا خوب نچا ریچھ کا بچّا

آئیے اب ریچھ کی کُشتی بھی ملاحظہ کیجیے:-

جب ہم نے اُٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا　　خم ٹھونک پہلواں کی طرح سامنے آیا
پلٹا تو یہ کُشتی کا ہُنر آن دِکھایا　　جو چھوٹے بڑے جتنے تھے ان سب کو رجھایا
ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچّا
جب کُشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا　　للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتاڑا
گر ہم نے پچھاڑا اُسے، اگر اُس نے پچھاڑا　　اک ڈیڑھ پہر ہوگیا کُشتی کا اکھاڑا
پر ہم بھی نہ ہارے، نہ ہٹا ریچھ کا بچّا
جو حُسنِ شیر دیکھا تو ریچھ کو نکالا　　کُشتی سے کھڑکھڑایا اور آپ کو اُچھالا
اور بن کے ریچھ والے سونٹا کڑا سنبھالا　　اس ریچھ سے بھی کتنے گل رو کو دیکھ ڈالا

سو مکر و فن بنانا سو رنگ رُوپ بھرنا

عاشق کو ہر طرح سے خوباں کی دید کرنا

کہیں سے سر پر ایک بھاری ڈلا لیے ہوئے سپیرا بھی پہنچا۔ اژدہے کا بچّہ نکال کر لوگوں کو دِکھا رہا ہے۔ اور طرح طرح کے سانپ اور بچھوؤں سے بچّوں کو بہلا رہا ہے۔

دیکھا جو حُسن کوئی بلدار لہر کھایا تو بن گئے سپیرے اور سانپ کو چلایا
پونگی بجا کے ہردم سانپوں کا پھن ہلایا اُس سانپ کے ہی فن سے اپنا بھی من ملایا
سو مکر و فن۔ الخ

یہ حضرت تشریف لے گئے، تو کسی طرف سے بیے والا پہنچا۔ بیے کا رنگ رُوپ اس کی تیزی، اس کی چلت پھرت سب نظیر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ پیٹی سے اس کی جو ڈورا بندھا ہوا ہے اس پر بھی نظیر کی نظر ہے۔ بیے والا بیٹھ جاتا ہے اور تماشہ کرنے لگتا ہے۔ کوڑی سامنے پھینک دی اور بیے کو اشارہ کیا۔ بجلی کی طرح چمکا اور جھٹ کوڑی اُٹھا لایا۔ کسی کے ہاتھ میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ چھُڑا کر لے آیا۔ گرہ میں انگوٹھی چھلا باندھ دیا۔ بیا گیا اور اپنی چونچ اور پنجوں سے کھول کر لے آیا۔ پوستوں کا ڈول بنا کر دیا۔ کنویں سے پانی کھینچ کر لے آیا۔ اگر پاس میں کوئی عورت کھڑی ہے اس کی پیشانی سے بندی ٹیکی اُکھاڑ لایا۔ یہ سب باتیں نظیر کے دِل پر گہرا اثر کرتی ہیں اور وہ نقش رفتہ رفتہ ایسا پکا ہو جاتا ہے کہ پھر کسی کے مِٹائے مِٹ نہیں سکتا۔

اب ہاتھ پر مِرے جو نمودار ہے بیا زردی میں اپنے رنگ کی زردار ہے بیا
جس دن سے مِرے ہاتھ یہ عیّار ہے لگا کوڑی کبھی اُٹھا، کبھی مہندی اُتار لا
کیا کیا پری رُخوں کی بہاریں ہیں دی دکھا پیٹی ہے اس کی یارو یہ ڈورا نہیں بندھا
لڑکوں کی اُلفتوں میں گرفتار ہے بیا

کُرتے کو دیکھ[1] جب سے لیا ہے یہ ہم نے مول پھرتے ہی ساتھ تب سے کئی دلبروں کے غول
چھلا انگوٹھی لاتا ہے ہردم گرہ سے کھول پانی کنویں سے کھینچے ہے کر پوستوں کے ڈول
ایسا ہُنر میں اپنے نمودار ہے بیا

کرتا ہے آ کے بندی و ٹیکی پہ جب یہ چوٹ بالوں کی لٹ دکھاؤ تو لاوے وہیں کھسوٹ

کبھی یہی شخص جس کے پاس اب بیا ہے گلہری کا بچہ، نبیٹی باز طوطا، سدھا ہوا بگلا بھی لے کر آیا تھا اور جانوروں پر جو اُس کی تعلیم نے اثر کیا تھا اُس کا نظیر کے

---

[1] کُرتے کو دیکھ یعنی بہ لحاظ دید بازی۔ (ش)

دل پر عُمدہ اثر ڈالا تھا۔

آگے ہمارے پاس تھا بچّا گلہری کا　　طوطا، نیلکنٹھ، اور سِدھا بگلا سدھا ہوا
ان کو تو ہائے چور کوئی لے گیا چُرا　　اب اس کا ہے ہمارے تئیں یار و آسرا
اُس بے کسی میں اب تو مددگار ہے بیا

خوبی کا لہر کھاتا دیکھا جو حُسن لہری　　پالے بٹیر، طوطے، بگلے، بیے، گلہری
کی بات وہ ہی جو کچھ اس کی پسند ٹھہری　　اُس لہر کی ہے دیکھی کیا کیا بہار گہری
سو مکر و فن۔ الخ

دیکھا جو حسن یارہ جوں لعل یا انگارا　　تو لعل چٹّی کا ہے پھر پالنا بچارا
کل یا کر جال روکا اور لعل کو اُتارا　　اس لعل کے ہی ڈھب میں اس پر بھی جال ہلا
سو مکر و فن۔ الخ

جانور والے چلے جاتے ہیں تو کسی طرف سے ایک آدھ رنگ بھریے بھی آن کر اپنے بازار کا رنگ جماتے ہیں۔ گڑیوں کے چھوٹے چھوٹے زیور چھلّے، انگوٹھی، بازو بند، کڑے، لونگے، توڑیاں، وغیرہ بنا بنا کر دے رہے ہیں۔ میاں نظیر اپنی ماما کے ساتھ ہیں۔ کچھ تو اپنے شوق اور کچھ گھر کی لڑکیوں کی فرمایش سے زیور بنوا بنوا کر لے جا رہے ہیں۔ کیا دن ہیں کہ معمولی تین کوڑی کے زیور ہزاروں اشرفیوں کے گہنے سے زیادہ خوش کر رہے ہیں۔ خیالات میں موزونی تو جبلی ہے، ہر ایک زیور کی نسبت کچھ نہ کچھ تشبیہات بھی بہم پہنچاتے جا رہے ہیں۔

پایا جو رنگ بھولا تو بن کے رنگ بھریے　　چھلّے انگوٹھی ڈھالے سانچے کے کر کے بھریے
بولا کوئی جو اس میں کچھ تو خدا سے ڈریے　　تو اس سے ہنس کے کہنا کچھ بات یاں نہ کریے
سو مکر و فن۔ الخ

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ میاں نظیر بیٹھے ہیں۔ گھر کے کوئی خوش طبع رُکن اُن کے پاس آن بیٹھے۔ اور ان کو بعض کھیل کی باتوں اور کھیل کی چیزوں سے بہلانے لگے۔ شام کا وقت ہے۔ چراغ روشن ہو گیا ہے۔ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ تخت صحن میں بچھے ہوئے ہیں۔ ایک بزرگ لیٹے ہوئے ہیں۔ میاں نظیر اُن کی گود میں بیٹھے ہیں۔ ان پر تقاضے کر رہے ہیں۔ مرزا صاحب کوئی پہیلی ارشاد کیجیے۔ پہیلی سُنی تو آتے چتے

پُوچھ رہے ہیں عقل لڑا رہے ہیں کوئی دوسرے صاحب چاہتے ہیں کہ حل کریں تو یہ اُن کو روکتے ہیں کہ آپ نہ بتائیے۔ میں سوچ کر کہتا ہوں۔ جب کسی پہیلی کو بوجھ لیتے ہیں تو اُچھل پڑتے ہیں اور مارے خوشی کے جامے میں پھُولے نہیں سماتے۔ کبھی مکرنیاں سُن رہے ہیں۔ کہنے والے نے ابھی نہ سکھی کہا بھی نہیں کہ اُنھوں نے آخیر لفظ تڑسے کہہ دیا کہت اوکھنڈ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں لوگ اُن کو سُناتے ہیں اور یہ سب سے ایک خاص دِلچسپی کے ساتھ لُطف تازہ اُٹھاتے ہیں۔

رات اس شوخ سے میں نے یہ پہیلی میں کہا: "بیکی بکری کسے کہتے ہیں بتاؤ تو بھلا"
اس پہیلی کے تئیں سُن کے بڑے سوچ میں آ جب نہ سمجھا تو کہا ہار کے "اب تُو ہی بتا"
سُن کے جب میں نے کہا: "دوائے تر دل بر آتر بوز"

دیکھا جو حُسن قابل تو ریختہ بنائے کبھی مکریاں بنائیں اور کچھ کہت بنائے
سکھیوں کی بحث ڈالی اور کھنڈ بھی جمائے جب جھُولنے پہ آئے پھر تو مزے اُڑائے
سو مکر و فن بنانا۔ الخ

مرزا صاحب کو لڑکوں کے بہلانے کا ڈھنگ اچھّا ہے۔ کبھی یہی حضرت دوسرے وقت بیٹھے ہیں۔ دو چار مکڑیوں کو لے کر ڈبیوں میں بند کیا اور پھر ایک مکھّی کو اُس میں ڈال ان مکڑیوں اور مکھی کی لڑائی کا تماشہ دیکھا۔ کبھی چیونٹیوں کو اکٹھا کرکے اُن کی سیر دیکھی۔ کبھی تتلیوں کو گرفتار کرکے ان کو نچایا۔ لکڑی کے پھُول کُتر رہے ہیں۔ سنگترے کو تراش کر اس کی قندیل بنا رہے ہیں۔ مولی کا ہنس، بگلا تیار ہو رہا ہے۔ گاجر کا مور باشا بن رہا ہے۔

جو حُسن بالا دیکھا تو مکڑیاں بنائیں ڈبیوں میں ڈال مکھّی اور مکڑیاں لڑائیں
کچھ چیونٹیاں منگائیں کچھ تتلیاں نچائیں ان تتلیوں کی خاطر کیا تیلیاں بنائیں
سو مکر و فن۔ الخ

ہر اک پلنگ اُتارا شیشہ میں جڑ کے باشا لکڑی کے پھُول کُترے اور سنگترا تراشا
مولی کا ہنس بگلا گاجر کا مور باشا دیکھا ہر اک بہانے اِس حُسن کا تماشا
سو مکر و فن۔ الخ

نظیرؔ کے مشاغل لہو ولعب :-

نظیرؔ جس مزاج کا آدمی تھا، اور اُس کے کلام سے جیسا مترشح ہوتا ہے، یقیناً اُس نے بہت بڑا حصّہ اپنی اوقات کا لہو ولعب میں صرف کیا ہے۔ وہ ایک متانت کی ادا سے چُپ چاپ بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ لوگ پچیسی[1] کھیل رہے ہیں۔ تو آپ بھی شریک ہیں۔ جُوا ہو رہا ہے تو اس میں بھی داؤ رکھنے کو حاضر ہیں۔ شطرنج میں بند نہیں۔ گنجفے میں عاری نہیں۔ اگر ایک دفعہ مات کھائی تو دوسری دفعہ کچھ ایسے بندوبست سے چلے کہ اگر مات نہیں کی تو بازی بُرد ضرور ہوئی۔ چوسر کے پاسے پھینک رہے ہیں۔ داؤ بول رہے ہیں۔ بازی بگڑی ہوئی ہے۔ گوٹ[2] پر گوٹ کٹ رہی ہے۔ پاسا یاری نہیں دیتا مگر چال کچھ ایسی چل رہے ہیں کہ حریف کے چھکّے چھوٹے ہوئے ہیں۔ ہارتے ہیں تو ایک دو پاسے سے۔ جتنے مشغلے سوسائٹی میں جاری ہیں، اور اُن کی بُنیاد کچھ آپس کی معاشرت پر معلوم ہوتی ہے نظیرؔ ہر ایک میں شریک ہیں۔ کبھی آپ کو گیڑیاں بھی کھیلتے دیکھا گیا ہے۔ کبھی آپ جمنا میں کودے ہیں، گھنٹوں پڑے تیر رہے ہیں۔ کبوتر اُڑانے سے انتہا سے زیادہ ذوق ہے۔ کہیں کوّے کثرت سے لڑاتے ہیں۔ جبھی تو حضرت کی ہمدردی اس قدر وسیع ہے کہ بُرے سے بُرے اخلاق، اور پاجی سے پاجی خیالات، اور ناپاک سے ناپاک مشغلے کے آدمی کو بھی یہ نظر عداوت سے نہیں دیکھتے۔ ہر ایک کے ساتھ ایک طرح کی ہمدردی اور اُلفت ہی ہے۔ نظیرؔ چوسر اس طرح کھیلتے ہیں :-

عجب طرح کی وہ رنگین چوپڑ نرص بچھائی ہے اب خدا نے
کوئی ہے پشکل کسی کا جگ ہے پھیریں ہیں نردیں بھی خانے خانے
جو پاسا پھینکے بنا بنا کر، وہ داؤں کتنے ہی دل میں ٹھانے
جو چاہتا ہو اٹھارہ آویں تو اس کو پڑتے ہیں تین کانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

---

[1] لکڑی کا ایک کھیل۔ (م)   [2] چوسر کی گوٹ۔ (م)

پھر شطرنج کے مُہرے یوں بچھاتے ہیں :۔

عجب یہ شطرنج کا سا نقشہ بچھا ہے دن اور رات اس جا جو بات چاہے کرے کسی کو نہ آوے بُرد اس کو بات اس جا
ہزاروں منصوبے باندھے دل میں، بتاوے چالوں کی گھات آ جا نہیں ہے اک چارچوک قائم، سبھوں کی بازی ہے مات اس جا

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

پھر گنجفے کے ورق یوں بکھرتے ہیں :۔

عجب طرح کے ورق بنے ہیں کوئی مکدر کوئی صفا ہے کسی کے سر پر ہے تاج شاہی کسی پہ شمشیر پُر جفا ہے
کوئی امیر اور کوئی وزیر اور کوئی فقیری میں دل خفا ہے سبھوں کو اس جا خیال آیا، یہ حق کی قدرت کا گنجفا ہے

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے

ایک دن ایک دِلبر کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ ایک دوسرا محبوب آیا اور اس سے کہا۔

"کوئی شغل کرنا چاہیے"۔

اس نے کہا۔

"گنجفہ موجود ہے"۔

مجھ سے پوچھا۔

"تجھ کو آتا ہے ؟"۔

میں نے کہا۔

"یہاں تو نہیں آتا"۔

"کہا کیوں ؟"

میں نے کہا:

"سرتاجِ من آفتاب رویاں من از دِل و جاں غُلام ایشاں"

کہا "مُحکم سے بھی نہیں ؟"۔

میں نے کہا۔

"دُرخوش دلی سرخروئی و براتِ سعادت در چنگ و بجُلت ضد خوش قماش و شمشیر عتاب بے درنگ۔ پس انکارِ سفید و سیاہ بہ از اقرار"۔

اسی گفتگو میں ایک شوخ اور آیا تینوں کھیلنے لگے اور میں اپنا حُسن و ناز کا مشاہدہ کرتا رہا۔

کنکوّہ بازی

میاں نظیر بالخلقتہ سوسائٹی کے کیڑے ہیں۔ جن جن چیزوں میں وہ پُرلطف دیکھتے ہیں کہ ان سے لوگ مجتمع ہوتے ہیں، یہی اجتماع کی خوبی ان کے شوق کے لیے محرک کافی ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جہاں کنکوّہ بڑھا، چھوٹے بڑے سب آن گھیرتے ہیں۔ دو چار سڑک پر کھڑے آسمان سے نظر لڑاتے ہیں۔ دس بیس صحن میں آڈٹے ہیں۔ کوئی ڈور لوٹنے کی فکر میں ہے۔ کسی کو کنکوّے کی گھات ہے۔ لڑکے ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ مفت کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ کوئی آپ سے شیشہ پیس رہا ہے۔ کوئی شیشے کے ٹکڑے سمیٹ رہا ہے۔ کوئی لیپ تیار کر رہا ہے۔ کوئی مانجھا چڑھا رہا ہے۔ کوئی لپیٹ رہا ہے۔ کانپلیں چھل رہی ہیں۔ کنکوّے گھٹ گئے ہیں تو ایک دوڑا ہوا بازار سے لینے جا رہا ہے۔ گھر میں خاصہ میلہ لگا ہوا ہے۔ چہل پہل اور آبادی معلوم ہوتی ہے۔

کنکوّے پتنگ کی فصل آگئی ہے۔ اِکاّ دُکاّ اُڑنے لگے ہیں۔ بازاروں میں جا بجا اُڈکانوں پران کی بہار ہے۔ اب میاں نظیر سے کہاں ضبط ہو سکتا ہے۔ نوکروں کو بازار دوڑایا ہے۔ ڈور کا بندوبست ہو رہا ہے۔ کنکوّے آرہے ہیں۔ بازار کے کنکوّوں سے عاجز آکر کبھی خود اپنے ہاتھ سے کانپ چھیل رہے ہیں۔ انگلی پر اس کا وزن دیکھ رہے ہیں۔ اپنے ہاتھ کا کنکوّہ بڑھا کر آس پاس والوں سے اس کی عمدگی کی داد لے رہے ہیں۔ دیکھنا، مزا کیا سُدھ کنکوہ ہے۔ جہاں سے چاہو موڑ لو۔ گھرنی بھی جتنی چاہو کھلا لو۔ شاہ جی تم ذرا اس کنکوّے کو ہاتھ میں لے کر دیکھو ایسا شائستہ ہے کہ ایک بچّہ بھی ہاتھ میں لیے رہ سکتا ہے۔ لانا وہ بڑھا آتا ہے۔ لاؤ اسے کاٹ دوں۔ اگر دوسرے کے ہاتھ میں کنکوّہ ہے اور کوئی اس کی طرف کنکوّہ لیے آتا ہے تو اس کو ہدایت بھی فرماتے ہیں۔

لاتا ہے پھیر پھار کے مُتّکل جو اپنی واں　　کہتا ہے کوئی ان سے "خبردار ہو میاں"
اب پینچ پڑنے کو ہے نہ دے آتنی ٹھمکیاں　　گھبرا کے کٹّے اس کے نہ پھنسنے دو میری جاں
اچّھا نہیں ہے مُفت کھپانا پتنگ کا

پینچ پڑ جاتا ہے تو پھر ڈھیل دینے اور رگڑ دینے کے قاعدہ بتاتے ہیں۔

گر پینچ پڑ گئے تو یہ کہتے ہیں: "دیکھیو"　　رہ رہ اسی طرح سے نہ اب دیجیے ڈھیل کو
پہلے تو یوں قدم کے تئیں او میاں رکھیو　　پھر ایک رگڑا دے کے ابھی اس کو کاٹ دو
ہے گا اسی میں فتح کا پانا پتنگ کا

پتنگ کے کٹنے پر لُوٹنے کی سیر یوں دکھاتے ہیں:

کٹتا ہے جوں پتنگ تو پھر لُوٹنے لیے　　دو دو ہزار دوڑتے ہیں چھوٹے اور بڑے
کاغذ ذرا سا ملتا ہے، یا ٹکڑے کانپ کے　　جب اس طرح کی سیر بھلا آن کر کرے
پھر سوچیے تو کیا ہے ٹھکانا پتنگ کا

کنکوّہ

کنکوّہ کا میاں نظیر کو چونکہ شوق بہت تھا، اکثر احباب کبھی پتنگ کا کاغذ، اور کبھی خود کنکوّے بھیج دیتے تھے۔ ایک دوست نے کاغذ پتنگ کا بھیج دیا تھا، اس کا شکریہ یوں ادا کرتے ہیں:۔ کاغذِ مہرہ دو رویہ کشیدۂ پتنگ کر جلائے آئینہ را منصوبۂ تحیّر افزاید، و بصافی رخسار پری بازی نماید، بہ دست پیادۂ تیز رفتار رسید۔ خاطر پُر ہوس ہوائے طفل در سر قائم بگنج مراد پے بُرد، و ابتہاج بہ شمار اوراق رو باوقات لہو سمات آورد

اپنے شوق کی وجہ نظیر ضمناً یوں بیان کرتے ہیں۔ (یعنی چونکہ اس میں چھوٹے بڑے سب کی خوشی مضمر ہے اس لیے پتنگ ایک اچھی چیز ہے اور اس کا شوق بھی ایک امر ضروری ہے کہ اس سے لوگوں سے ملنے جُلنے کا ایک خاصہ موقع ہاتھ آتا ہے۔)

اس آگرے میں یہ بھی تماشا ہے دل پذیر　　ہوتے ہیں دیکھ شاد جسے خُرد اور کبیر
کیوں کر نہ دل پتنگ کی ہو ڈور میں اسیر　　خوباں کے دیکھنے کے لیے کیا، میاں نظیر
ہے یہ بھی ایک طرفہ بہانا پتنگ کا

نظیر ذیل کی چوبیس قسموں کا خاص ذکر فرماتے ہیں اور ہر ایک کی خاص شاعرانہ مدحت بیان کرتے ہیں۔ دو باز، لل پرا، گھائل، لنگوٹیا، چاند تارا، پہاڑیا، بگلا، دونیا، دہیڑ، گلہریا، دو دھاریا، مانگ دار، خربوزیا، پنیدی پان، بہنا، دو کونیا، کلسرا، چپ، ککڑی، جوگھڑا، چپکا، ٹنگل، جھجھاؤ، کج کلاہ۔

کبوتر بازی :۔

میاں نظیر خود فرماتے ہیں کہ ؂

چھوڑان کو نظیر، اپنا دل اب کس سے لگاویں؟
اپنے، تو لڑکپن سے ہیں، دم ساز کبوتر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے طفولیت سے ان کو کبوتر کا شوق تھا اور لطف یہ کہ تا عمر یہ شوق رہا۔ جبکہ اشتغال کا یہ حال ہو تو یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ کبوتر بازی کی اصطلاحات سے ان کو واقفیت نہ تھی۔ وہ اس فن کو استادوں کی طرح جانتے تھے اکثر کبوتر بازی بدکر اُڑاتے اور بیسیوں کبوتر جیت کر لے آتے۔ کبوتر کے علاج معالجے میں بھی اُن کو وقوف تھا۔ کبوتر کے نئے نئے رنگ پیدا کرنے کی عجب عجب تدبیریں ان کو معلوم تھیں۔ جہاں قابل لوگ ان سے شعر و شاعری میں اصلاح لیتے، جُہلا عوام اور نواب زادے امیرزادے ان سے کبوتر بازی میں فیض حاصل کرتے اور اُن کی واقفیت اور مہارت دیکھ کر اُن کے ہوش اُڑ جاتے۔

کبوتر چھتری پر بیٹھے ہوئے ہیں اور نظیر ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہیں اور یوں ارشاد کرتے ہیں :۔

تاروں کے وہ انداز نہیں بام فلک پر — جو کرتے ہیں چھتری کے اُوپر ناز کبوتر

پھر ہاتھ میں چھپی لیتے ہیں اور اس طرح فرماتے ہیں :۔

کو کرکے، جدھر کے تئیں چھپی کو ہلاویں — کچھ ہووے غرض پھر وہ اسی سمت کو جاویں
گُٹّی کو نہ پھڑکاویں تو پھر تہہ پہ نہ آویں — چھوڑان کو نظیر، اپنا دل اب کس سے لگاویں
اپنے تو لڑکپن سے ہیں دم ساز کبوتر

صرف آٹھ بندوں کی تو ایک نظم لکھی ہے مگر اسی مختصر میں اتنے کبوتروں کے نام بھر دیے ہیں کہ خاصہ کبوتر خانہ معلوم ہوتا ہے۔ ان ناموں میں سے اکثر کی تحقیق

ہوئی لیکن بعض ایسے ہیں کہ بڑے بڑے نامی کبوترباز بھی اس کی حقیقت نہ بتا سکے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظیر کی کبوتر بازی کی معلومات کس قدر زائد تھی۔

گولا، گرہ باز ، بصریٰ، کابلی، شیرازی، نساور، چویا، چندن، سبزہ، کھی، شبست رو، اکر، طاؤسی، کل پوٹیا، نیلا، گلی، تھیتڑ، لقا، چیتا، جوگیا، کھیرا، پٹیت، ہچپا، نفتا، مکھرا، زرچہ، گل آنکھ، لل آنکھ، اودا، زردہ، کابرہ، تیرہ، مسی، توسی، پلکا، سیمابیا، گھاگرا، تنبولیا، پان لعل، اگرئی، سُرمئی، عنبری، خال، بھورا، مگسی، تانبڑا، ببرا، ہسترا، کاسنی، لوٹن۔

کم وبیش پچاس قِسم کے کبوتر اس میں مذکور ہیں۔ اس پچاس میں اکر، مکھرا، ہسترا ان تین قِسموں کا حال معلوم نہ ہوا کہ کیا بلا ہیں۔

کبوتر کی چال اور زمزمہ سنجی کی یوں تصویر کھینچتے ہیں:-

پھرتے ہیں ٹھمک چال، سُناتے ہیں خوشی سے　　کیا کیا وہ غٹرغوں کی خوش آواز کبوتر

کبوتر کی پروازیوں دِکھاتے ہیں:-

لقے ہیں اِدھر اپنی کساوٹ کو دکھاتے　　ہیں جوگیے بھی رنگ کئی جوگ کے لاتے
چلتے ہیں اُدھر سیمبری اپنی جتاتے　　پریوں کے پرے دیکھ کے ہیں چرخ میں آتے
جب حلقہ زناں کرتے ہیں پرواز کبوتر

انسان میں ایک ہمدردیٔ عام کا مادہ رکھا گیا ہے۔ یہی مادّہ ہے جس پر دار و مدار تمدّن عالم انسانی ہے۔ اس عام اُلفت کے مادّے کو بعض رُباعیوں اور مثنوی میں میں نے عشق[1] سے تعبیر کیا ہے۔ اور واقعہ میں عشق حقیقی اسی کا نام ہے، یہ اُلفت نہ فقط انسان کو اپنی نوع کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ اس کا سلسلہ تمام اجزاء کائنات تک پہنچتا ہے۔ جو مخلوق جس قدر اس سے نوع میں قریب ہے، اسی قدر اس سے زیادہ مالوف ہے۔ گائے، بیل، گھوڑے وغیرہ سے جو اس کو ربط ہے۔ گو اس میں کسی قدر اپنی منفعت بھی مقصود ہے لیکن ربط کا اصل محرّک وہی ہمدردیٔ عام ہے۔ جہاں جہاں جسم نامی محرّک بالا رادہ دیکھتا ہے اس

---

[1] عشق سیکھو بدنیت کے لیے　　حُسنِ دِل، خوبیٔ نیت کے لیے　　(ش)

کو اس کے ساتھ ایک خصوصیت ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور بغیر اس کے کہ کوئی منفعت مقصود ہو، اس سے تعلق پیدا کرتا اور اس کا دل تسکین پاتا ہے۔

ہر چند سوسائٹی میں ان جانوروں کے ساتھ صحبت رکھنے کا چنداں انسان محتاج نہیں لیکن اس کا مدنی الطبع ہونا اس کو تنہائی کے اوقات میں کبھی کبھی محض جانوروں کی صحبت سے وہی لذت بخشتا ہے جو کسی انسان کی صحبت سے حاصل ہو سکتی۔ لائیٹوڈ[1] ایک قیدی کی نقل مشہور ہے کہ کس طرح چوہوں نے اس کو قید تنہائی میں مدتوں خوش رکھا تھا۔ کس طرح وہ ان کے قدوم کا منتظر رہتا تھا۔ اور کس طرح اس کو ان کی شکریہ آمیز اُچھل کود اور معصومانہ کھیلوں اور حرکات سکنات سے لطف حاصل ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اپنی نوع کے ساتھ اُلفت اور ہمدردی کا اس کو موقع نہیں ملتا تو وہ ہمدردی جو عامۂ حیوانات کے ساتھ اس کو ہے، موقع پاکر اُبھرتی ہے اور اپنے فعل میں مصروف ہوتی ہے۔ نوعی ہمدردی چونکہ قوی ہے اس لیے اس کے مقابل میں دبی رہتی ہے۔ لیکن جب وہ باقی نہیں رہتی تو پھر اپنا زور دکھاتی ہے۔ کبھی جب ایسی تنہائی ہوتی ہے کہ حیوانات بھی نہیں ہوتے تو فقط عام منظر عالم سے اس کو وہی لطف حاصل ہوتا ہے، دریا کا پاٹ، آسمان کی وسعت، صحرا کی فضا بھی کبھی کبھی اس کے قلب کے ساتھ وہی اثر رکھتی ہے۔

ہمدردی کے علاوہ ایک خیال تفحص اور تجسس احوال کا جانوروں کے پالنے میں محرک ہے۔ انسان دیکھتا ہے کہ فلاں جانور چلنے پھرنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سب میں ہمارے شریک ہیں لیکن خدا نے ان کو زبان نہیں دی۔ کہ اُن سے دریافت کریں کہ دل میں کیا سوچا کرتے ہیں؟ ان کے ایک دوسرے کے ساتھ خیالات کیسے ہیں؟ ان میں احسان مندیوں کا وزن کیا؟ ان کو اوروں کے ساتھ سلوک کے کس قسم کے قاعدے سکھائے گئے ہیں؟ ان میں سوسائٹی ہے یا نہیں؟ اور اس کے کیا قواعد ہیں؟ ان میں شر و فساد انگیزی کا کس قدر مادہ دیا گیا؟ اور آیا وہ ضرورت سے زیادہ ہے یا ٹھیک، بقدر ضرورت؟ ازیں قبیل اور

---

[1] لائیٹوڈ، پتا نہیں چلتا کہ یہ شخص کون ہے۔ (م)

بہت سے خیالات پیدا ہوتے ہیں، اور انسان کو اسی تعلق سے ان کے ساتھ ایک خاص تعلق خیالی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ غیر محسوس طور پر ان کا شوق دل میں پیدا کرتا ہے اور ان کو گھر میں لاکر چند سے ان کی عادات و اخلاق، اور حرکات و سکنات اور طرز زندگی کی تفتیش کرتا ہے، اور جس قدر اس کی معلومات بڑھتی جاتی ہیں اس کی تفتیش کی گدگدی کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔

تفحص کے ساتھ کسی قدر تازگی پسندگی کو بھی اس میں دخل ہے۔ ہر چند سوسائٹی اس کے لیے ایک بہت دلکش چیز ہے، لیکن بعض اوقات وہ ایک ہی طرح کی مسلسل حالت کے یکسانی کے ساتھ گزرتے چلے جانے سے کسی قدر افسردہ اور ملول ہو جاتا ہے۔ گھر اگرچہ منقش اور منطلا، وسیع اور پُرفضا، نہایت ہی پُر زر پردوں سے آراستہ، اور طلائی اور نقرئی ظروف اور لوازم خانہ داری اور اسباب زینت مکان سے پیراستہ ہو لیکن دن رات وہیں رہتے رہتے کچھ ایسی یکسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر گھر کاٹنے دوڑتا ہے اور اس وقت یہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صحرا میں سائے دار درخت کے تلے انسان بیٹھا ہو۔ دریا کا سیمابی تختہ لہریں لے رہا ہو آسمان پر تارے چھٹکے ہوں، چاندنی کھلی ہو۔ جانور چہک رہے ہوں۔ علی ہذا پری تمثال خاتونوں، اور غلمان وش نوجوانوں کی صحبت سے بھی انسان اُکتا جاتا ہے اور ایسے وقت میں ایک غزال وحشی کی آنکھیں ہزار حوروں کی چشم فتاں سے زیادہ دل فریب معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بُلبل کا چہکنا ہزار ہارمونیم اور پیانوں سے بڑھ کر جادو تاثیر معلوم ہوتا ہے، کبوتروں کی غٹرغوں کسی پری وش کے ناز و نیاز سے زیادہ مزہ دیتی ہے اور فاختہ کی کُوکُو علما اور فلاسفر کے چوں و چرا سے زیادہ لذّت بخشتی ہے۔

بڑے بڑے شہروں میں جو عام نزہت گاہیں اور چڑیا خانے اور عجائب خانے وغیرہ بنے ہوتے ہیں، اسی حکمت سے ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کو چنداں سوسائٹی کی یکسانی ملول نہیں کرتی، لیکن جو لوگ دماغی کام زیادہ کرتے ہیں ان کو بہت جلد اس کی یکسانی افسردہ کرنے لگتی ہے۔ اور تا وقتیکہ ان کی تازگی پسندی نزہت گاہوں اور چڑیا خانوں اور دوسرے ایسے مقاموں میں اپنی غذا نہ پالے، گھر و ملامت

رفع ہو نہیں سکتی، اور اگر ہوگی تو دیر میں ہوگی۔

باعتبار اس کے کہ نظیر میں وہ ہمدردیِ عام کا مادہ بھی علی العلوم لوگوں میں جس قدر ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ تھا اور اس میں تفتیش و تلاش کی گدگدی بھی انتہا سے بڑھ کر تھی۔ دماغی کاموں میں اشغال کے سبب تازگی پسندگی سے کام لینے کا وہ زیادہ محتاج بھی تھا۔ ان اسباب سے اُس کو ابتدائے عمر سے ہم جانوروں کے پالنے میں مصروف پاتے ہیں۔ پالنے کے جو بعض طیور ہیں ان کو وہ "شوق کے طائر" اور "بازی واشغال کے طائر" بتاتا ہے۔ شوق کے طائر سے غرض یہ ہے کہ وہ طیور جن کو انسان اس عام ہمدردی کے تقاضے سے پالے جو ہر جاندار مخلوق کے ساتھ اس کو ہے۔ اسی تقاضے سے پالنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ بازی واشغال کے طیور سے مُراد یہ کہ بعض اوقات انسان بربے شغلی سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے اور کوئی زیادہ اہم شغل اس کو اس وقت کرنا مناسب نہیں، تو اس وقت کس قدر اپنے آپ کو کھیل میں ڈال دیتا ہے، اور کھیل سے بعض اشغال میں مشغول ہو کر اپنے جی کو بہلا لیتا ہے۔ اس قسم کے طیور میں وہ ان چڑیوں کا ذکر کرتا ہے:۔

بُلبُل، قمری، پچھے، پدڑی، پدے، چنڈول، اگن، لال، بیے، ابلقے، طوطے، طوطی، مینا، پہئی، تیتر، شکرے، کبوتر۔

کیا بُلبُل و قمری و پچھے پدڑی و پدّے چنڈول اگن، لال، بیے، ابلقے، طوطے
کیا طوطی و مینا و پہئی تیتر و شکرے طائر ہیں غرض بازی و اشغال کے جتنے

کی غور تو ہیں سب میں سرافراز کبوتر

جنگ بلبلان:۔

بلبلوں کے لڑانے سے بھی نظیر کو بہت شوق تھا۔ بلبل کی پیٹی باندھ رہے ہیں۔ پیٹی ہاتھوں میں ہے۔ اڈّے[1] پر اس کو بیٹھلائے لیے پھر رہے ہیں۔ لڑائی کی پالی ہوتی ہے تو اس میں جاتے ہیں۔ عجب عجب فن معلوم ہیں۔ بُلبُلیں لڑ رہی ہیں،

---

[1] اڈّے کو چکس بھی کہتے ہیں۔ (ش)

ایک کنکری پھینک کر ماری، بلبلوں کی گھڑی بندھ گئی۔ لوگ سمجھے جادو کیا۔ سب بولے:۔ "واہ حضرت، اچھی یہ پڑھ کے پھونکی!"

کل بلبلیں جو نو دس قابو میں اپنے آئیں　　اس میں سے دو پکڑ کے کشتی میں دھر بٹھائیں
یہ شور سن کے خلقت دوڑ آئی دائیں بائیں　　کوئی بولا "واہ حضرت!" کوئی بولا "واہ سائیں!"
سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

دس میں تو دو نو کٹ کٹ لڑتی تھیں کر کے کڑا　　جب تیسری کو چھوڑا، پھر تو ہوا تگڑا
خلقت بھی آ کے ٹوٹی چھوڑ اپنا اپنا اڑا　　کڑکی کسی کی پسلی، ٹوٹا کسی کا جبڑا
سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

تھی تین کی یہ کشتی، چوتھی کو اس میں چھوڑا　　اس نے تو خم بجا کر تینوں کو دھر جھنجھوڑا
پھر تو یہ پھٹکا آ کر ان کشتیوں کا کوڑا　　چھوٹا کسی کا ہاتھی، بھاگا کسی کا گھوڑا
سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

اک کنکری جو ماری پڑھ ہم نے پھر فسوں کی　　کشتی میں گھڑی بندھ گئی ان چاروں بلبلوں کی
سن سن کے چیخیں ان کی لڑنے میں غوغوں کی　　سب بولے "واہ حضرت، اچھی یہ پڑھ کے پھونکی!"
سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں لڑائیں

ایک پودنے کی لڑائی کا قصہ بھی اسی شان سے لکھا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ ایک پودنا اور ایک پودنی جوڑے کا جوڑا کسی پیڑ پہ رہتا تھا۔ اگرچہ جانور چھوٹا سا تھا لیکن بڑے سے بڑے جانور کو مال موجود نہ سمجھتا تھا۔ کسی طرف سے ایک ارنے کا جوڑا آیا۔ ارنی اور پودنی میں دوستی ہو گئی۔ ایک روز ارنی کی شامت آئی۔ اس نے اس پیڑ سے جس پر پودنے کا گھونسلہ تھا، پیٹھ اپنی کھجائی جس سے تمام درخت ہل گئے۔ پودنا بہت بگڑا اور کہا، "اس بات سے ایک دن مردوں میں لڑائی ہو جائے گی۔ اس تیرے کھجانے سے میں کہہ نہیں سکتا کیا آزار مجھ کو پہنچا ہے۔" ارنی نے نہایت

حقارت سے اس کا جواب دیا۔ تب پودنے نے کہا: "زہ، میں اس کی سزا کل تیرے ارنے کو دوں گا ___" دوسرے دن صبح کو وہاں پہنچا۔ جہاں ارنا پڑا سوتا تھا اور دھر بیٹھ گیا کان میں باندھا اپنے پروں کو پھڑ پھڑ کیا، اور پردے میں پنجوں کو گڑایا اس کے بعد جب ارنی نے بہت منت اور سماجت کی تو اس نے چھوڑ دیا اور ارنے سے سوا بھاگنے کے اور کچھ بن نہ آیا۔

یہ قصہ از قبیل نرسری ٹیل[1] ہے۔ جو نظیر نے اپنے لڑکپن کے زمانے میں بعض ماما دیئوں سے سُنا ہوگا، اور عقل و شعور کے زمانے میں کسی بچّے کے لیے نظم کر دیا ہوگا۔

شکار:۔

نظیر کو طیُور سے کس قدر شوق معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں موقع طیُور کے ذکر کا آتا ہے، وہ بے اختیار ہو جاتا ہے، اور خواہ مخواہ ان کی ایک مطول فہرست پیش کر دیتا ہے، ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ نہ فقط اس نے گھر بیٹھے لال، بیے، طوطے وغیرہ شوق کے جانور پال بیے ہیں، بلکہ وہ اکثر اوقات ہاتھوں میں چڑیوں کا شکار بھی کرتا پھرا ہے۔ وہ تمام ان جانوروں سے واقف معلوم ہوتا ہے، جو شکار کیے جاتے ہیں، اور جب ان جانوروں کا کہیں تقریباً ذکر آتا ہے، چوں کہ ان کے ساتھ اس کے نہایت لذّت انگیز اور پُر لطف ایسوسی ایشن (تعلقات خیالی) رہے ہیں، وہ اپنے قابو میں نہیں رہتا۔ اگرچہ اس کی فہرست ایک خشک تفصیل ہوتی ہے، لیکن چوں کہ اس کے پُر جوش قلب سے بے اختیاری میں نکلی ہوتی ہے، سادگی اور بے تفنعی کے مزے سے خالی نہیں ہوتی، ان کے ذکر میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی، یہ بے ترتیبی ظاہر کرتی ہے، کہ کوئی قصد تصنع کا شریک نہیں ہے، طبعی جوش ہے کہ اس سے نام گنوا رہا ہے، ایک غیر محسوس طور پر شکار گاہ کا سر و سامان پیشِ نظر ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ میاں نظیر، کبھی سرخاب کے پیچھے دوڑے جا رہے ہیں، کبھی سارس شکار کیے ہوئے لیے آ رہے ہیں۔ کچھ رفیق بھی ساتھ ہیں، بعض رفقا درخت پر ہریل بتا رہے ہیں، بعض فاختہ کا نشان دیتے ہیں ان کی آنکھیں شاخوں سے متجسسانہ لڑی ہوئی ہیں۔ پتے پتے میں ڈھونڈھ رہے ہیں لیجیے انھوں نے جانور کو دیکھ بھی لیا۔ بندوق کو چھنیاتے ہیں۔ ایک آنکھ بند کی ہے۔

---

[1] وہ کہانیاں جو بڑی بوڑھیاں بچّوں کے بہلانے کو کہا کرتی ہیں۔ (ش)

توڑے پر ہاتھ ہے۔ وہ لیبیے ڈن سے فائر کیا۔ ہریل بسمل ہو کر نیچے آ تا رہا۔ فاختہ بھی ایک طرف تڑپ رہی ہے۔ قروبی سے لے کر احباب دوڑے ہیں، میاں نظیر بے اعتنائی سے اور شکار کی تلاش میں دوسری طرف بڑھے جا رہے ہیں۔ گویا فاختہ اور ہریل کے شکار سے ان کو چنداں خوشی نہیں۔ جمنا کا کنارہ ہے۔ ایک جوڑا سُرخاب کا بیٹھا ہوا ہے۔ آڑ بھی موقع کی ہے۔ نظیر بڑے اہتمام سے نشانہ کرتے ہیں فائر ہوتے ہی نر بسمل ہو گیا۔ مادہ اڑ گئی ہے۔ مگر سر کے اوپر منڈلا رہی ہے۔ جنگ بلبلان، ذکر مرغان، ہنس نامہ، پودنے کی لڑائی، ذکر بیا، اور بعض اور متفرق اشعار سے ہم کو نظیر کے خیالی چڑیا خانے میں یہ طیور ملے ہیں۔ جن میں بعض شوق کے طائر ہیں۔ بعض شکاری بعض شکار

چنڈول، اگن، ابلقے، جھپاں، بیا، دہیڑ، مینا، کلکلیاں، بگلے، طوطے، ٹوئیان، تہیر، بلبل، کوکلے، کوئل، کھنجن، کُلنگ، سیمرغ، گڑھ پنکھ، سارس، حواصل، گدھ، باز، جرہ، شاہین، بحری، شکرہ، سبزک، بڑھنگے، ٹنٹن، بٹّے، پنڈخی، ٹوٹرو، قمری، ہر یوہ، غوغائی بگیری، لٹورے، پپیہے، لال، چرٹے، پودنے (پودنا پودنی) پٹّے، پدڑی، بیٹر، لوے تیتر، کبک، تدرو، ہدہد، بڑھیا، کوّے، چیلیں، طوطی، مور، کبوتر، شام چڑے، جھانپو، ہریل، سارو، مُرغ، مُرغی، چغد، اُلو، پنکھ ہوا، عنقا، ہَرے پنکھ، ٹٹری، فاختہ، تیہو، ابابیل، چکور، لم ڈھینک، مولا، کرا، لگھڑ، لگھڑی، پیپے۔

شوق کے طائر:۔

چنڈول، اگن، ابلقے، بیے، دہیڑ، مینا، پیپی، بگلے، طوطے، بلبل، کوئل، قمری، کبوتر، پپیہا، لال، بیٹر، تیتر، طاؤس، شام چڑے، طوطی۔

شکاری طائر:۔

باز، جرہ، شاہین، بحری، شکرہ

شکار:۔

کلنگ، گڑھ پنکھ، سارس، ٹنٹن، بٹّے، پنڈخی، (فاختہ) ٹوٹرو، ہر یوہ، غوغائی بگیری، لٹورے، چرٹے، پودے، بٹّے، پدڑی، لوے، کبک، تدرو، ہدہد، بڑھیلہ

جھانپو، ہریل، سارو، ہڑے، بتیھو، چکور، لم ڈھینک، کرا، چہے، کھنبن، بڑھنگے، بنگہ ہوا، بنکھہ۔

معمولی طیور:۔

چھان، سیمرغ، حواصل، سہزک، زاغ، زغن، چغد، اُلو، عنقا، ٹٹڑی، ابابیل ممولا، لگھڑ، لگھڑی، (زاغ زغن چغد ایک اعتبار سے شکاری طائر ہیں)

خانگی طیور:۔

مُرغ۔ مُرغی

سب کچھ ذکر کیا ہے لیکن بیٹر کی لڑائی کا کہیں تفصیل کے ساتھ مذکور نہیں ہے دو حال[1] سے خالی نہیں یا تو انہیں اس جانور سے شوق نہیں تھا یا یہ کہ اتفاقی بات ہے کہ اس کا کہیں ذکر ان کے کلام میں نہ آسکا یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا حال لکھا ہو مگر موجودہ مجموعہ سے، وہ غائب ہو ضمناً کہیں کہیں ذکر آیا ہے، مگر اس سے ان کی شیفتگی اس جانور کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی ـــــ مرغ کی لڑائی کا بھی کہیں شاید مذکور نہیں ہے، اور یہ بھی سخت موجب تعجب ہے، چونکہ یہ جانور خونخوار طور پر لڑتے ہیں، شاید اس وجہ سے ان کو مرغوب نہ ہوں ـــ بہر حال ان کا ذکر کہیں نہیں ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ بعض اور اساتذہ نے مرغ کی لڑائی کا ذکر کیا ہے، اس لیے انہوں نے اس کا مذکور تحصیل حاصل سمجھا ہو ۔

تیراکی

انسان جب اور جانوروں کو دیکھتا ہے کہ وہ اس سے بعض کمالات زیادہ رکھتے ہیں، باوجودے کہ نعمتِ عقل سے محروم ہیں، تو اس کو خواہ مخواہ ایک قسم کا رشک پیدا ہوتا

---

[1] دو حال مراد دو حالت یا کیفیت ۔ (م)

ہے اور مادۂ منافست[1] جوش میں آتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ مچھلیاں پانی میں آزادی سے تیر سکتی ہیں۔ کچھوے اپنا چین کرتے پھرتے ہیں۔ کیکڑے فراغت سے پانی کی سطح پر سیر کر رہے ہیں اور ان کو اس تیرنے میں کسی قسم کی صناعی جدوجہد[2] کی ضرورت نہیں۔ ان کے جسم کی ترکیب ہی کچھ اس وضع پر ہے کہ ان کو پانی ڈبو نہیں سکتا۔ (غرض ایسے جانور بکثرت ہیں، جو پانی میں تیر سکتے ہیں۔ یہ کثرت اور بھی اس کی آتشِ رشک کو بھڑکاتی ہے اگر فقط آبی جانور پانی میں تیر سکتے تو شاید کچھ اس کو تسلی ہوتی، لیکن نہیں وہ دیکھتا ہے کہ وہ جانور بھی تیر سکتے ہیں، جو اسی کی طرح خشکی میں رہتے ہیں۔ گائے، بیل، گھوڑے، ہاتھی، شیر، کتے، سانپ، بچھو، ان میں سے کوئی بھی تو ایسا نہیں جو تیر نہ سکتا ہو۔ اس سے وہ آتشِ رشک بھڑک کر چوگنی ہو جاتی ہے۔ جب منافست کے مادے کے اشتعال کے اتنے سامان تھے تو وہ چپکا کیونکر رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بسا اوقات اس کو بہ ضرورت عبورِ آب کرنا پڑتا تھا۔ غرض وہ اس نقص کی تلافی میں مصروف ہوا۔ پہلے تو اس نے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنائیں، گھڑنائیں تیار کیں، پھر رفتہ رفتہ اس نے تیرنے کا فن ایجاد کیا۔ اس نے دیکھا کہ انسان اور دیگر حیوانات میں فرق یہ ہے کہ اور جانوروں کا سر کسی قدر چھوٹا ہے اور انسان کا سر سب سے بڑا ہے پس جو دقت اس کو تیرنے میں ہے، اسی سر کے بڑے ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر کسی طرح وہ سر کو سطحِ آب پر رکھ سکے، تو پھر تیرنے میں کسی طرح کا اشکال نہیں۔ اس کے رفتہ رفتہ اس کو طریقے معلوم ہو گئے پھر تو ضبطِ نفس وغیرہ کے ذریعہ اس نے یہ کمال بہم پہنچایا کہ بعض وقت کرامات میں اور اس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مشہور ہے کہ اولیاء اللہ سطحِ آب پر سے گزر گئے۔ اور قدم تر نہ ہوا۔ تیرنے والوں میں قدم تر نہ ہونے کا کمال تو بیشک نہیں ہے۔ لیکن وہ سطحِ آب پر اس طرح بیٹھے جا رہے ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا وہ پانی پر ہیں۔ ہاتھ میں پنجرہ لیے ہوئے ہیں۔ سر پہ طوطا بیٹھا ہوا ہے۔ پتنگ اڑا رہے ہیں۔ سوئی میں دھاگا پرو رہے ہیں۔ حقّوں کا دم لگ رہا ہے۔

---

[1] مادہ منافست۔ ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کا مادّہ (م)

[2] صناعی جدوجہد مراد۔ غیر کاوش عمل (م)

آگرے ؂ :-

آگرے میں ہر سال برسات کے دنوں میں تیراکی کا تماشہ ہوا کرتا تھا۔ جس طرح بنارس میں بڑھوا منگل ہوتا ہے۔ وہاں بھی لوگ برسات کی خوشی کرتے تھے جمنا کے کنارے ہزاروں خلقت کا ہجوم ہوتا تھا۔ بہت سے کنارے ہی پر ناچ رنگ کا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ بہتیرے اپنے احباب کو لے کر سجی سجائی کشتیوں میں بیٹھے ہیں۔ کوئی اونچی چوٹی کی رنڈی کے ساتھ ہے۔ ناچ گانا ہو رہا ہے۔ طبلے کھڑک رہے ہیں

ناؤوں میں وہ جو گل رو ناچوں میں چھک رہے ہیں ۔۔۔ جوڑے بدن میں رنگیں گہنے جھبک رہے ہیں
تانیں ہوا میں اڑتیں، طبلے کھڑک رہے ہیں ۔۔۔ عیش و طرب کی دھومیں پانی چھپک رہے ہیں
سو ساٹھ کے بنا کر اطوار پیرتے ہیں
اس آگرے میں کیا کیا اے یار پیرتے ہیں
کچھ ناچ کی بہاریں، پانی کے کچھ تماڑے ۔۔۔ دریا میں مچ رہے ہیں اندر کے سو اکھاڑے

؂ بھادوں میں تیراکی ہوتی ہے۔ ناؤں پر ناچ ہوتا جاتا ہے۔ دوروز تیراکی کا میلہ رہتا ہے۔ خواجہ امیر جو نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے عہد میں اپنے والد کے ساتھ آگرے گئے تھے۔ اس تیراکی کی نسبت اپنی کتاب معدن الجواہر میں یوں تحریر فرماتے ہیں ــــ خانۂ ما بادریائے جمن بسیار قریب بود چوں بہ سیر دریا می رفتیم۔ اکثر اوقات می دیدیم کہ شناوران بسیار شناآشنا می شوند دستہائے بیشمار دریں علم بکار می برند۔ چنانچہ شخصے بود موسوم بہ دموتی مشر کہ صد ہا شاگرد او بودند و قدرت در دستگاہ شناہ آں قدر داشت کہ دہ انگشت دست خود بدست وہ نا آشنا می داد و شنا کردہ آں طرف دریا می برد و باز ہم چناں ہمہ را ایں روئے آب می آورد و شخص دیگر بود مسمّی بہ دبھوناشر کہ ہنرش ایں بود کہ دست و پایش بہم بستہ بدریا می انداختند و بہماں حالت خود بسہاکناں و آب ورزاں عبور بحر زخار بر شکلائی کہ بود کرانہ۔ موجے می زد و می نمود و بازی آمد۔ و درا نجا اکبرآباد رسم قدیم است کہ دہر سال بہ روزمیلے کہ بست ہمہ شناوران مجتمع شدہ آب ورزیہا می کنند و ہنر ہائے دستہائے خود شاں می نمایند و بر کنار دریا طعام ہا می پزند و دیدار نصف روز ہمہ شناگران آمدہ چاشت می کنند و دیگر تماشایان بزارہا آمدہ گل سرخ و بیلا می سازند و آب زرہاں پس از اکل طعام نفس راست کردہ باز بشنا مشغول می گردند و بیگاہ (شام) بخانہائے خود مراجعت مے نمایند۔

لبریز گل رخوں سے دونوں طرف کراڑے   بجرے و ناؤ چپو ڈوں گی بنے نواڑے
ان جمگھٹوں سے ہو کر سرشاد پھرتے ہیں (الخ)[4]

جھرنے سے لے کے شبھا دیا تھا[1] کے نالے تک اور چھتری سے لے کے برج خونی[2] اور دارا کے چوترے تک، پھر مہتاب باغ، سید تیلی قلعہ، روضۂ[3] حکیم کا باغ، شیوا داس کا چمن سب جگہ لوگوں کا انبوہ اور تماشائیوں کا غل شور ہوتا تھا۔ جگہ جگہ پر مجلس ہے، انجمن ہے، میوہ مٹھائی بک رہا ہے۔ ناچ ہو رہے ہیں۔ ہر اک مقام پر چرچے ہیں کہ آج فلاں فلاں استاد تیریں گے۔ فلاں کا ایک شاگرد بھی بہت ہوشیار نکلا ہے۔ کچھ دنوں میں استاد سے بڑھ جائے گا جدھر نظر کیجیے سبز ہی سبز نظر آتی ہے۔ بڑے چھوٹے سب عمدہ عمدہ پوشاکیں پہن کر آتے ہیں۔ عورتیں اور لڑکے اپنے رنگ برنگ کے لباس سے کنارۂ دریا کو صحن گلزار بنائے ہوئے ہیں ہر شخص کے چہرے پر انبساط کا گلدستہ کھلا ہوا ہے۔

لیجیے استاد دریا میں کود دے۔ انواع طرح سے تیر رہے ہیں، اور ہر جگہ تیر رہے ہیں، کھڑی[4] چادر بند، ناند، چکوا، میںڈا، بھنور، اچھالن، چکر سمیٹ، مالا، میںڈا گھیر، تختہ، کسی پچھاڑ، گرا، پانی کوئی شکل اختیار کرے، بہر شکل یہ تیر رہے ہیں۔ لوگوں سے داد لیں

---

[1] بادشاہی وقت میں شبھا یا سبھا کوئی امیر عورت تھی اس نے وہ محلہ بسایا۔ نالا اسی کے نام سے مشہور ہے۔ (ش)

[2] برج خونی پر ایک توپ رہتی تھی۔ جو آدمی کا بل لیتی تھی، تب چلتی تھی۔ جمنا کے کنارے ہے۔ (ش)

[3] روزہ دریا کنارے ہے۔ مگر اب دریا ہٹ گیا اور سڑک بن گئی ہے۔ تھامیں آدمی کے بچانے کو سرکار نے بنائی۔ (ش)

[4] اس مقام پر ایک امر قابل ذکر یہ ہے کہ وہ بند جس میں نظیر نے یہ اصطلاحیں درج کی ہیں اکثر محققین کے آگے بہ نظر تحقیق پیش کیا گیا۔ مگر کسی نے تحقیق شافی نہ فرمائی۔ بعضوں نے کہا اس وقت نوٹ کے کاغذات حاضر نہیں لیکن مجمل یہ ہے کہ یہ موجوں اور گردابوں اور اسی قسم کی سطح دریا کی اور مختلف کیفیتوں کے نام ہیں۔ بعضوں نے دعوا کیا کہ میں سب بتا سکتا ہوں مگر فرادی فرادی جب ہر ایک کی ماہیت دریافت کی جانے لگی تو بغلیں جھانکنے لگے۔ آخر آگرے کے تیراکوں سے پوچھا گیا لیکن بعض الفاظ سے وہ بھی ناآشنا نظر آتے۔ غرض اس تجسس و تلاش سے یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ نظیر کی زبان دانی ایک دریا ہے۔ ناپیدا کنار جس کی نہ تھاہ ہے نہ اور چھور ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔ (ش)

مل رہی ہیں۔

کتنے کھڑے ہی پیریں، اپنا دکھاکے سینا — سینا چمک رہا ہے ہیرے کا جوں نگینا
آدھے بدن پہ پانی آدھے پہ ہے پسینا — سروؤں[1] کا بہ چلا ہے گویا کہ اک قرینا
دامن کمر پہ، باندھے دستار پیرتے ہیں الخ

جاتے ہیں ان میں کتنے پانی پہ صاف سوتے — کتنوں کے ہاتھ پنجرے، کتنوں کے سر پہ طوطے
کتنے پتنگ اڑاتے، کتنے سوئی پروتے — حقوں کا دم لگاتے ہنس ہنس کے شاد ہوتے
سو سو طرح کا کر کر بستار پیرتے ہیں الخ

نظیرؔ نے برسوں یہ تماشہ دیکھا تھا اور حق یہ ہے کہ تیراکی کا تماشہ آگرے سے بہتر دوسری جگہ کم ہوتا ہوگا۔ پھر کیونکر گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس کے دل میں اس کے سیکھنے کا جوش نہ پیدا ہوا ہو۔ روضہ جہاں یہ رہتے تھے، جمنا کے کنارے ہی واقع ہے، سال کے تماشے کے ماورا وہاں گھاٹ پر نہانے والوں اور تیرنے والوں کا روز اس قدر ہجوم رہتا ہے کہ معمولی سے آدمی کے دل میں بھی بے تحریک پیدا کیے رہ نہیں سکتا۔ چہ جائیکہ وہ تو نظیرؔ تھے نظیرؔ نے گو اس فن میں وہ مرتبہ حاصل نہ کیا ہو جو استادوں کا ہوتا ہے، لیکن پھر بھی معمولی لوگوں سے کسی قدر زیادہ جانتے تھے اور بعض تیرائیاں[2] ان کو عمدہ بھی معلوم تھیں۔ بعض اوقات جوانی میں جب کچھ ہم عمر نوجوانوں کا ساتھ ہوا ہے تو جمنا پار بھی ہو گئے ہیں۔ جس جوش، اور جس واقفیت کے ساتھ انھوں نے آگرے کی تیراکی کا بیان کیا ہے، وہ ان کی شناوری کی دلیل روشن ہے۔

اکبرآباد کی تعریف میں جو نظم ہے اس میں بھی جہاں نہر چمن کا ذکر آیا ہے تو بے اختیاری میں نظیرؔ اہل شنا اور شناوری کا ذکر کر گئے ہیں۔

گرہاں سے پیرنے کا کروں وصف میں رقم — تو نحر صفحہ بیچ لگے پیرنے قلم
پیرتے ہیں اس روش کی بہاروں سے بہم — سو سو چمن بھرے ہوئے شبنم کے دم بہ دم
آجاتے ہیں نظر دہیں دریا کے درمیاں

---

[1] سر کی جمع۔ (م)
[2] تیرائیاں۔ مراد تیراکی یا تیرنے کا طریقہ ہے۔ (م)

اہلِ شناجو کرتے ہیں سو سو طرح شنا   لہریں نشاط و عیش کی اٹھتی ہے دل میں آ
ملتا نہیں کنار کچھ عشرت کے بحر کا   ساحل پہ جوشِ خلق سے ملتی نہیں ہے جا
ہوتا ہے وہ ہجوم بھی اک بحرِ بے کراں

علیٰ ہذا بزمِ عیش میں بے اختیار ہو گئے :-

(دریا کا سین۔ عورتیں) بحر الطاف جمنا دریں جا ہمچناں جاری است کہ در چمنستان نسیم سحری و در بستانِ باد بہاری بر ساحل بے خطرش ہجوم آب کشان و غسل سازان، و اکثر بار چنیں بہار کہ گلعذاراں جلوہ طراز می شوند، و برہمنانِ صندل سا چوں خطوط تلک و رشتۂ زنار صفِ درازی بند طرۂ پُر چیں دل براں نمود موج مسلسل پرداز، و خاطر مسرور دل بستگاں چوں صاحب کلاہ بہوا انداز قیام موزوں قداں تمثیلے می جوید، جز سرو و شمشاد و بر کنارِ نہر نہال کدام مضمون بلند باید گردانید و تمکین سیم براں تشبیہ می خواہد، غیر از نسریں و نسترن بر لب آب جو چہ غنچۂ سخن بہ شگفتگی باید نشانید نازنینانِ آب تا کمر دیدن سرو در بحر با صنوبر، و نرمی جسم نزاکت مآب و زلف معنبر گلِ سیراب و سنبل تر۔

(تیراکی کا میلہ۔ تیراک) علی الخصوص وقتیکہ شناوراں بشنا می پردازند و غول خود نمایاں می سازند۔ بہ علم شنا دریا، داد و دقائق شناوری آں قدر آشنا کہ وسعت رودِ آب را فرشِ چاندنی می دانند، و ہجومِ امواج را لہر سیتل پانی۔ چکوہ پر چپکا بورا پوچ، پیچ گرداب را ہیچ۔ چادر از لتے تار تار، و چار موج نیز ناچار سرکشا طرفگی فزا، و مورِ چال تحیر پیرا جنبشِ دست بآں صافی کرشمہ نہ جنبد، و تحریکِ پا بایں خوبی کہ آب نرنجد۔ سرخاب خجلت یاب، و بط آب آب۔ باقامتِ بہار کنول و نیلوفر، و بردائی چمن رواں در نظر۔ بے کد و چناں روند کہ بغمان تیز رو کدو، و تا غوطہ نہ زنند آب مشتاقِ گلو۔ کارے می کنند کہ چنیں ہر موج زبانِ تحسین، و ہنری می نمایند کہ حُبابِ گرد آفریں۔ صدائے بجے باہنگے کہ چہ چہ بلبلاں بہ چمن، و کلاہ رنگا رنگ بنوعے کہ شگفتنِ گل ہا بہ گلشن۔ چندے ترانہ و دستک پرداز، و اکثرے ستار منہ چنگ نواز — انبوہ تماشائیاں بر ساحل۔ و انواعِ سیر و تماشا حاصل۔

زجمنا عالمے صد عیش یاب است   بخوبی خوش تر از بحر خوش آب است
ز آبش ماند ایں جا مثلِ گلشن   چراغ خضر تا سازند روشن!

باب 2

نظیر کی تعلیم و تربیت

میاں نظیر کھیل تو آپ بہت چکے اب مکتب کا رُخ کیجیے۔ ماما دائیوں کی گود چھوڑ کر بوڑھے شفیق اُستاد کے آغوش تربیت میں جگہ لیجیے۔ چار برس چار مہینے چار دن بہت ہوتے ہیں۔ اس اثنا میں (آپ کے قویٰ نے بہت کچھ ابتدائی معلومات فراہم کرلی ہیں) آپ بہتیرے پھول سونگھ چکے ہیں۔ بیلا، گلاب، چنبیلی، ہزارہ، چنپا، جوہی، کیوڑہ، موتیا سب پر آپ گھنٹوں وجد کرچکے ہیں۔ عطر بھی بیسیوں قسم کے مل چکے ہیں۔ پھل بھی کئی طرح کے کھاچکے ہیں۔ تربوز، ککڑیاں، خربوزے، بیر، سنگترے، نارنگیاں، کولے، آم، انار، انگور سب کا مزہ آپکے کام ذہن میں موجود ہے۔ سیریں بھی ہزاروں دیکھ چکے ہیں۔ تماشے بھی انواع طرح کے آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ گھر کے رشتہ مند اور بڑی بوڑھیوں کے لاڈ پیار بھی بہت ہو چکے۔ اب کیا آپ عمر بھر کھیلتے ہی رہیں گے۔ زیور اور رنگین کپڑوں سے دل سیر نہیں ہوا تو ابھی چند سے انھیں رہنے دیجیے۔ لیکن خدا کے لیے کھیلنا تو اب چھوڑیے۔ کھیلنے کو بھی مطلق منع نہیں کیا جاتا۔ کھیلیے لیکن گھڑی دو گھڑی پڑھ کر اور سبق یاد کر کے۔

"ابا میں پڑھوں گا لیکن پہلے آپ میری دھوم سے بسم اللہ تو کر دیجیے۔"

"ہاں صاحب، اس کا مضائقہ نہیں۔ اچھا بتاؤ تمھاری بسم اللہ میں کتنی مٹھائی آئے؟۔ اور کون کون سی؟۔"

"ابا، اور کچھ ہو کہ نہ ہو تل کے لڈو ضرور ہوں اور مٹھائی دس من سے کم نہ ہو۔"

"بیٹا۔ تل کے لڈو تو دوا کی مٹھائی ہے۔ وہ بانٹنے کے مصرف کی نہ ہوگی۔ کوئی اور

مٹھائی تجویز کرو۔"

"تو اچھا برفی منگائیے۔ خوب میٹھی ہوتی ہے۔ لب چپکتے ہیں۔"

"اس تجویز پر تمھاری میرا بھی صاد ہے۔"

"ابّا مٹھائی بٹنے لگے تو تھوڑی مجھے بھی دیجیے گا۔ مرزا کا بیٹا جو میرے ساتھ کھیلتا ہے میں اس کو دوں گا اور دو ایک لڑکے اور بھی ہیں۔ اور ایک شخص کو اور دینا ہے وہ آپ کو نہ بتاؤں گا۔"

"میں سمجھا تم اپنی انّا کو دینا چاہتے ہو۔"

"جی نہیں اس کو تو آپ خود دیں گے۔"

"تو پھر کس کو دو گے؟"

"جب آپ مٹھائی دے لیں گے تو بتا دوں گا۔"

کچھ اس قسم کی تقریر باپ بیٹے میں ہوتی ہے۔ باپ مسکراتے ہوتے فکر بسم اللہ میں تشریف لے جاتے ہیں۔ حلوائی پر مٹھائی کی فرمائش ہوتی ہے۔ فرش فروش کا سامان کیا جاتا ہے۔ دعوت کے رقعے تقسیم ہوتے ہیں۔ اہل شہر جمع ہوتے ہیں۔ شہر کے کسی مقدّس ملّا کے سامنے نظیر بٹھایا جاتا ہے۔ قرآن شریف رحل پر رکھا ہوا ہے۔ ملّا صاحب اس سے دو چار اخلاق آمیز باتیں کرتے ہیں ـــــ وہ ہر بات کا معقول جواب دیتا ہے۔ ملّا صاحب "ماشا اللہ ماشاء اللہ" کہتے جاتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں تسبیح ہے۔ دوسرے میں ناسدانی ہے۔ تسبیح والے ہاتھ سے قرآن شریف کھولتے ہیں اور نظیر سے سورہ اقرا باسم پر انگلی رکھواتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں "کہو اقرا باسم ربک الاعلے الّذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔" بعض مخارج کے ادا کرنے سے گو نظیر قاصر ہے مگر الفاظ پورے پورے ادا کرتا ہے۔ ملّا صاحب کو مکرّر کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح تین دفعہ پڑھا کر ملّا صاحب نظیر کے علم کے لیے دعا کرتے ہیں اور نظیر کو شاباش اور اس کے باپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ پھر چاروں طرف مبارکباد کا غل مچ جاتا ہے۔

دو چار روز تک تو نظیر کو کوئی کچھ نہیں چھیڑتا لیکن جب پھر ہفتے کا دن آیا تو باپ نے اس سے کہا کہ "بیٹا اب مکتب جاؤ مولوی صاحب کتنی دن سے تمھارا انتظار کھینچ رہے ہیں۔" نظیر نے کہا "میں خود حیران تھا کہ ایک ہی دن پڑھنا ہو کر رہ گیا۔ مجھ کو ملّا صاحب نے جو کچھ پڑھایا وہ بہت بھلا معلوم ہوا۔" اس کے بعد نظیر بغل میں قاعدہ دبا کر

مکتب میں پہنچتے ہیں[1]۔ استاد شفیق نہایت شفقت کے ساتھ دو چار حرف بتا اور پہنچوا دیتے ہیں۔

"الف خالی ب کی پیٹھ پر ایک نقطہ۔"

"مولوی صاحب، یہ نقطہ تو ٹھیک اُسی برفی کی طرح ہے جو میری بسم اللہ کے دن بٹی تھی۔"

"ہاں صاحب، جبھی تو پڑھنے لکھنے میں اس قدر مزہ ہے۔"

"لیکن ب کو برفی ملی اور الف کو نہیں؟"

"یہ شاید بانٹنے والوں کا قصور ہے۔"

"جی ہاں، کمبخت بانٹنے والے بڑے بدذات ہوتے ہیں۔ مرزا میرا ایک دوست ہے وہ لاکھ مانگتا رہا مگر اس بیچارے کو کسی نے ایک ٹکڑا بھی نہ دیا۔"

استاد شاگرد میں اس طرح کی باتیں بھی ہوتی جاتی ہیں اور پڑھنا بھی ہو رہا ہے جب اسی شفقت اور مہربانی کی پڑھائی ہو تو پھر کیوں نہ پڑھنے والے کا جی لگے۔ جمعہ کو گو تعطیل کی خوشی ہوتی ہے لیکن نہ ویسی جیسی اور لڑکوں کو کہ سمجھتے ہیں قیدخانے سے چھوٹے۔ مہینے ڈیڑھ

---

[1] مکتب میں اس کے باپ نے لاکر بٹھایا۔ ایک قاعدہ بھی سامنے اس طفل کے رکھا (ش)

[2] اس مقام پر انشا کی یہ غزل خالی از لطف نہیں (ش)

تب سے عاشق ہیں ہم اے طفل پری زاد ترے
جب سے مکتب میں لگا پڑھنے الف بے تے ثے

یاد آتا ہے وہ حرفوں کا اُٹھانا مجھ کو
جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ ہے اور خالی حے

حے کی پھر شکل جو اصل کی سی آتی ہے نظر
نقطہ جو اس پر لگا دیں تو ہوتی پھر وہ خے

دال ہے کبڑی سی انا کی مری قد کی شبیہ
ہے سو یک پانچ ہے بن بیٹھی ہے اور بن نقطے

ذال بھی چھوٹی بہن اس کی ہے جوں آتوں جی
ایک پر کالا سا ہے ساتھ ہے گھر میں اس کے

رے بھی خالی ہے وہ رے زے پہ بھی ہے اک نقطہ
کہ مشابہ ہے یہ تل سے مرے رخسار تلے

سین خالی ہے بڑی شین پہ ہیں نقطے تین
صاد اور ضاد میں ہے بس فرق ہے نقطے اک سے

طوے بن طرہ ہے اور ظوے پہ ہے اک نقطہ
عین بے عیب ہے اور کانے میاں غین ہوتے

فے پہ اک نقطہ ہے اور قاف پہ ہیں نقطے دو
کاف بھی خالی ہے اور لام بھی خالی ہے لیے

میم بھی یوں ہی ہے اور نون کے اندر نقطہ
مفلسا بیگ ہے یہ واؤ بھی اور چھوٹی ہے

کیا خلیفہ جی یہی ایسی پھبن سے نکلے
آ کے چھٹی دو ابھی لام الف ہمزہ یے

گالیاں تیری ہی سنتا ہے یہ انشا ورنہ
کس کی طاقت ہے کہے کوئی جو یہ اس کو بے

مہینے میں نظیر قاعدے کو ختم کرتا ہے۔ استاد کو قاعدہ ختم کرانے کا انعام الگ ملتا ہے۔ اور سپارۂ عم شروع کرانے کی نذر جدا۔ سپارہ شروع ہوتا ہے تو مٹھائی آتی ہے اور نیاز ہوتی ہے پیمبر کی روح کو ثواب بخشا جاتا ہے۔ ترقی علم کی دعا مانگی جاتی ہے۔ لڑکوں میں مٹھائی تقسیم ہوتی ہے۔ میاں نظیر خود اندر باہر خوشی خوشی تقسیم کرتے پھر رہے ہیں۔ سب سے دعائیں لے رہے ہیں۔ سیپارہ بھی تین چار مہینے میں تمام ہوتا ہے۔ بعد ازاں حضرت سعدی کی روح پُر فتوح مکتب میں داخل ہوتی ہے اور نظیر کے سامنے کریما کھلتی ہے۔ یہ کب اُستاد کے خیال میں ہوگا کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا کہ نظیر جس کتاب کے اشعار بلا فہم معنی فقط وزن کی چاٹ پر یاد کر رہا ہے، اس کی بحر کا ایسا آشنا ہوگا کہ اس میں تضمین کی ناؤ کھتیا پھرے گا۔ وزن کا پسند کرنا طبیعت انسانی کا عام خاصہ ہے۔ نظیر کی طبیعت تو شاعری کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی۔ سمجھنے کی بات ہے کہ اس کو کریما کا موضوع کلام کس قدر پسند آیا ہوگا جیسے خانۂ نگیں میں نگینہ بیٹھ جاتا ہے اس کے اشعار ذہن نشین ہو جاتے تھے۔ اور پھر کسی طرح بھولتے نہ تھے۔ دو چار روز تک ایک ایک شعر کی نوبت آئی، پھر تو اس کا کچھ ایسا باہرہ[۵] کھلا کہ چار چار پانچ پانچ شعر پڑھ جاتا اور گھنٹے بھر میں یاد کر کے رکھ دیتا۔ کریما کے ساتھ ساتھ کسی استاد اور کبھی بعض مکتب کے اور لڑکوں سے بیت بحثی کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔ اب جہاں کہیں شعر دیکھتا اس کے اوّل اور آخر حرف پر اس کی نظر پڑتی۔ اور اس طرح ایک غیر محسوس طور پر املا کا اس کو خیال ہو چلا۔ بیت بحثی نے اس کے مذاق نظم کو کسی قدر اور گہرا کر دیا اور حافظے میں چسپیدگی کا مادّہ کسی قدر اور بڑھ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ حریف سے اگر کوئی نیا شعر سنتا ایک دفعہ میں اس کو یاد ہو جاتا۔ کریما کے بعد ماقیمیا شروع ہوئی۔ ماقیمیا کے ختم ہونے پر خالق باری کی باری آئی اور آمدنامے کی آمد آمد ہوئی۔ خالق باری نے ایک مختصر ذخیرۂ فرہنگ کے علاوہ اس کو مختلف بحروں سے بھی آشنا کیا اور اب وہ رفتہ رفتہ ہر بحر کے اشعار کے پڑھنے پر قادر ہو چلا۔ بیت بحثی کے شوق نے اس سے محمود نامہ اور عطائی نامہ بھی پڑھوایا۔ کتابوں میں جو اشعار اس نے پڑھے ان کے علاوہ استاد سے سنے یا اور ہم مکتبوں سے جواب میں پائے یا در کسی بھلے مانس کو پڑھتے دیکھا، وہ بھی یاد کر لیے اور اب بات کرنے کے بہت سے مضحک اور حکمی پیچ اس کو یاد ہو گئے۔ ردیف ٹ آئے

---

[۵] باہرہ کھلا مراد ذہن جاگا۔ یعنی خارجی حالات کے ذریعہ بہرہ وری۔ (م)

شقلہ اور ٹ اور ٹھ اور ق اور ژ وغیرہ کے اشعار اس کو بہ کثرت یاد تھے۔ اور ان کے جوابی اشعار بھی۔ اس کا ذہن اس چھوٹی سی عمر میں ہی ایک اچھا خاصا مجموعہ اشعار کا ہوگیا تھا۔ اور شاید یہ اسی کا صدقہ تھا کہ بعض اوقات بعض موزوں مصرعے بھی بے ساختگی میں اس کی زبان سے نکلنے لگے۔ اس مذاق شعر و سخن کے بعد آمدنامے کے روکھے پھیکے صیغوں نے کسی قدر اس کو تکلیف دی لیکن مکتب میں اور بھی لڑکے پڑھتے تھے اور ان سے پیچھے رہنا یہ اپنے لیے موجب کسر شان خیال کرتا تھا۔ اس لیے کسی طرح لشتم پشتم بڑھتا چلا گیا۔ اس مشکل سے گذر کر اس نے دیکھا کہ اس کے آگے ایک نہایت ہی پُر فضا وعظ و نصایح کی پھلواری کھلی ہوئی ہے حضرت سعدؔی اس پھلواری کے مالی ہیں اور کچھ اس قسم کے گلدستے تیار کر رہے ہیں :۔

گلے خوشبوئے در حمّام روزے　　رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری　　کہ از بوئے دِل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم　　ولیکن مُدّتے با گل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد　　وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اس باغ میں اس کی روح بہت خوش ہوئی۔ ہر گلدستے کو سونگھتا اور اپنے ذہن و خیال کے جیب و دامن کو بساتا۔ رفتہ رفتہ اس کے دماغ میں ایک خاصہ مجموعے کا عطر پیدا ہوا جس کی خوشبو سے آج تک لوگوں کے دماغ تازہ ہیں۔ یہ کون اس وقت سمجھ سکتا تھا کہ یہ نونہال آگے چل کر خود اس قدر پھولے پھلے گا کہ گلستان سعدی اس کے آگے گرد ہوجائے گی۔

تفصیل کہاں تک لکھی جائے۔ مختصر یہ کہ نصاب الصبیان۔ ابو نصر فراہی۔ گلستان بوستاں، مثنوی غنیمت، یوسف زلیخا، سکندرنامہ، انشائے خلیفہ، انشائے منیر انشائے ھوکرن، طاھر وحید، چہار دانش۔ ابوالفضل نثر ظہوری، مینابازار، ملّا طغرا، دیوان غنی، قصائد عرفی، قصائد خاقانی، قصائد ظہیر فاریابی، تحفۃ العراقین، قران السعدین۔ اس قسم کی کتابیں جو فارسی درسیات میں داخل ہیں، اس نے کچھ مدت میں تمام کریں۔ جب فارسی کی استعداد میزان منشعب، سمجھنے کے لائق ہوگئی تو یہ عربی کے ڈھرے پر لگادیا گیا۔ لیکن جہاں تک

اس کے کلام سے مستنبط ہوتا ہے، عربی میں شاید صرف و نحو سے آگے قدم بڑھا نہ سکا۔ کیونکہ کسی مقام سے اس کی عربی کی ادبیت اچھی طرح تراوش نہیں کرتی حصۂ ہفت زبان میں عربی کا ایک شعر لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ کاتب یا راوی کی غلطی ہو۔ لیکن جس حالت میں کہ وہ مندرج ہے اس سے تو اس کی عربیت کی نسبت کوئی اچھی رائے قایم نہیں ہوتی وہ شعر عربی کا یہ ہے۔

فدای وجہک۔ عشی شرقا۔ و موع نہرا۔ و من فراقک
کثیر حزنا۔ مع الھوا۔ ثقیل ہجرا۔ وکا لجبالا

مبلغ علم :۔

کلام سے یہ بات اچھی طرح مترشح نہیں ہوتی کہ نظیرؔ کا مبلغ علم کس قدر تھا لیکن چونکہ کسی مسئلۂ فقہی یا نحوی کی طرف اشارہ نہیں ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید عربیت بہت زائد نہ تھی۔ معمولی صرف و نحو کی مختصر کتابیں پڑھی ہوں تو پڑھی ہوں شاید ایک آدھ رسالہ منطق کا بھی دیکھا ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ فارسی کی نہ صرف درسی کتابیں پڑھی تھیں بلکہ اس کے علاوہ اس زبان کی اکثر مشہور تصانیف اور اکثر مشہور شعراء کے کلام پر نظر تھی۔ حافظؔ، خسروؔ، جامیؔ، صائبؔ، سعدیؔ، وحشیؔ، خاقانیؔ، فردوسیؔ، انوریؔ وغیرہ شعراء کے کلام سے اچھی طرح واقف نظر آتا ہے۔ چنانچہ بعضوں کے بعض کلام کی تضمین بھی کی ہے۔ فارسی میں استعداد خاصی ہے۔ کتب درسیہ ظہوری، طغرا۔ سہ دفتر ابوالفضل، غنی وغیرہ پڑھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مختصرات صرف و نحو بھی پڑھا ہو تو عجب نہیں۔ بعض مقام پر جہاں فارسی اشعار لکھے ہیں۔ زور فارسیت ظاہر ہوتا ہے۔ مسٹر[1] زا نوازش علی بیگ نے تو ایک خط میں ذکر کیا ہے کہ ان کا مستقل دیوان فارسی موجود ہے

مکتب کی تصویر :۔

مکتب کی تصویر نظیرؔ نے لیلا مجنوں میں خود کھینچی ہے۔ اس موقع پر اس کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔
مکتب میں اس کے (قیس کے) باپ نے لاکر بٹھا دیا۔ ایک
قاعدہ بھی سامنے اس طفل کے رکھا۔ (بغدادی قاعدہ قیس کے زمانے میں تو تصنیف

---

[1] ۔ نظیرؔ کی اکلوتی نواسی کے شوہر دیکھو صفحہ 235

نہیں ہوا تھا۔ البتہ نظیر کو خود پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ تسامح ویسا ہی جیسے لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء کو زنان اہل بیت کے طریقہ ماتم ولباس وپوشاک کی نسبت اکثر واقع ہوتا ہے۔)

اُستاد کی تصویر میں خود نظیر کی تصویر نظر آتی ہے۔

اُستاد ایسے بیٹھے ہیں کہ پوجیں وہ عشق کو — ردئے سخن میں ان کے بے عاشقی کی بو
جو کچھ پڑھے تو یوں کہیں "غم کے گھر پڑو" — تختی لکھے تو بولیں" اسے آنسوؤں سے دھو"
معنی جو پوچھئے تو کہیں "صبر و قرار رکھو" — تقریر پوچھے تو یہ کہیں اس کے روبرو
"دل دے کے خوب رو کی محبت میں تو بیٹھ" — باعث جو عشق کے تھے وہ حاضر تھے دوستو
چاہت کی پاک بازی کا ہر دم رواج تھا — لڑکا بھی ابتدا ہی سے عاشق مزاج تھا

قیس کے تختی لکھنے کا حال نظیر لکھتے ہیں وہ تو خود ان کا حال ہے۔

تختی کو لے کے جب وہ قلم کو اٹھاتا تھا — مشق الف میں آہ کی مدیں دکھاتا تھا
بے کی کشش میں طول تپش کو جتاتا تھا — نقطے کی جائے قطرۂ آنسو بہاتا تھا
لکھنے میں میم کے جو قلم کو ہلاتا تھا — نقش دہن صنم کا اسے یاد آتا تھا
جس وقت عین لکھنے میں دل کو لگاتا تھا — دیکھ اس کو چشم یار تصور میں لاتا تھا

تختی وہ کیا تھی دفتر رنج وملال تھا
لکھنے کی بات پوچھو تو اس کا یہ حال تھا

نظیر جب علم پڑھ کر نکلتے ہیں اور اخیر کو اسی علم کی عینک سے دیکھتے ہیں کہ مآل سب کا فنا ہے تو یوں عبرت کے چشمے جاری کرتے ہیں۔

پڑھ علم کئی اس دُنیا میں گر کامل ذی ادراک ہوئے — اور لاد کتابیں اونٹوں پر ہر معنی کے درّاک ہوئے
معقول پڑھی منقول پڑھی ہر منطق میں چالاک ہوئے — یاں جتنے علم کے دریا ہیں، ان دریا کے تیراک ہوئے

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں۔ سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

مشہور حکیم اور بید ہوئے یا پڑھ کے علم طبابت کا — دالان کتابوں سے روکا، اور نسخوں سے صندوق بھرا
جب موت مرض نے آن لیا سب [illegible] — گو نسخے لاکھ مجرب تھے پر کام نہ آیا اک نسخا

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

اسی رنگ میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

کیا کالی پیلی شکل کے، کیا گورے گلعذار — عاشق کوئی ہے اور کوئی معشوق طرح دار
عاقل حکیم و عامل و فاضل رسالدار — پنڈت، نجومی، بید، چہ ناداں، چہ ہوشیار

دو دن کی شان ہر کوئی دکھلا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مرگیا

جس طرح نظیر سات زبانیں جانتا تھا، گمان ہوتا ہے کہ اسی طرح وہ ہفت قلم بھی تھا۔ اس نے بعض موقعوں پر خوشنویسوں کا ذکر کیا ہے اور مطلاً مذہب کتابیں جو لوگوں نے ہزاروں لاکھوں روپے کے صرف سے لکھوائی ہیں۔ ان کو مخصوص بالذکر کیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ خوشنویسوں کی خدمت میں اکثر بہ نظر اصلاح جایا کیا ہے اور ان کا کمال اس کو خوش آیا ہے۔ خود بھی مدتوں خوش نویسی کا دل میں ذوق رکھا ہے اچھے اچھے قطعات استادوں کے بہم پہنچاتا ہے۔ اور بڑی محنت سے ان کی شاگرد مشق کرتا ہے جب سن رشد کو پہنچتا ہے۔ بعض خوش خط قلمی کتابیں اپنے مذاق خوشنویسی کی سفارش سے خریدتا ہے اور ان پر ناز کرتا ہے[1]۔

مرنے سے پہلے مرگئے جو عاشقان زار — وہ زندۂ ابد ہوئے تا حشر برقرار
کیا کاتبان اہل قلم خوش نویس کار — جتنی کتابیں دیکھتے ہو لاکھ یا ہزار

کوئی لکھ کے مرگیا کوئی لکھوا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی، ہر اک آ کے مرگیا

دوسری جگہ نظیر یہ ملاحظہ کرتے ہیں کہ اگرچہ کوئی کتنا ہی علم والا ہو لیکن اسرار الٰہی پر کما حقہ عبور حاصل نہیں کرسکتا۔

جہاں میں کیا کیا خرد کے اپنی ہر اک بجاتا ہے شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی مہندس کوئی ہو پنڈت کتھا بکھانے
کوئی ہے عاقل، کوئی ہے فاضل۔ کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہے کوئی یہ بھید کھولے، یہ سب ہیں حیلے یہ سب بہانے

---

[1] اکبرآباد میں مرزا نوازش علی بیگ نے نظیر کی چند نثریں دکھائیں جو بروایت ان کے خود نظیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ خط بہت پاکیزہ نستعلیق تھا اور ایسا کہ جس پر اکثر خوش نویسوں کو رشک ہوسکتا ہے (رحمٰن)

چھپے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا، کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے ۔۔۔ جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

نظیر سات آٹھ زبانیں جانتا تھا۔ عربی فارسی کا ذکر تو ہم ابھی کر آئے ہیں کہ نظیر نے اس میں کس طرح ترقی کی۔ اردو اس کی مادری زبان تھی۔ اس میں اس کو چنداں محنت اور کاوش کا ضرورت نہ تھی۔ لیکن چونکہ تحصیل زبان کے ساتھ اس کو جبلّی مناسبت تھی، وہ اس مادری زبان کے نکات اور خصوصیات کو اوروں سے بہت زیادہ سمجھتا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ گو سب اردو ہی بولتے ہیں لیکن بعضوں کی اردو میں فارسی اور عربی کی آمیزش زیادہ ہے بعضے ہندی اور سنسکرت الفاظ اس میں داخل کرتے ہیں۔ بعض اصطلاحیں بعض خاص پیشوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور اکثر پیشہ ور کچھ نہ کچھ اپنی زبان میں اور لب و لہجہ میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ جس سے وہ فقط اپنی طرز تقریر سے پہچانے جاتے ہیں کہ کس پیشے کے ہیں۔ فقیروں اور بے نواؤں کا لہجہ اور ہے۔ اور بانکوں اور شہدوں کا اور۔ عورتیں کچھ اور ہی طرح بولتی ہیں اور مرد کچھ اور۔ ہندوؤں کی عورتوں کا لب و لہجہ مسلمان عورتوں کے لب و لہجہ سے بالکل جدا گانہ ہے۔ ان تمام خصوصیتوں پر نظیر کی نظر اس طرح دوڑتی تھی اور حاوی ہو جاتی تھی کہ وہ پکّی عمر کو پہنچ کر اس قدر قادر الکلام ہو گیا تھا کہ جس طبقہ ناس کی تقریر نقل کرنے کو کہیئے وہ کر دیتا اور اس خوبی کے ساتھ کہ معلوم ہوتا نقل نہیں اصل ہے۔ کبھی آپ سپتیرے بنے ہوتے ہیں کبھی آپ مچھوئے کے لباس میں تشریف لائے ہیں کبھی مارواڑی بن کر کچھ ارشاد کر رہے ہیں اُردو چوں کہ ہر زبان کو مہمان نوازانہ اپنے کاشانے میں جگہ دیتی ہے۔ اس لیے جو شخص اُردو میں کمال پیدا کیا چاہتا ہے وہ گویا بالطبع اور کئی زبانوں کی تحصیل پر مجبور ہوتا ہے اسی لیے مجبوری اور کچھ طبیعت کی رنگینی کی وجہ سے نظیر نے اپنی توجہ کو مختلف زبانوں کے حاصل کرنے کی طرف مصروف کیا۔ وہ تھوڑے زمانے میں پنجابی خاصی طرح بولنے لگا۔ برج بھاشا میں اس نے گوپ اور گوپیوں کی سی مہارت حاصل کی۔ پوربیوں کا لہجہ اخذ کیا۔ مارواڑیوں کی اصطلاحیں یاد کیں۔ ملک محمد جائسی کی بھاشا میں یا وہ جو تلسی داس کی ہے اس میں کمال پیدا کیا۔ کنھیا جی کا جنم وغیرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو ہندوؤں کی اصطلاحوں میں پنڈتوں اور کبیشروں[1] کا سا کمال تھا اور اسی سے یہ بھی ترشح ہوتا ہے کہ اس کو زبان سنسکرت اور ہندوؤں کے مذہبی اور تاریخی امور میں اچھا خاصہ دخل تھا۔

---

[1] ملک الشعرا (م)

اس کا ٹھیک تعین نہیں ہو سکتا کہ نظیر نے یہ غیر زبانوں میں کمال کس زمانے میں حاصل کیا تھا۔ پنجابی، چوں کہ دہلی میں اکثر لوگ پنجاب کے بسے ہوئے ہیں اور پنجاب ہی میں وہ شہر داخل ہے، غالباً اس کو لڑکپن ہی میں معلوم ہو گئی ہوگی۔ لیکن اور زبانیں خصوصاً سنسکرت غالباً اس نے بعد فراغ مکتب سے نکلنے کے بعد سیکھیں۔

جس زمانے میں نظیر تھا اس میں مذاقِ تصوف لوگوں پر غالب تھا۔ کبیر اور گرونانک کی تعلیم نے لوگوں کو بتا دیا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا تصوف قریب قریب ایک ہے اور اگر غور سے دونوں مذاہب کے تصوف کی چھان بین کی جائے تو مال ایک ہی ٹھہرتا ہے اس لحاظ سے اکثر صوفی خیال مسلمان بعض اوقات ہندو جوگیوں اور مذہبی پیشواؤں اور عالموں سے ملتے اور واقعی معقول استفادہ کرتے تھے۔ ہمارے شہر عظیم آباد میں ایک پرانے آدمی شاید کوئی سو برس سے زیادہ عمر کے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں ایک فقیر کا ذکر کیا جن کا ہمزہ علی شاہ نام تھا۔ انھوں نے بیان کیا کہ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ یہاں آن کر شاہ ارزاں صاحب کی درگاہ پر رہ گئے۔ بہت ہی کامل درویش تھے۔ ان کا اکثر معمول تھا کہ ہندوؤں کی کتھا میں شریک ہوتے۔ ہندو بھی ان کی بڑی آو بھگت کرتے اور ممتاز جگہ دیتے۔ کتھا کہنے والے خاص کر ان کی طرف خطاب کرتے اور یہ بہت ہی محفوظ وہاں سے واپس آتے۔

تذکرہ گلشن بےخزاں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت شاعر بھی تھے چنانچہ صفحہ 284 میں صاحب تذکرہ میاں باطن لکھتے ہیں کہ ہمزہ تخلص لا اعلم۔ از فقرائے شاہجہاں آباد۔ سیرگاہ ان داتا کی بلدۂ عظیم آباد درویش سخن کا غذ کے تکیے میں اس طرح کہتا ہے حق کی یاد۔ ہمزاد طبع شوال سخن کو یوں کرتا ہے یاد۔

ہائے کس کس کے تئیں بیٹھ کے ہم یاد کریں غم مجنوں کریں یا ماتم فرہاد کریں

اس ذکر سے مقصد یہ ہے کہ کچھ اس طرح کا مذاق میاں نظیر کا بھی ہوگا۔ تعلیم کے تعلق سے چوں کہ ہندوؤں کے ہاں ان کو رہنے کا زیادہ اتفاق ہوا اس سے شاید یہ مذاق اور چمکا ہوگا۔ علمائے ہنود کی صحبت اور ذہن وذکا کی تیزی اور حافظے کی قوت، اور تلاش کی انتہائے صادق نے ان کے ذخیرۂ دماغ کو تھوڑے ہی دنوں میں معلومات سے کافی بھر دیا ہوگا۔

ہر چند ہم نظیر کے حالات تعلیم میں صدرا اور شمس بازغہ کا کہیں ذکر نہیں پاتے اس کے آگے کسی فقہ واحادیث کی موٹی موٹی کتابیں کھلی ہوتی نہیں دیکھتے۔ وہ منطق اور معقولات کی موشگافیوں میں الجھا ہوا نظر نہیں آتا۔ وہ علم کلام اور علم عقاید میں غوطے لگاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا، لیکن یہ خدا کی دین ہے اس میں کسی کا اجارہ کیا ہے۔

خدا کی دین کا موسٰی سے پوچھیے احوال کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

وہ اگر کسی کو بے محنت گھر بیٹھے تمام علوم کی دولتیں عطا کر دے تو اس کی قدرت سے کیا بعید۔ اکثر بزرگوں کے حالات میں مذکور ہے کہ ان کی خضر سے ملاقات ہوئی جنھوں نے ایک غیر معمولی طریقے سے تمام علم کو اُن کو گھول کر پلا دیا۔ ہم کو وجود خضر سے انکار نہیں اور نہ اس میں کلام ہے کہ بعض حضرات کو اُن سے یہ غیر معمولی فیض پہنچا بھی ہے۔ لیکن اس کثرت سے جو روایتیں مشہور ہیں وہ یقیناً محلِ تامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے ایسے ذہین ہو گزرے ہیں کہ جنھوں نے اپنی فطری بے چینی اور سیمابا وشی سے، جو اذکیا[1] کا خاصہ ہے، زمانہ تحصیل میں رسمی طریقے پر زیادہ علم حاصل نہیں کیا۔ لیکن اس کی جبلی مادے کی وجہ سے پھر جو آگے چل کر اُن کی توجہ ہوتی ہے تو رسمی طریقے تحصیل میں عمر بھر جانفشانیاں کرنے والے بیٹھے ہی رہ گئے ہیں۔ اور یہ ان سے بمراحل آگے نکل گئے ہیں۔ اگر ایسے اذکیا کا میلانِ خاطر کچھ مذہب اور تصوف کی طرف ہے تو انھیں کی نسبت کہا جاتا ہے کے خضر سے انھوں نے تعلیم پائی ہے۔ بس ان صورتوں میں خضر حقیقت میں نام ہے اُن فطری قویٰ کا جن کو ظلمات استعداد سے بعض خاص اوقات میں فعل کی روشنی میں جلوہ گر ہونے کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ خضر نظیر کی استعداد کے ظلمات میں بھی تشریف رکھتے تھے۔ اور یہ انہی خضر کا تصرف ہے کہ بغیر اس کے کہ وہ باضابطہ تعلیم کا قدیم کورس تمام کرے وہ تمام علوم میں ایک خاصی مہارت رکھتا تھا۔ علم ہئیت کے اکثر مسائل جن کی معمولی ریاضی دانوں کے فلک کو بھی خبر نہیں، اس کو ازبر تھے۔ وہ علم معانی و بیان میں ایک معقول، معلومات رکھتا تھا۔ اچھے اچھے قابل اور ذی علم لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتے بیٹھتے ہر علم کے متعارف اور معمولی مسائل اس کو نوک زبان ہو گئے

---

[1] اذکیا۔ جمع ذکی۔ (م)

تھے۔ وہ ایسی ویسی صحبتوں میں بیٹھا ملتا تو لوگوں کو مشکل سے معلوم ہوتا کہ وہ علوم عربیہ کا پورا عالم نہیں ہے۔ ہر چند طب اس نے نہ پڑھی ہو لیکن معلومات طبّی اس کو کم نہیں معلوم ہوتی۔ ہم اس کے شاگردوں میں ایک طبیب کو بھی پاتے ہیں جس کا نام مانک چند اور عُرف جتّی جی تھا۔ یہ شہر کا ایک نامی طبیب تھا اور اخیر عُمر میں نظیر کے خاندان کے لوگوں کا علاج اسی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔

حق تو یہ ہے کہ سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں علم کی بھوک پیدا ہو جائے اور اس طرح کہ ہر وقت بھڑکی رہے۔ عالم کے جس قدر اجزاً ہیں ہر جُزے اس کے ذہن میں حرکت پیدا ہو جائے۔ اس کی جس پھُول پر نظر پڑے، وہ اس پھُول کو پھُول نہ سمجھے بلکہ کاتب قدرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا چند ورقوں کا ایک نادر رسالہ۔ جس پتّے پر نگاہ ڈالے، سمجھے کہ دفترِ معرفت ہے بقول سعدی ؎

برگِ درختان سبز در نظرِ ہوشیار   ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ہر واقعے اور ہر ماجرے کو دیکھ کر بیسیوں سوالات دل میں پیدا ہونے لگیں۔ چوں وچرا عقل کی زبان پر ہو۔ کو اور کجا اور این ومتی تفتیش وتفحّص کا تکیہ کلام ہو۔ اگر یہ کیفیت طالب میں پیدا ہو گئی ہے اور علوم رسمیہ سے ایک حرف بھی اس کو معلوم نہیں تو وہ ایک بڑا عالم متبحّر ہے، اگرچہ اس کا علم قطرے سے زاید نہیں۔ اور وہ فلکِ معلومات کا آفتاب ہے، ہر چند وہ ایک ذرّے سے کم رُتبہ ہے۔ نظیر میں ہم اس کیفیت کی ایک اعلا نظیر پاتے ہیں۔ گو اُس نے پڑھا مکتب ہی میں، لیکن اس نے کبھی اپنی آنکھوں کو انھیں چند ورقوں میں محدود نہیں رکھا۔ وہ مکتب میں بیٹھا ہوا ہے تو سبق کے علاوہ اپنے ہم مکتبوں کے عادات وخصائل پر غور کر رہا ہے۔ کوئی کسی کا مُنہ شرارت سے چڑا رہا ہے تو یہ اس کے لیے بدر چاچ[1] کے ایک دلچسپ چیتانی شعر کا کام دیتا ہے۔ جس کے مطالب پر آہستہ آہستہ غور کرنے لگتا ہے اور آخر ایک صحیح مطلب ذہن سے پیدا کر کے رہتا ہے۔ اُستاد پر بیٹھے بیٹھے غنودگی طاری ہوتی ہے اور اس رحمت نشان غفلت

---

[1] بدر چاچ = فارسی کا ایک قصیدہ گو شاعر (م)

بے معصوم ہم سبقوں میں جو ایک خاص قسم کی مسرت پھیلتی ہے اور چپکے چپکے مختلف مشاغل لا یعنی اور افعال تفریح انگیز و شرارت خیز کا دفتر کھل جاتا ہے، تو نظیر کے آگے انسانی طبیعت کا ایک دلچسپ مسئلہ پیش ہو جاتا ہے جس کو بڑی رغبت سے وہ سلجھانے لگتا ہے۔ غرض اس قسم کی تعلیم تھی جس کا قیمتی سرمایہ لے کر وہ بازارِ دنیا میں معلومات اور تجربوں کی خریداری کے لیے وارد ہوا۔

اُستادوں اور شاگردوں کے حُسنِ اخلاق

مکتب ہی کے قیام کے زمانے میں نظیر نے اُن تعلقات پر بھی غور کیا جو اُستاد اور شاگردوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اُستادوں میں اکثر وہ بھی ہوتے ہیں جن کی چلبلی طبیعتوں کو عموماً عشقیہ قطعے پسند آتے ہیں اور جن کی چلتی پھرتی ہوئی نگاہیں زیادہ تر حُسن و نگار وصلوں سے لڑی رہتی ہیں۔ ایسے اُستادوں کی خوش قسمتی سے شاگردوں کے زمرے میں بھی بعض ایسے منتخب روزگار ہوتے ہیں جن کے مصحفِ رُخ کی طلائی لوح اور مینا کار جدولوں اور نقش و نگار میں کاتب قدرت یاقوت رقم نے صنعتیں صرف کیسے ہوتا ہے۔ ایسے اُستادوں اور شاگردوں کے باہمی برتاؤ ایک ذہین اور فہیم اور تیز ہوش لڑکے کے لیے بے شک نہایت تفریح بخش اور دل آویز تماشے ہوتے ہیں۔ نظیر نے اس قسم کے بیسیوں تماشے دیکھے تھے۔ بعض محض معصومانہ تھے، اور بعض کسی قدر نفرت کو بھی جوش میں لاتے تھے۔ خود لڑکوں کے بھی آپس کے برتاؤ بعض وقت بڑے زور سے اس کی عبرت شکار نگاہ کو اپنی طرف کھینچتے تھے، اور دیر تک محوِ تماشہ رکھتے تھے۔ وہ ان برتاؤ سے بھی کبھی مسرت اور کبھی نفرت حاصل کیا کرتا تھا۔ معصومانہ روشیں، میل جول اور اختلاط اور ارتباط کی، اس کو بھاتی تھیں اور شرارت انگیز فطری چلبلا پن اس کو خوش آتا تھا۔ لیکن جب کبھی بعض ناپاک خیالات کا فوارہ اُبلتے دیکھتا تھا تو وہ متنفر بھی اتنا ہی ہوتا تھا۔ اس قسم کے ناہموار لڑکوں سے بات کرنی تو درکنار ان کا پاس بیٹھنا تک اس کو ناگوار گزرتا تھا۔ اپنی اسی نفرت کو ہنسی میں ڈال کر بعض نظموں میں نہایت خوش طبعانہ طور پر اس نے ظاہر کیا ہے۔ اس نظم میں مدرسے کے علاوہ کسی قدر خانقاہ،

شیولے اور مندر وغیرہ کا تجربہ بھی شریک ہے۔

لڈو میں نہ پیڑوں نہ اولوں میں مزا ہے   جو مردِ مجرد کے . . . . میں مزا ہے

ریاضت

اُس زمانے میں تعلیم میں ریاضت بھی داخل تھی۔ اب کی طرح لوگوں کے خیالات نہ تھے۔ اس وقت میں مرد کا لفظ آیا اور اس کے ساتھ سپاہی کا ایسوسی ایشن ذہن میں پیدا ہوا (یعنی تمام سرو سامانِ سپہ گری ذہن میں خطور کر گئے) ہر مرد کے لیے ضرور تھا کہ وہ کچھ فنِ کشتی میں دخل رکھتا ہو۔ کچھ پھینک جانتا ہو، لٹھیت ہو، گتکے پھری کا شوق رکھتا ہو۔ اکھاڑے میں روزانہ ڈنڈ پیلتا ہو۔ جوڑی ہلاتا ہو۔ تلوار، بانک، پٹا، بلم، لزم۔ کسی ہتھیار کے چلانے میں بند نہ ہو۔ نظیر نے بھی اپنی بساط بموجب کچھ کچھ اس فن میں مہارت پیدا کی تھی۔ ورزش کی تو اس کو یہاں تک ایک عادت پڑ گئی تھی کہ ہونے کو بوڑھا ہو گیا لیکن اس معمول کو نہ چھوڑا۔ اخیر عمر میں جب کچھ نہیں ہو سکتا تھا تو فقط دیوار ہی کی ورزش کر لیتا تھا۔ اسی ورزش کی بدولت بڑھاپے میں بھی یہ دم و خم تھے کہ ایک جگہ ارشاد کرتے ہیں ؎

اے یار سو برس کی ہوئی اپنی عمر اگر   اور جھریاں پڑی ہیں سارے بدن کے اوپر
دکھلاتے جس گھڑی ہیں میداں میں زور جا کر   رُستم کو بھی سمجھتے اپنے نہیں برابر
اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے

نظیر بانکے بنتے ہیں

جن دنوں نظیر کی اُٹھتی جوانی تھی، یہ اپنے زور میں کس کو مال موجود سمجھتے تھے۔ زور جوانی کی اُمنگوں میں کچھ دنوں یہ بانکے بھی بنے رہے، اور اکثر شہر کے بانکوں کے ساتھ نشست و برخاست اور گفت و شنید رہتی، چنانچہ اس زمانے میں جو اُن کے محاورے ان کی زبان پر چڑھ گئے تو پھر تا عمر نہ بھولے۔ جہاں کہیں لڑائی یا

لہ خطور کر گئے = داخل ہو گئے۔ (م)

پہلوانی یا ڈینگ ہے یا تبّلی کا ذکر آجاتا ہے، تو پھر یہ خاصے بانکے ہیں۔ جن دنوں یہ بانکے تھے ان دنوں کا حال وہ یوں تحریر فرماتے ہیں۔

بانکے بھی ہوئے ہم نے اس دید کو اُڑایا　　شمشیر اور سپر کو ایک عمر کھڑ کھڑایا
بانک و پٹا و بلم گدکا و لٹھ پھرایا　　جھمکا تمھارا اس دم ہم کو جو یاد آیا

اک دم کو آگئے ہیں، مُنہ مت چھپا لے ہم سے
ٹک ہنس کے اور پری رُو آنکھیں لڑا لے ہم سے

کُشتی میں کتنی مدت ہم نے بدن کو توڑا　　سو گُل بدن کے تن کو من مانتا مروڑا
جو ڈھب تھا اُس ہُنر کا کوئی نہ ہم نے چھوڑا　　اب خوب رو کا پیارے دُنیا میں دیکھ توڑا

اِک دم کو آگئے ہیں ـــــ الخ

پھر دوسرے خیال میں بانکوں اور سپاہیوں کا ذکر یوں فرماتے ہیں:۔

یا ہو سپاہی، بانکا ترچھا، بڑا، کہایا　　بل دار باندھ چیرہ طُرّے کو جگمگایا
کھیتوں میں جاکے کُودا، لاکھوں کتیں بھگایا　　جب مُنہ اجل کا دیکھا، پھر کچھ بھی بن نہ آیا

یکتا شجاع بہادر صفدر ہوا، تو پھر کیا

گھوڑا اُٹھا کے ڈُوبا فوجوں میں ہو دل آور　　مارے طپنچے بھالے، کھائے کٹار جمدھر
مارا قضا نے بھالا جس دم فنا کا آکر　　پھر مُردمی شجاعت سب ہوگئی برابر

خود و سلاح، چلتہ، بکتر ہوا، تو پھر کیا

یا خانہ جنگی لڑکر کھایا بدن میں ٹانکا　　مُونچھوں کو تاؤ دے کر سوُدوت دھات ہانکا
جب گھور کر قضا کے بانکے نے آکے جھانکا　　ٹیڑھا رہا نہ ترچھا گُنڈا رہا نہ بانکا

تیغا، سپر، قرابیں، جمدھر ہوا، تو پھر کیا

آزادوں کے محاورے میں یہ بند بھی قابل ملاحظہ ہے:۔

ہر آن کھڑ کھڑاکے سے اس ڈھب کا لگا رگڑا　　جوشن کے کھڑک اس کی ہو بند سبھی دگڑا
چکّان چڑھا گہرا اور باندھ ہرا پگڑا　　کیا سیر کی ٹھہرے گی ٹک چھوڑ کے یہ جھگڑا

کُونڈی کے نقارے پر ٹھنکے کا لگا ڈنکا
نت بھنگ پی اور عاشق دن رات بجا ڈنکا

اس بند میں بھی پہلوانانہ مذاق ہے:

جاڑا تو اپنے دل میں تھا پہلوان جھجھاڑا پر ایک تل نے اس کو رگ رگ سے ہے اکھاڑا
جس دم دل و جگر کو سردی نے آ لتاڑا خم ٹھونک دوں ہی، ہم نے جاڑے کو دھر پچھاڑا
تن پھیر ایسا بھیگا جب کھائے تل کے لڈو

بلبلوں کی لڑائی اور ریچھ کے بچے کے بیان میں جو بند کشتی سے متعلق آئے ہیں وہ نقل ہو چکے ہیں۔ اُن میں بھی پہلوانانہ مذاق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اور الفاظ اور ترکیبیں سب مناسبِ مضمون ہیں:۔

پہلوان کا رُوپ:۔

دید بازی کے تماشہ گاہ میں بہادری کے رُوپ یوں بھرتے ہیں:۔

دیکھا جو حُسن بھاری شہزور یا جباڑا تو پہلوان بن کر کھودا وہیں اکھاڑا
ڈنڈ پیل، بھان مگدر، لیزم سے خم کو جھاڑا اس پیچ سے ہی گل رو بیٹھے کو دھر پچھاڑا
سو مکر و فن بنانا، سو رنگ رُوپ بھرنا
عاشق کو ہر طرح سے خُوباں کی دید کرنا

لکڑی باز کا رُوپ:۔

جو حُسن تھا چمکتا قاتل کا مثلِ کتّا تو لکڑی باز بن کر پھینکا پھری بھی گتکا
بانک اور پٹّا ہلایا، محنت سے ہو کے تتّا زاوت ہی بن کے مارا اس پر بھی اپنا ہتّا
سو مکر و فن بنانا ـــــــ الخ

بانکے کا رُوپ:۔

دیکھا جو حُسن بانکا تو بن کے ٹیڑھے بانکے تیغ و سپر، طمنچے باندھے ہیں سب جہاں کے
کرخانہ جنگی اس سے کھائے بدن پہ ٹانکے ٹلنکے تو کھائے، لیکن پھنکے بھی خوب پھانکے
سو مکر و فن بنانا ـــــــ الخ

خیبر کی لڑائی میں بھی معرکے کو خوب لکھا ہے اور اس سے بھی پہلوانانہ مذاق ٹپکا پڑتا ہے۔

نظیر کی جوانی

جوانی کا زمانہ ایک ایسا سحر انگیز اور جادو تاثیر زمانہ ہے کہ اس میں بھدّے سے بھدّے اور سُست سے سُست آدمی کے خیالات میں بھی بلند پروازیاں آجاتی ہیں۔ ہر چند بدصورت ہو مگر وہ خواہ مخواہ آئینے کی تلاوت میں مصروف ہوتا ہے۔ بالوں میں ہر وقت تیل پڑتا ہے۔ کنگھی ہوتی ہے۔ بیسن سے مُنہ دھویا جاتا ہے۔ رنگ کی صفائی کی دوائیں تلاش ہوتی ہیں۔ بلاناغہ چوک کی سیر ہوتی ہے۔ دوستوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ تاش ہو رہا ہے۔ چوسر بچھی ہوئی ہے۔ ایک طرف ستار چھڑ رہا ہے۔ دوسری طرف کوئی الاپ رہا ہے۔ قہقہے چھت اُڑا رہے ہیں۔ لطیفوں کی دھوم کان پڑی آواز سُننے نہیں دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جوانی کے آنے سے لڑکپن کے معصومانہ خیالات پر ایک برقی اثر پھیل جاتا ہے اور ایک نئی دُنیا نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ جس طرح آفتاب کے قریب نصف النّہار پہنچتے پہنچتے کرنوں میں ایک خاص گرمی اور دُھوپ میں ایک خاص تابانی آجاتی ہے، اُسی طرح جوانی کے ترقّی کرنے سے خواہشوں میں ایک خاص شیری خیالات میں ایک خاص جودت، اور ارادوں میں ایک خاص قوّت آجاتی ہے۔ نظیر جس کو ہم ایک غیر معمولی طبیعت کا آدمی ظاہر کر چکے ہیں، کیوں کر اس عموم سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ اس میں بھی تمام وہ خواہشیں موجود تھیں جو جوانی میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ بلکہ عطیّاتِ فطری کے غیر معمولی ہونے سے وہ خواہش بھی اس کی ذات میں اوروں کی بہ نسبت غیر معمولی تھیں۔ ہر چند وہؔ جیسا کہ خود کہتا تھا، کہ بد منظر تھا مگر کیا جوانی میں اس کراہتِ منظر نے ایک منٹ کے لیے بھی اس کو آئینہ دیکھنے سے باز رکھا۔ وہ آئینہ میں معائنہ جمال کی اس طرح مزاولت[۵] کرتا تھا کہ جیسے کوئی وظیفہ چی وظیفے کی۔ صبح ہوئی ہے۔ بستر سے اُٹھتے ہی اُس نے سرہانے سے آئینہ اُٹھایا ہے۔ خواب کے خمار سے چہرے پر جو ایک خاص اثر پیدا ہوا ہے اس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتا ہے۔ رومال سے چہرے کو پُونچھتا

---

۵ مزاولت۔ کسی عمل کو بار بار کرنا۔ (م)

ہے اور اس کو ایک ما لُقیراز ینہ نفاست پر لے آتا ہے کہ حوائج سے فارغ ہونے اور مُنہ ہاتھ دھونے تک دوستوں کو نفرت کی وجہ باقی نہ رہے۔ بلکہ اگر کسی دل میں اس کی محبّت ہو تو وہ اس خاص خوش نما خمار آلودہ حالت کو رغبت اور خوشی کے ساتھ دیکھے۔

ہر چند آغاز جوانی میں خود بینی اور خود نمائی آئینہ سامنے لائی ہو، لیکن آگے چل کر بلند نظری کے باعث اسی آئینے میں اس کو خدا بینی اور خدا نمائی کے جلوے بھی نظر آنے لگے۔ وہ اپنی کمزوری کو جانتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ خود بینی اور خود نمائی تھوڑی بہت ہر انسان میں ہے، اور بعض حالتوں میں اعتدال کے ساتھ کچھ انسانی سوسائٹی کی زینت اور ترقی کے لیے یہ کمزوری ضروری بھی ہے۔ پس وہ کسی کو انصافاً آئینہ دیکھنے سے سختی کے ساتھ منع نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لوگوں کو اس جائز خواہش کے پورا کرنے کی صرف اجازت ہی نہیں دیتا، بلکہ ان کو تاکید کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ خیال کے کسی قدر بلند کرنے سے اس ادنا خواہش سے بھی کتنے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔

من عرف نفسہ فقد عرف ربہٗ۔ الانسان عالم اصغر۔ اس قسم کے بلند صوفیانہ اور حکیمانہ خیالات کے مخفی معانی پر آئینہ بہت کچھ روشنی ڈال سکتا ہے۔ کہتا ہے۔

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ — صُورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ
خالِ سیاہ اور خطِ مشکِ بار دیکھ — زُلفِ دراز و طرۂ عنبر نثار دیکھ
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل، تو اپنے حُسن کی آپ ہی بہار دیکھ

آئینہ کیا ہے؟ جان، ترا پاک صاف دِل — اور خال کیا ہیں؟ تیرے سُویدا کے رُخ کے تِل
زُلفِ دراز فہم رسا سے رہی ہے مِل — لاکھوں طرح کے پھُول رہے ہیں تجھی میں کھِل
ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل، تو اپنے حُسن کی آپ[1] بہار دیکھ

---

[1] آپ ہی۔ (م)

نرگس وہ کیا ہے؟ جانا! تری چشمِ خوش نگاہ — اور سرو کیا ہے؟ یہ ترا قدِ دراز، آہ
گر سیرِ باغ چاہے تو اپنی ہی کر تو چاہ — حق نے تجھی کو باغ بنایا ہے، واہ واہ

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گُل! تو اپنے حُسن کی آپی بہار دیکھ

بیدلؔ نے بھی اس مضمون کو ایک مطلع میں کِس لُطف کے ساتھ ادا کیا ہے:۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ — تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کُشا بچمن درآ

نظیرؔ حوائج سے فارغ ہو کر مُنہ ہاتھ دھو کر چوکی کے فرش پر آن بیٹھا ہے۔ گو رومال سے مُنہ پونچھ چُکا ہے لیکن اس کو ہاتھ سے الگ نہیں کیا۔ خدمت گار نے آئینہ سامنے لا رکھا ہے۔ آنکھوں کے گرد کچھ تری رہ گئی ہے۔ اس کو رومال کے گوشے سے دُور کرتا ہے۔ بھنوؤں کے بال کچھ اُلجھ سے گئے ہیں، اُن کو سُلجھاتا اور ہموار کرتا ہے۔ بھیگی ہوئی مسیں بکثرت بھیگی ہیں، اور اُن میں رونق بہار پیدا ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر تک نو دمیدہ بالوں کی نوکوں پر پانی کی ننھی ننھی بوندوں کی پُر لُطف کیفیت میں وہ ایسا محو ہوتا ہے کہ اس کے دل سے اُن کے دُور کرنے کا خیال بالکل جاتا رہتا ہے۔ پھر وہ اس بے خودی سے چونکتا ہے، اور عُجلت کے ساتھ رومال کو مونچھوں تک لے جاتا ہے۔ چہرے کی صفائی کے بعد وہ اپنے جمال پر مکرّر نظر کرتا ہے اور کتابی چہرے کی کتاب کو نظرِ ثانی سے زیادہ منظورِ نظر بناتا ہے۔ بالوں میں تیل ڈالتا ہے کنگھی سے پہلے اُن کو سُلجھاتا، پھر مانگ نکالتا، پھر اس کی راستی کو آئینہ میں جھک جُھک کر ایک خاص ادا سے پیشانی میں بَل ڈال کر، بھنوؤں کو تان تان کر نگاہ کو سمٹا سمٹا کر، دیکھتا ہے۔ اگر مانگ سیدھی نہیں نکلتی، دو دو، تین تین دفعہ بالوں کو مُنہ پر لٹکاتا، جھاڑتا اور دونوں بھنوؤں کے بیچ سے شہادت کی اُنگلی کو سیدھ میں لے جا کر سیدھی مانگ نکالتا ہے۔ پھر الگنی کی طرف رُخ کرتا ہے۔ شبینہ کپڑوں کو جسم سے دُور کرتا ہے۔ نئے کپڑے بدلتا ہے۔ پھر نظر کبھی شانے پر ہوتی ہے، کبھی سینے پر۔ چُنی ہوئی آستینیں دامن گل چیں بنی ہوئی ہیں۔ چُنے ہوئے دامن سے پھول لپٹے ہوئے ہیں۔ خوش وضعی کے اس باغ میں بیٹھ کر وہ مُشک بوئنے سے دماغ کو معطّر کرتا ہے۔ بعض زندہ دل احباب اُس سے ملنے کو آ گئے ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر

کچھ ناشتہ کرتا ہے۔ پھر اپنے ہاتھ سے نہایت سلیقے سے پان بنا کر اُن کو بھی کھلاتا ہے آپ بھی کھاتا ہے۔ بات کرتا جاتا ہے اور کبھی کبھی نظر بچا کر ہونٹوں کی مصنوعی سُرخی کو بھی دیکھ لیتا ہے۔ باتوں میں اس کے لباس و پوشاک سے زیادہ بناوٹ ہے۔ ہر فقرہ زعفران زارِ کشمیر ہے۔ احباب ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاتے ہیں۔ نقلوں پہ نقلیں ہو رہی ہیں۔ لطائف کی کوئی انتہا نہیں۔ پھبتیوں کا کوئی شمار نہیں۔ ہر ایک شخص ضلع جُگت کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر نظیر کے آگے کسی کی چلتی نہیں۔

شاذ ہی کوئی منحوس دن ایسا ہوتا ہوگا جس میں نظیر کے ہاں احباب تشریف نہ لاتے ہوں۔ کیونکہ اس کے ہاں خوش گپیوں کی ایسی چاٹ تھی کہ بے عذر قوی خوش مذاق اور زندہ دل نوجوان اس چاشنی کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن آدمی ہی تو ہے اگر کسی سبب سے کبھی وہ حضرات نہ آتے تو نظیر بہ تقاضائے انس مضطر ہو کر خود جاتا۔ اگر گھر میں ملتے تو ان سے بیٹھ کر وہیں باتیں کرتا، نہیں تو ان کی خیریت دریافت کر کے چلا آتا۔ اور بعض روز اگر نہ جا سکتا تو گھر میں بیٹھ کر کتابوں سے جی بہلاتا۔ کتابیں جو اس زمانے میں اس کے پیشِ نظر رہتی تھیں ان سے جُداگانہ تھیں جو وہ مکتب میں پڑھا کرتا تھا۔ ہرچند مکتب میں بھی بعض دواوین اس نے پڑھے تھے مگر اب وہ کہاں مزہ دے سکتے تھے۔ کچھ تو جبلّت میں عشق و عاشقی، اس پر جوانی کی تائید۔ اب لگا وہ دن رات عاشقانہ پُر جوش خیالات میں محو رہنے۔ باتیں بھی کرتا تو عشق و حُسن کی، اور کتابیں بھی پڑھتا تو عشق و حُسن کی۔ مثنویاں وہ زیادہ دیکھتا تھا۔ جن میں عشق و محبّت کی داستانیں اُس کے شوق کو اُبھار کر، جُدائی کی مُصیبتوں میں ڈال کر، جذبِ صادق کے اثر سے خیالی طور پر اس کو وصل کے مزوں سے آشنا کرتی تھیں۔ دواوین کی وہ زیادہ مُزاولت رکھتا تھا۔ جن میں غزلوں کی خیالی بزم میں اس کو معشوق سے نت نئے طریقے سے مکالمے کا لُطف حاصل ہوتا تھا۔ وہ ہر شاعر کو اپنے دلی خیالات کا ترجمان پاتا تھا۔ بازار گیا ہے کوئی حسین عورت اس کو نظر آ گئی ہے۔ اس کی نرگسی آنکھیں اس کے دل کو تڑپا گئی ہیں۔ گھر میں

لہ ہم تم سے اسی روز کو روتے تھے نظیر آہ! کیوں تو نے پڑھا عشق و محبت کا رسالہ؟ ش

دیوانوں کی ورق گردانی کرتے کرتے وہ دیکھتا ہے کہ کسی غزل میں ہو بہو اسی حسین کی رنگین تصویر کھنچی ہوئی موجود ہے۔ کسی شب کو کسی جادو نظر کے حسن کی یاد شب کی تنہائی نے اس کو بہت ستایا ہے اور اس کی آنکھوں سے مایوسی کے جھونکوں نے نیند کو اُڑایا ہے۔ وہ دوسرے ہی دن صبح کو اُٹھ کر اپنی تمام روداد شبینہ کسی شاعر کی بیاض میں بعنیہ قلم بند پاتا ہے۔ اس زمانے تک اُردو کی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی گو سوداؔ اور میرؔ مطلعِ شہرت پر آفتاب و ماہتاب کی طرح چمک رہے تھے لیکن فارسی کے شعراء کے آگے اُن کا چراغ جلنا مشکل تھا۔ اُردو کے گنتی کے دو چار شاعر فارسی شعراء کی ایک پوری رجمنٹ کو کیوں کر بھگا دے سکتے تھے۔ اُردو والوں کے ہزار دو ہزار ورق دواوینِ فارسی کے کتب خانے کے کتب خانے پر کیوں کر غالب آسکتے تھے۔ حُبِّ وطن، جدّت پسندی، اور تفنن کی وجہ سے گو اُردو کے اُستادوں کا کلام بھی لوگ دیکھتے تھے، لیکن شیراز کی خلّرؔ[1] کے آگے ہندوستان کے ٹھرّے[2] کا رنگ کب جم سکتا تھا۔ نظیرؔ کی مُزاولت میں اس زمانے میں زیادہ تر اس قسم کی کتابیں رہتی تھیں۔ خمسۂ نظامی، خمسۂ جامی، خمسۂ خسرو، دیوانِ حافظ، دیوانِ وحشی، دیوانِ خسرو، نل دمن، دیوانِ نورالعین واقف، دیوانِ نظیری، دیوانِ بیدل، دیوانِ ہلالی، دیوانِ سعدی، دیوانِ صائب، دیوانِ ناصر علی، کلیاتِ نعمت خاں عالی، دیوانِ انوری، ظفرنامہ ہاتفی، لیلیٰ مجنوں، ہاتفی وغیرہ وغیرہ۔

کبھی کبھی وہ تفنن اُردو کے شعراء کا کلام بھی دیکھ لیتا تھا۔ جو اشعار یا غزلیں اس کو پسند آتی تھیں ان کو زبانی کر لیتا تھا اور اکثر بزمِ احباب میں ان کی مدد سے حُسنِ بیان کو چمکاتا اور اپنے دلی خیالات کو پُرزور طور سے بیان کرتا تھا۔ دیوانوں میں

---

[1] شیراز میں خلّر ایک قریہ ہے۔ وہاں کی شراب بہت عُمدہ ہوتی ہے۔ قاآنی نے اپنے قصائد میں اس شراب کا اکثر ذکر کیا ہے۔ (ش)

[2] ٹھرّا۔ دیسی اور خراب شراب، کم نشے کی گھٹیل اور سستی شراب ہے جسے چمار خاکروب وغیرہ پیتے ہیں۔ (ش)

چونکہ اکثر ایک ہی مضمون کی بار بار تکرار ہوتی ہے، کہیں سیکڑوں ورق اُلٹنے کے بعد کوئی نیا مضمون یا نیا خیال دکھائی دیتا ہے، اس لیے دیوان کا دیکھنا کوئی بہت دلچسپ کام نہیں ہے۔ دو چار دیوانوں کے دیکھنے کے بعد طبیعت تکرارِ مضامین سے گھبرانے لگتی ہے اور آخر تفنّن پیدا کرنے کے لیے کسی اور شاخِ ادب کی طرف جُھکنا پڑتا ہے۔ مثنویوں میں گو دواوین کی طرح ایذا رساں تکرار نہیں لیکن غور کرو تو وہ بھی ڈھلی ہوئی سب ایک ہی سانچے کی ہیں۔ مضامین گو کتنے ہی مختلف ہوں مگر گینڈا سب کا ایک ہی ہے۔ وہی حمد، وہی نعت، وہی سراپا، وہی فراق، وہی عاشق کے مصائب، وہی مصیبت کے بعد وصال۔ ہر مثنوی میں انہی مضامین کو تھوڑے تفاوت سے کون ذہین اور طبّاع آدمی لذّت اور خوشی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے؟ پھر مزہ یہ کہ ایک ہی قصّے کو مختلف اساتذہ نے قلم بند کیا ہے۔ گو ہر کہ ایک بیان میں اس کی خصوصیت خیالی کی وجہ سے کوئی خاص لُطف ہو لیکن مضامین میں کوئی خاص جدّت یا اضافہ نہیں۔ چچوڑی ہڈیوں کو نمک مرچ لگا کر مکرّر کون چچوڑ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مثنویاں بھی دس بیس کے بعد اجیرن ہو جاتی ہیں۔ اُنہی اسباب سے نظیر کی اسٹڈی[1] میں کبھی کبھی بڑی بڑی قصّے کی کتابیں بھی کُھلتی تھیں۔ وہ عُمرو عیار کی عیاریوں کو ضرب المثل کے طور پر سُنتا تھا۔ امیر حمزہ کی داستان کا ہاتھ آنا کوئی مشکل امر نہ تھا۔ کسی دن وہ اس کتاب کو لے آیا ہے۔ شوق کے ہاتھوں سے کھولتا ہے۔ تفریح کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کبھی اظہارِ حیرت کرتا ہے، کبھی متاسف ہوتا ہے۔ کہیں مُسکرانے لگتا ہے، کہیں کِھل کِھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ الف لیلیٰ کی شہرت سے بھی اس کے کان بھر رہے تھے۔ کہیں سے فارسی نسخہ لے آیا ہے اور عربی[2] خیالی پرستان میں عشق و عاشقی کی ایک وسیع اور پُر بہار اور حیرت انگیز آبادی پاتا ہے۔ گو بہت سی بستیاں ہیں لیکن ایک دوسرے سے ان کی سرحد اس طرح ملی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کُل بستیاں ایک ہی شہر کے مختلف آباد اور پُر رونق محلّے ہیں۔ کتب بینی کے مسافر کو اہلاً کان

---

[1] وہ کمرہ جو کتب بینی اور مشاغلِ مطالعہ کے لیے مخصوص ہو۔ (ش)

[2] عربی خیالی پرستان = عرب کا خیالی پرستان۔ (م)

نہیں ہوتی اور اس آسانی سے اس بڑی آبادی کے ہر گوشے کی سیر کر لیتا ہے، گویا وہ تختِ سُلیمان پر سوار تھا۔ ضارمنکوس[1] کی پُرمنفعت شہرت اس کو بوستانِ خیال[2] کی طرف لے جاتی ہے۔ اور خیال کی طلسمات آفریں قوتِ نامیہ اپنے سرسبز گل بوٹوں کی بہار دکھاتی ہے۔

چونکہ دہلی میں پیدا ہوا ہے جہاں ہر در و دیوار سے آثارِ ضادیدہ عجم پیدا ہیں۔ بقول عُرفی ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدیدست صنادید عجم را

اس کو طبعی طور پر سلاطین کے کارناموں کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ فیروز شاہ کی لاٹ دیکھتا ہے، کیوں کر نہ پوچھے کہ فیروز شاہ کون تھا؟ شاہجہاں کی جامع مسجد دیکھتا ہے، کیوں کر نہ پوچھے اس کا بانی کون تھا؟ قطب کی لاٹ، حوضِ شمسی، ہمایوں کا مقبرہ اُن میں سے ہر ایک پُکار پُکار کر اس کو تاریخ کی طرف بُلا رہا ہے۔

انشائے ابوالفضل، رقعاتِ عالمگیری۔ وغیرہ نیم تاریخی کتابوں کا تعلق کچھ پیشتر سے اس کے دل میں آہستہ آہستہ تاریخی دُنیا کا شوق پیدا کر چکا تھا۔ جوانی میں وہ شوق قوت پکڑ کر اس کو تاریخی کوچے میں تلاش و تفحّص کے پانوں سے دوڑاتا ہے۔ ابوالقاسم فرشتہ سے ملتا ہے، جہانگیر سے ملاقات کرتا ہے اور اس کی زبان سے اس کے حالات سُنتا ہے۔ تیمور سے ہم کلام ہوتا ہے اور اس کے عجیب و غریب خوابوں اور اس کے متعلق بزرگانِ دین کی مختلف کرامات اور پیشین گوئیوں پر عش عش کرتا ہے۔ گو ان قصّے کہانیوں کی طرح یہ کتابیں ہر جگہ چنداں دلچسپ نہیں، لیکن جہاں واقعات معمولی سطح سے بلند ہونے لگتے ہیں تو خیالی آنکھوں کو ایک خاص لُطف حاصل ہوتا ہے۔ گویا بڑے بڑے واقعات اس خوشنمائی سے چشمِ متخیلّہ میں نظر آتے ہیں جیسے مسلسل چوٹیاں خوشنما پہاڑوں کی ہوں، جو دُور سے اپنا سُرمئی جلوہ دکھاتی ہوں۔ ہر چند ابتدا میں انقلاباتِ سلطنت سے وہ چنداں عبرت حاصل نہیں کرتا

---

[1] ضارمنکوس = غالباً بوستانِ خیال کا کوئی کردار مُراد ہے۔ (م)

[2] بوستانِ خیال تصنیف میر تقی خیالؔ گجراتی۔

زیادہ تر وہ عشق و محبت کے قصوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ جہانگیر کے عہد کو اس مقام پر زیادہ شوق سے پڑھتا ہے جہاں اس کے عشقی تعلقات نور جہاں سے پیدا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ ترقی کرکے ایک رنگین افسانہ ہو جاتے ہیں۔ علاؤالدین کے دور کو وہ اس مقام پر زیادہ دلچسپی سے مطالعہ کرتا ہے جہاں وہ چتوڑ گڑھ کی رانی کو اپنے قبضے میں لانا چاہتا ہے۔ یا جہاں اس کا بیٹا خضر خاں دول رانی کے ساتھ عشق کی شطرنج کھیلتا ہے اور مشکل چالیں چلتا ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ اس کا دل عبرت سے ضرور متاثر ہوتا ہے، چنانچہ وہی تخم عبرت آگے چل کر شاداب کونپلیں نکال لاتے ہیں اور نشوونما پاکر جانفزا بہار دکھاتے ہیں :۔

گر شاہ سر پہ رکھ کر افسر ہوا، تو پھر کیا؟ — اور بحر سلطنت[1] کا گوہر ہوا، تو پھر کیا؟
باہیِ علم مراتب پُر : ۔ ہوا، تو پھر کیا؟ — نوبت، نشاں نقارہ در پر ہوا، تو پھر کیا؟
سب ملک سب جہاں کا سرور ہوا تو پھر کیا؟

کیا رکھ کے فوج لشکر کی سلطنت پناہی — پھیری دہائی اپنی لے ماہ تا بہ ماہی
جب آن کر فنا کی سر پر پڑی تباہی — پھر سر رہا نہ لشکر نہ تاج بادشاہی
دارا جم و سکندر اکبر ہوا، تو پھر کیا؟

یا ذات میں کہلائے نامی، اصیل، ذاتی — جمشید فر کے پوتے، نوشیرواں کے ناتی
تھے آپ مثلِ دُولہا اور فوج تھی براتی — جب چل بسے تو کوئی پھر سنگ تھا نہ ساتی
ملک و مکاں خزانہ لشکر ہوا، تو پھر کیا؟

یا راج بنسی[2] ہو کر دُنیا میں راج پایا — چتوڑ گڑھ[3]، ستارا[4] کالنجر[5] آ بنایا
جب توپ نے اجل کی آمورچہ لگایا — سب اُڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا
گڑھ کوٹ، توپ، گولا لشکر ہوا، تو پھر کیا؟

---

[1] اس مصرعہ میں علی گوہر کی طرف ایک مخفی اشارہ ہے۔ علی گوہر شاہ عالم کا نام تھا۔ (ش)

[2] راج بنسی شاہی خاندان کا آدمی، راجہ کے خاندان کا، راجپوت قوم کا نام۔ (ش)

[3] چتوڑ گڑھ اُودے پور میں ایک مقام ہے۔ یہاں راجپوت راجاؤں کا ایک مشہور خاندان قائم

(بقیہ ۳، ۴، ۵ اگلے صفحہ پر)

جتنے دنوں یہ غل تھا نواب بن یہ خاں ہیں　　یہ ابن پنجہزاری، یہ عالی خانداں ہے
جاگیر و مال منصب گو آج ان کے ہاں ہے　　دیکھا تو اک گھڑی میں نہ نام نہ نشاں ہے
دو دن کا شور چرچا گھر گھر ہوا، تو پھر کیا؟
کہتا تھا کوئی دیکھو یہ ہیں امیر[5] خاں جی　　اور یہ ہیں خان خاناں، اور یہ ہیں شیر خاں[6] جی
پنجہ اٹھا قضا کا جب آئے شیر خاں جی　　پھر کس کے میر خاں جی کس کے وزیر خاں جی
عُمدہ، غنی، تونگر، بازر ہوا، تو پھر کیا؟

(صفحہ ۶۹ سے آگے)

ہوا جو غایت شرافت سے اپنے آپ کو آفتاب نسب خیال کرتا ہے اور سورج بنسی کے لقب سے ملقب ہے۔ اس خاندان کے راجہ اپنے تئیں رام کی اولاد سے جانتے ہیں۔ سب سے پہلے چتوڑ گڑھ کے قلعے پر ماموں نے حملہ کیا۔ مگر اس کا حملہ ناکام رہا۔ علاؤالدین نے حملہ کرکے اس پر فتح حاصل کی اس فتح کے بیسیوں قصے بن گئے ہیں۔ انہی میں آلا اودل[3] بھی ہے۔ دوسری فتح اکبر نے حاصل کی۔ (ش)

[4] ستارا وہ جگہ ہے جہاں رام راجہ قلعہ جنجی سے بھاگ کر متحصن ہوا تھا مگر اورنگ زیب نے 1700 میں بذات خاص اس کا محاصرہ کرکے چوتھے مہینے میں فتح کر لیا۔ تاریخ فتح ستارہ اپریل 1700 ہے۔ (ش)

[5] کالنجر بوندیل کھنڈ کا ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ جس کے محاصرے میں شیر شاہ کی جان گئی۔ (ش)

[6] امیر خاں، محمد شاہ رنگیلے کا مصاحب تھا۔ عُمدۃ الملک اس کا خطاب تھا۔ بادشاہ کا بہت ہی منہ چڑھا تھا۔ اس کے سینکڑوں لطائف مشہور ہیں۔ چنانچہ وہ پوت سپوت کپوت والا لطیفہ بھی اسی کا ہے۔ جس میں محمد شاہ کے سوال پر خود بہ دولت کو تو پوت قرار دیا۔ برہان الملک کو سپوت اور اپنے تئیں کپوت۔ (ش)

[7] شیر خاں ایک اعلا خاندان افغان تھا۔ ہندوستان کے سلاطین اسلامیہ میں خاندان سور کا قائم کرنے والا یہی ہے۔ ہمایوں کے مقابلہ میں لڑا اور مختلف لڑائیوں میں اس کو شکست دے کر ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔ پانچ برس اس نے نہایت دھوم دھام سے سلطنت کی (از 1540ء تا 1545ء) چتوڑ فتح کر چکا تھا۔ کالنجر کی فتح کی تیاریاں تھیں کہ قضا کی میگزین نے اس کے دھوئیں اڑا دیے۔
اور یہ شیر خاں جی۔ اور یہ ہیں میر خاں جی۔

[3] آلا اودل = علاؤالدین اور پدمنی کے معاشقہ کی لوک کہانی۔ (م)

کہتا تھا کوئی گھوڑا ہے نام دار خاں کا یہ پالکی یہ ہاتھی ہے ذوالفقار خاں[1] کا
آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں[2] کا تر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہ سوار خاں کا

جھپّان[3]، بیگ ڈنبر در پر ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا ہے کوئی ڈیوڑھی ہے خان مہرباں کی یہ باغ یہ حویلی ہے محل دار خاں[4] کی
جب راج لے قضا کی کرنی بسولی[5] ٹانکی[6] اک اینٹ بھی نہ پائی ہرگز کسی مکاں کی

رنگین محل، سُنہرا گھر در ہوا، تو پھر کیا؟

کِتنوں نے بادشاہی کیا کیا خطاب پایا مہریں بڑی کھُدائیں، سِکّہ بڑا بنایا
جب آن کر فنا نے نام و نشاں مٹایا وہ نام اور وہ سکّہ ڈھونڈھا کہیں نہ پایا

دو دن کا مہر، چھاپا در پر ہوا، تو پھر کیا؟

جاگیر میں کسی نے زر ریز ملک پایا کر بندوبست اپنا نظم و نسق بٹھایا
لے کر سند اجل کا جب فوجدار آیا اک دن میں حکم و حاصل سب ہو گیا پرایا

ہانسی، حصار، ٹھٹھا، بھکّر ہوا، تو پھر کیا؟

کہتا تھا کوئی لشکر ہے طُرّہ باز خاں کا یہ خیمہ شاہانہ ہے شہنواز خاں[7] کا
آیا کٹک[8] اجل کے جب یکہ تاز خاں کا سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز خاں[9] کا

سردار، سپہ بخشی بڑھ کر ہوا، تو پھر کیا؟

---

[1] ذوالفقار خاں، اورنگ زیب کا نہایت ہی چُست و چالاک اور قابل سپہ سالار تھا۔ 1698ء میں قلعہ جنجی اسی کے ہاتھ سے فتح ہوا۔ (ش)

[2] تیس مار خاں اصل میں وہ آدمی جس اکیلے نے تیس کو مار کر خطاب خانی حاصل کیا ہو۔ ترم خاں ترم باز۔ (ش)

[3] جھپّان ایک قسم کی عماری نما پالکی جس کا سرد پہاڑوں پر رواج ہے۔ (ش)

[4] دِلّی میں محلدار خاں کا باغ شہر کے باہر چھاؤنی میں واقع ہے۔ جیسا کہ غالبؔ کے ایک فارسی کے رقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ (ش)

[5] بسولی، لکڑی گڑھنے کا اوزار۔ تیشۂ معمار۔ (ش)

[6] ٹانکی سنگ تراشوں کے ایک اوزار کا نام روخانی چھینی۔ (ش) (بقیہ ۷، ۸، ۹ اگلے صفحے پر)

محض تاریخی خشک دفاتر سے اُکتا کر کبھی کبھی وہ شاعرانہ تاریخی تصانیف کی طرف بھی رُخ کرتا ہے جن میں واقعات کے ضمن میں واقعاتِ عجیبہ اور معارکِ غریبہ کا ایک شاعرانہ دلچسپ پیرائے میں ذکر ہوتا ہے اور جن میں اکثر اوقات واقعات تاریخی سے زیادہ واقعات عشقیہ چمکائے جاتے ہیں اور رزم سے زیادہ بزم رنگین کر کے دِکھائی جاتی ہے۔ ممکن نہیں کہ وہ تاریخ اور ادب دونوں کا مذاق مشترک رکھ کر جوانی کے پُرجوش زمانے شاھنامے کی رنگین اور دلکش داستانوں سے باز رہا ہو۔

کتب بینی ہو اور جوانی کا زمانہ، پھر جوانوں کے مذاق کی نہایت شوخ رنگین کتابیں بعض اوقات تخلیہ میں نہ کھلیں، محض تعجب ہی تعجب ہے۔ ہرچند بطور درس بہارِ دانش کے کچھ اجزاء پڑھ گیا ہے، لیکن اس کی تمام حکایتیں ہنوز اس کی نظر سے نہیں گزریں اور اگر گزری ہیں تو ان کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ اب اس کتاب کو پھر نکالتا ہے۔ وہ عورتوں کے چرتّر کی حکایتوں کو غور سے پڑھتا ہے۔ رات کا آنا اور دن کا جگمگانا اسی ایک مضمون کو ہر جگہ ایک نئے طور پر پاتا ہے۔ وصال کی حالت کی تعبیر مختلف

(۴، ۵، ۶، صہ 71 سے آگے)

7 شاہ نواز خاں ناصر جنگ والی ریاست حیدرآباد کا وزیر یا مدار المہام تھا۔ غلام علی آزاد کا معاصر ہے۔ عملی قابلیت خاصی رکھتا تھا۔ شعر و سُخن سے بھی اس کو ذوق تھا ایک شاہ نواز خاں عبدالرحیم خان خاناں کا بیٹا بھی تھا۔ (ش)

8 کٹک فوج۔ (ش)

9 سرفراز خاں شجاع الدّین کا بیٹا اور مرشد قلی خاں کا پوتا تھا۔ 1740ء میں باپ کا جانشین ہوا۔ نادر شاہ کا حملہ بھی اسی زمانے میں ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان سے لُوٹ مار کر چلا گیا تو علی وردی خاں صوبہ دار بہار نے محمد شاہ کے وزیر کو کچھ دے لے کر بنگالے کی صوبے داری کی سند حاصل کی۔ حصولِ سند کے بعد فوج لے کر مرشد آباد پر چڑھ آیا۔ سرفراز خاں گولی سے مارا گیا علی وردی خاں اس کی جگہ تخت پر بیٹھا اور خُطبہ سکّہ جاری کیا اور حسب وعدہ دہلی کو ایک کروڑ نقد اور ستّر لاکھ کے جواہرات بطور نذرانہ روانہ کیے۔ (ش)

10 چرتر۔ چلتر فریب مکر چال چھل چھل بَتا۔ (ش)

دلچسپ اور دل آویز کنایوں میں معائنہ کرتا ہے۔ ان فقرات کو مزہ لے لے کر پڑھتا ہے اور گوہرِ بے بہا سمجھ کر حافظے کے بکس میں محفوظ طور پر رکھ لیتا ہے۔ وہ چرتر کی حکایتوں کو اپنے احباب کی محفل کے گرم کرنے کو یاد رکھتا ہے اور ان کو بعض اوقات موقع سے بیان کرکے ان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے اور کبھی بعض ذہین دوست سے کوئی چرتر کی تازہ نقل بھی سُن لیتا ہے اور پھر دیر تک مزے مزے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ذکر ہی ذکر میں دوسری اسی قسم کی کتاب کا حال معلوم ہوتا ہے۔ یہ مشتاق ہوتا ہے اور بڑے اصرار سے اس کی کسی دوست پر فرمائش کرتا ہے۔ اسی طرح آئے دن ایک نہ ایک نئی کتاب رنگین مذاق کی اس کے ملاحظہ میں گزرتی ہے اور رنگین علم مجلس کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اس کے پاس جمع ہوجاتا ہے۔

اس قسم کی کتب بینی کا اثر اس کے کلام کے بعض حصے پر بہت نمایاں طور پر پھیلا ہوا ہے۔ وصل، استمنا، خلاص، آندھی، نارنگی، بعض ہول، ازار بند، رم چیرا، اور کائستھ وغیرہ اسی قسم کے کلام میں داخل ہیں۔

اس سے زیادہ ہم نظیر کو اسٹڈی میں بند رکھنا پسند نہیں کرتے۔

کتنا ہی شوق علم کیوں نہ ہو لیکن اس سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ دن رات گردانی ہی میں مصروف رہے گا۔ کھانے کا وقت آگیا ہے۔ آخر وہ کچھ کھانا بھی چاہیے۔ روٹی دال سامنے آئی ہے۔ اور پیٹ میں پڑ کر آنکھیں سی کھول دیتی ہے۔

جب ملی روٹی ہمیں سب نورِ حق روشن ہوئے ۔۔۔ رات دن، شمس و قمر، شام و شفق روشن ہوئے
زندگی کے تھے جو کچھ نظم و نسق روشن ہوئے ۔۔۔ اپنے بیگانوں کے لازم تھے جو حق روشن ہوئے
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

وہ جو اب کھاتے ہیں باقرخوانی، کلچہ، شیرمال ۔۔۔ ہیں وہ خاص الخاص درگاہِ کریم ذوالجلال
یہ جو روٹی دال کا گردن میں ہم رکھتے ہیں جال ۔۔۔ جب ملی روٹی وہیں ہم ہوگئے صاحب کمال
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

روٹی کا اب ازل سے ہمارا تو ہے خمیر　　روکھی ہی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہووے موٹی، خمیری ہو یا فطیر　　گیہوں، جوار، باجرے کی جیسی ہو نظیر
ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

خوابِ نیم روز سے وہ ہشیار ہوا ہے۔ منہ ہاتھ دھوکر پھر بار ثالث آئینے کنگھی سے ملاقات کر رہا ہے۔ منتظر ہے کہ تمازتِ آفتاب میں کمی آئے تو پوشاک بدل کر سیر بازار کو نکلے۔ بتدریج دو تین بار آشنا بھی پاس پڑوس سے آگئے ہیں۔ گپیں چھڑ گئی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بڑے بڑے زور سے ہنسی کی آواز بلند ہوتی ہے۔ لیجیے آفتاب اب مغربی اُفق سے بہت قریب ہے۔ دُھوپ میں زردی آگئی ہے۔ وہ تیزی باقی نہیں رہی۔ شوقین جیوڑے ایک ایک دو دو کرکے اپنے گھر سے بن سنور کر نکل رہے ہیں۔ نظیر بھی بعض ہم مذاق زندہ دل دوستوں کے ساتھ ایک خاص شان سے نکلا ہے۔ گو لباس میں جوانی کے مذاق نے کچھ تکلّف کیا ہے، مگر اس تکلف میں بھی ایک سادگی ہے۔ سڑک پر جا رہا ہے کہ ایک طرف سے ایک نالکی چلی آ رہی ہے۔ ہٹو، بڑھو، کی آواز بلند ہے۔ کوئی امیر بڑی شان سے اس کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ نوکر سراخی حُقّہ لیے جلو میں دوڑے آتے ہیں۔ امیر صاحب کے منحنی قویٰ اور نالکی کی ہیت کذائی پر اس کو نعمت خاں عالی کی وہ مشہور پھبتی یاد آتی ہے۔ دوستوں کا خیال وہ اس نقل کی طرف پھیرتا ہے اور آپ بھی ہنستا ہے اور ان کو بھی ہنساتا ہے۔ جوہری بازار سے اس کا گزر ہوتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے مہاجن اور سیٹھ اپنی اپنی دُکانوں میں بیٹھے بہی کھاتا پھیلائے ہوتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچّے گورے گورے ہاتھوں میں سونے کے کڑے، کانوں میں بالی جھمکائے ان کے پہلو میں بیٹھے اپنے کسی معصومانہ کھیل میں مصروف ہیں یا کسی اپنے ہم جولی کے ساتھ اُچھل کود رہے ہیں۔

کتنے اسی بازار میں زر کے ہی پیشہ دار ہیں　　بیٹھے ہیں کر کر کوٹھیاں زر کے لگے انبار ہیں
سب لوگ کہتے ہیں انھیں سیٹھ ساہوکار ہیں

ہیں فرش کوٹھی میں بچھے تکیے لگے ہیں زرفشاں　　بہیاں کھُلی ہیں سامنے لکھتے ہیں لکھی کارداں
پکھ بیٹھ کچھ پر بیٹھ کی آتی ہیں باتیں درمیاں　　لاکھوں کی لکھتے درشنی، سو سینکڑوں کی ہنڈیاں
کیا کیا متی اور سُود کی کرتے سدا تکرار ہیں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کچھ مول کا مذکور ہے، کچھ بیاج[3] کا ہے ٹھکٹھکا　　　پھیلاؤ میں تیرج[4] کی بیجک[5] کا چرچا ہو رہا
دلال ہنڈی، پیٹھ کے، باعہن پرپیٹھ سدھ سوا　　　آڑت بٹھاتے ہر جگہ چٹھی لکھاتے جا بجا
کچھ رکھنے والے کے پنے، کچھ جوگ[6] کے اقرار ہیں

تھوڑی سی پونجی جن کی ہے بیٹھے ہیں وہ بھی کچ پلی　　　یدھر ٹکے دس بیس کے ادھر دھری ہیں کوڑیاں
اور جو ہیں حد ٹٹ پونجیے، وہ کوڑیوں کی تھیلیاں　　　کاندھوں پہ رکھ جاتے ہیں واں لگتی جہاں ہے گذریاں
دیکھا تو یہ سب پیٹ کے دھندے ہیں اور بستار[7] ہیں

اسی بازار میں ایک طرف سے ایک نہایت بانکے ترچھے سپاہی بل دار چیرہ باندھے اور اس پر طرّہ جگمگائے ہوئے ایک بانکے کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ دونوں زمین پر اس غرور کے ساتھ قدم رکھتے ہیں جیسے رُستم کے پوتے ہوں۔ ایک ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ رہا ہے تو دوسرا تقا کبوتر بنا ہوا ہے، زمین کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ بانکے صاحب الگ مُونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ سپاہی صاحب الگ داڑھی کو چڑھا رہے ہیں۔ وہ اگر خانہ جنگی لڑ کر بدن میں ٹانکے کھانے کا ذکر کر کے دوت دات ہانکتا ہے، تو یہ کھیتوں میں جا کودنے اور لاکھوں کے تئیں بھگانے اور پھر بے داغ نکل آنے کا تذکرہ کر کے تعلّی کی

---

[1] پیٹھ = شتےٗ۔ نقل۔ گم شدہ ہنڈوی کی نقل۔ (ش)

[2] پرپیٹھ = مثنےٗ کی نقل۔ دوسرا مثنےٗ گم شدہ ہنڈی کی تیسری نقل۔ تیسرا ردنہ (ش)

[3] بیاج وہ اضافہ جو ایک جنس کے بدلے میں اسی جنس سے لیا جائے، جیسے روپے کے بدلے روپیہ۔ پیسے کے بدلے پیسہ۔ گیہوں کے بدلے گیہوں کا زیادتی کے ساتھ مبادلہ ہو۔ مسلمان بیاز کو بولتے ہیں۔ (ش)

[4] تیرج ایک مطول اور مفصّل فردِ حساب کا خلاصہ ہے۔ (ش)

[5] بیجک وہ کاغذ جس میں مال کی تعداد خرچہ قیمت خرید اور تفصیل درج ہو۔ روانہ شدہ مال کی فہرست یا فرد۔ (ش)

[6] جوگ = وہ شخص جس کے نام ہنڈی کی جائے۔ (ش)

[7] بستار = پھیلاؤ۔ وسعتِ فراخی۔ کشادگی۔ طول کلامی۔ تفصیل۔ تشریح۔ (عورتیں بالعم بولتی ہیں) پھیلاوٹ = تقسیم۔ عمل۔ بانٹ۔ حساب کا عمل یا حل۔ (ش)

مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے۔

نظیؔر ان کی لمبی چوڑی باتیں سُن کر مسکراتا ہے۔ چلتے چلتے وہ آخر ایک ایسے مقام پر پہنچا ہے جہاں دو رویہ ہر درجے اور مرتبے کی قمریاں اپنی اپنی کابکوں میں بیٹھی لوگوں کو اپنی اداؤں سے رجھاری رہی ہیں۔ کسی کا کوئی معزز آشنا سامنے سے گھوڑا گُداکر نکل گیا۔ کسی کا کوئی دل لگی کا یار اکڑبل دکھا کر چلا گیا، جانے پہچانے لوگوں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہو رہی ہیں۔ کسی بوڑھیا نائکہ نے وسعتِ اخلاق سے کسی پُرانے ملاقاتی کو چھتّے کے نیچے پُکار کر ٹھہرالیا ہے۔ مزاج پوچھ رہی ہیں۔ ان کے مدّتوں سے نہ آنے کی شکایت فرمار ہی ہیں۔ "آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں، ہم غریبوں کے ہاں کیوں آنے لگے"۔ بڑے میاں معذرت کرتے جاتے ہیں "تُرد داتِ دنیاوی کا ایک دفتر کُھل گیا ہے" لڑکا بیمار تھا، خدا کے گھر سے پھرا ہے۔ بھائی پر ایک مقدمہ دائر ہو گیا تھا۔ مہینوں میں اس سے نجات ہوئی۔ خود میں مسہلوں کے عذاب میں تھا۔ جب سے وہ مرض مبارک ہوا جیت کے جیت مسہل لینا پڑتا ہے۔ نہ لوں تو تمام بدن پھوڑے پھُنسیوں سے بھر جائے۔ ایک عذاب میں ہوں"۔ ایک دوسرے کوٹھے پر ایک دوسرا سین ہے۔ چند جوان چھوکریاں جمع ہیں۔ ایک ایک ان میں کی آفت روزگار ہے۔ ان کے بیچ میں ایک مضحک صُورت کے بُرانے بوالہوس بیٹھے ہوئے ہیں۔ زمانۂ جوانی میں انھوں نے بہت عیش کیا ہے اور اپنی دولت بھی اسی عیش میں پھونک ڈالی ہے۔ بُڑھاپے میں نہ عیش کی قوّت ہے اور نہ ساماں مگر چسکا پڑا ہوا ہے۔

بُوڑھے ہوتے، پر حُسن کی چاہت نہیں چھُٹتی اور دل سے بھی محبوب کی اُلفت نہیں چھُٹتی
آنکھوں سے سے یہ دیدار کی لذّت نہیں چھُٹتی سب چُھٹ گیا پر دید کی لت نہیں چھُٹتی

ہے ویسی صحبت کے جی کیوں لگنے لگا۔ معمول بموجب آگئے ہیں۔ چھوکریوں کو ایک خاصہ مضحکہ ہاتھ آیا ہے۔

مُنہ دیکھتے ہی کہتی ہیں سب آؤ بڑے جی کیا آئے ہو یاں کرنے کو پیری و مریدی
کیا آئے ہو حضرت ہمیں قرآں پڑھانے ہنس ہنس کے کوئی پوچھے ہے نمازوں کے دوگانے
ٹھٹھے سے کوئی پھینکے ہے تسبیح کے دانے

کھینچے ہے کوئی ہاتھ، کوئی پکڑے ہے لکڑی — پٹے کہیں اور مونچھیں کہیں جاتی ہیں بگڑی
داڑھی کو پکڑ کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی
نقلیں کوئی اُن پوپلے ہونٹوں کی بناوے — چل کر کوئی کُبڑے کی طرح قد کو جھکاوے
داڑھی کے کنے اُنگلی کو لالا کے نچاوے

نظیر اس بازار سے گزرتا ہے جہاں خربوزے اور جمالیوں[1] کا انبار لگ رہا ہے۔ آموں کا ڈھیر ہے۔ ہندوؤں کی عورتیں بڑے گھیر کا لہنگا چولی پہنے دُلہن کی طرح گھونگھٹ نکالے، ایک خاص ادا سے چھم چھم کرتی ہوئی خریداری کے لیے آجا رہی ہیں۔ ان میں بعض کی حسین کلائی اس کے دل میں شوق کی گدگدی پیدا کرتی ہے۔ خمار آلودہ آنکھوں کی گھونگھٹ کے اندر سے ترچھی آڑی نگاہیں تیرِ نیم کش بن کر جگر کے پار ہوتی ہیں۔ نظیر گو اُن سے نہیں کہتا مگر دل ہی دل میں سو دفترِ شوق لکھ چلتا ہے اور بار بار اس کی طبیعت کے پُرجوش بحر میں یہ شعر عالمِ حُسن طلب میں موزوں ہوتا ہے ؎

اک دم کو آگئے ہیں مُنہ مت چھپالے ہم سے
ٹک ہنس کے اُوپری رو آنکھیں لڑالے ہم سے

بازار میں ایک گوشے میں گاہکوں کا بہت ہجوم ہے۔ کوئی رنگیلی کنجڑن چٹکیلی پوشاک پہنے نارنگیوں کا بیوپار کر رہی ہے۔ نارنگیوں سے زیادہ لوگ اس کی نارنجی پوشاک اور رسیلی آنکھوں پر لٹو ہیں۔ وہ شوخ بھی اپنی آنکھوں کی ترازو میں نہایت پھرتی سے لوگوں کے شوق کو تول رہی ہے ہر ایک کو اس کے اشتیاق کے مطابق نارنگی دکھاتی ہے۔ کبھی بے ساختگی سے آنچل ڈھلک جاتا ہے۔ کبھی کسی چیز کے اُٹھاتے وقت آپ سے انگیا تڑخ جاتی ہے۔

سامنے اپنے وہ بازار سا کولوں کا لگا — دم بدم چھیڑ سے کہتی ہے یہ انگیا کو دکھا:
"تم نے پیسے کی کبھی ہم سے نہ لی نارنگی"

روز کی ہواخوری اور سیرِ بازار نے نظیر کی معلوماتِ حسن و عشق میں ایک

---

[1] ایک موسمی پھل سردا اور خربوزہ جیسا۔ (م)

خاص وسعت پیدا کی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ حُسن کی کہر بائیت کم و بیش ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ اور تھوڑی بہت اس کی نوکیلی چوٹ ہر دل کو لگتی ہے وہ کبھی کبھی جھونپڑوں سے بعض ایسی صورت کو جھانکتے دیکھتا تھا جس سے نوابوں اور امیرزادوں کے دِلوں میں ہل چل مچل جا سکتی تھی۔ وہ بعض اوقات سُنتا تھا کہ بعض بیگمات جھروکے سے جھانکتے جھانکتے کسی کی اُلفت کی جھونک میں کسی جھونپڑے میں جا براجیں۔ باپ کالے کوسوں اپنی نوکری کے جھگڑوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ماں پردے کی بیوی اس کو باہر کی کیا خبر۔ میاں نظیر بے چارے جہالوں کی آفت سے دور، ایک پلٹن نوجوان دوستوں کی ہر وقت زیر کمان۔ دن رات شہر عیش و تفریح پر دھاوے رہتے تھے۔ آدمی شب و روز میدان کارزار میں رہے اور بال بال محفوظ رہے۔ کبھی کوئی چرکا نہ کھائے، کوئی گولی ذرا پہلو سے چھلتی ہوئی بھی نہ نکل جائے، ناممکن نہیں۔ نظیر کا دل بھی عشق کی چوٹ سے محفوظ نہیں رہا۔ اس نے اپنی سیر میں ایک نہیں بیسیوں دفعہ بعض ایسی صورتیں دیکھیں جن کو دیکھ کر وہ تلملا تلملا کر رہ گیا ہے۔ لیکن چونکہ قلب پر قابو رکھتا تھا اور مضبوط اصول اور مضبوط ارادے کا آدمی تھا، اس نے عنانِ اختیار ہاتھ سے نہیں دی۔ مگر آخر ضبط کی کوئی انتہا بھی ہے۔ ایک جگہ فقط آنکھیں متوالی تھیں۔ دوسری جگہ عصمت والی کے پاس بھنوؤں کی کھنچی ہوئی کمانیں، اور پلکوں کے سڈول اور لمبے نوکیلے تیر بھی تھے۔ تیسری جگہ زُلفوں کی لمبی کمند بھی لٹک رہی تھی۔ چوتھی جگہ وار روکنے کو دو قیامت کی ڈھالیں بھی تھیں۔ وہ کون سورما ہے جو اتنے ہتھیار دیکھ کر بھی ہتھیار نہ رکھ دے۔ نظیر کے بھی آخر پائے ثبات لڑکھڑائے۔ بے اختیاری شوق میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے بعض خاص محرمِ راز کو بُلایا ہے۔ اُن سے تخلیے میں وہ رُک رُک کر اپنے عشقی، حالات بیان کر رہا ہے۔ اقرار کرتا ہے کہ اب ضبط کی طاقت نہیں، پوچھتا ہے کہ ملاقات کی کیا شکل ہو؟ خاص محرم اس کو تسکین دیتا ہے۔ کچھ تدبیریں پیش کرتا ہے۔ نظیر ناآزمودہ کاری کی وجہ سے ان کے قبول کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے کوچۂ دلدار کی طرف رُخ کرتا ہے۔ وہ دوست جو کسی قدر تجربہ کار ہے، ساتھ ہوتا ہے۔ دہنے بائیں دیکھ کر کھڑکی میں در آتا ہے۔ دل کی دھڑک کے ساتھ سیڑھیوں کو طے کر کے

اُوپر پہنچتا ہے۔ جھینپتا ہوا لب فرش تک جاتا ہے۔ گھبراہٹ میں جوتی پاؤں کی اُترتے ہی منتشر ہوجاتی ہے۔ اس شاہدِ نظر فریب کو خبر ہوتی ہے۔ سو ناز سے سر نہوڑائے گردن جُھکائے آتی ہے۔ عجب ادا سے بندگی کرتی ہے۔ نظیر تھرتھراتی ہوئی آواز سے جواب دیتا ہے۔ چمکے ہوئے چہرے کے ساتھ مزاج پوچھتا ہے۔ خود شوق کو ظاہر نہیں کرسکتا۔ دوست اس کی زبان بنتا ہے۔ تبسّم کے ساتھ کچھ دبی زبان سے کلمات انکسار بیان ہوتے ہیں۔ "میں کس لائق ہوں آپ لوگ مجنون کے جھروکے سے دیکھتے ہیں"۔ شکریہ ادا ہوتا ہے۔ "میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ غریب خانے پر تشریف لائے"۔ حُقّے کی دعوت ہوتی ہے۔ چلتے وقت عطر اور پان دیا جاتا ہے۔ عاشق کچھ پیش کش کرنا چاہتا ہے۔ قبول نہیں ہوتا۔ وعدہ لیا جاتا ہے کہ "پھر تشریف لائیے گا۔ بھُول نہ جایئے گا"۔ مکتب عشق میں یہ نظیر کی بسم اللہ تھی۔ چونکہ ذہین تھا اور فنِ عشق سے ازلی مناسبت لے کر آیا تھا، تھوڑے ہی دنوں اس فن میں بھی ایسی ترقی کی کہ بڑے بڑے استاد اس کا لوہا ماننے لگے۔ شاہدوں میں اس کی بڑی قدر تھی۔ ان کے نکات حُسن اس پر جیسے کھُلے تھے، مشکل ہے کہ دوسروں پر کھلیں۔ ہر ایک نکتہ کی پہنچ کر داد دیتا تھا اور کان کے رستے سے ان کے دِلوں میں سماجاتا تھا۔ پھر شعروسخن کی چاٹ الگ تھی، ظرافت کی چاشنی جدا۔ اس کے آتے ہی حسین چہروں پر مارے شگفتگی کے تازہ گلاب کھِل جاتے تھے۔ گُل کی طرح جاموں میں پھُولی نہیں سماتی تھیں۔

میں نے بڑی تلاش سے نظیر کی ایک معشوقہ کا پتہ لگایا ہے۔ نام اس کا موتی ہے۔ گو نظیر نے صاف اس کی رنگت نہیں بتائی۔ اس کا قدوقامت نہیں دکھایا۔ لیکن اس کا کوئی بناؤ اس نے ہم سے نہیں چھپایا۔ وہ ہنستی ہے تو روکتا نہیں باتیں کرتی ہے تو ٹوکتا نہیں۔ پان کھاتی ہے تو کھانے دیتا ہے۔ مسی لگاتی ہے تو لگانے دیتا ہے۔ گلا کھول کھول کر دکھاتا ہے کہ موتیا کے ہار کس قدر زیب دیتے ہیں۔ بازو اور کلائی کھول کھول کر دکھاتا ہے کہ بازو بند اور گجرے کس قدر موزوں ہے۔ ایک ایک زیور کا حُسن دکھاتا ہے اور داد لیتا ہے۔ زیوروں کی خوشنما جھنکار اور زمزمہ سُنانے کو وہ اس شاہد رعنا کو ناز سے دو چار قدم چلنے کی بھی اجازت دیتا ہے۔ چہرے پر پسینے

کی بوندوں کی بہار دکھانے کو کبھی وہ اس سے بال بال میں موتی بھی گندھواتا ہے اور کسی معشوقہ سے، قطع نظر کی جائے تو کی جائے، مگر اس سے قطع نظر ممکن نہیں نظیر نے اس کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

رہے ہیں اب تو پاس اس شوخ کے شام و سحر موتی   جبیں پر موتی، اور سر میں ہیں موتی، مانگ پر موتی
اِدھر جگنو، اُدھر کچھ بالیوں میں جلوہ گر موتی   بھرے ہیں اس پری میں اب تو یار و سر بسر موتی
گلے میں، کان میں، نتھ میں، جدھر دیکھو اُدھر موتی

کوئی اس چاند سے ماتھے کے ٹیکے میں اُچھلتا ہے   کوئی بُندوں سے مل کر کان کے نرموں میں ہلتا ہے
لپٹ کر دھکدھکی میں کوئی سینے پر مچلتا ہے   کوئی جُھمکوں میں جُھولے ہے، کوئی بالی میں ہلتا ہے
یہ کچھ لذت ہے جب اپنا چھداتے ہیں جگر موتی

کبھی وہ نازنیں ہنس کر جو کچھ باتیں بناتی ہے   تو اک بات میں موتی کو پانی میں بہاتی ہے
ادا و ناز میں چنچل عجب عالم دکھاتی ہے   وہ سُمرن موتیوں کی اُنگلیوں میں جب پھراتی ہے
تو صدقے اس کے ہوتے ہیں پڑے ہر پور پر موتی

غلط ہے اس لبِ رنگیں کو برگِ گُل سے کیا نسبت   کہ جن کی ہے عقیق اور پنے اور یاقوت کو حسرت
اُداہٹ کچھ مسی کی، اور اس پر پان کی رنگت   وہ ہنستے ہیں تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت
اِدھر لعل اور اُدھر نیلم، اِدھر مرجاں اُدھر موتی

کبھی جو بال بال اپنے میں وہ موتی پروتی ہے   نزاکت سے عرق کی بُوند بھی مُکھڑے کو دھوتی ہے
بدن بھی موتی، اور سر پاؤں سے پہنے بھی ہوتی ہے   سراپا موتیوں کا پھر تو اک گُچھا وہ ہوتی ہے
کہ کچھ وہ خشک موتی، کچھ پسینے کے وہ تر موتی

گلے میں اس کے جس دم موتیا کے ہار ہوتے ہیں   چمن کے گُل سب اس کے وصف میں موتی پروتے ہیں
نہ تنہا رشک سے قطرات شبنم دل میں روتے ہیں   فلک پر دیکھ کر تارے بھی اپنا ہوش کھوتے ہیں
پہن کر جس گھڑی بیٹھے ہے وہ رشکِ قمر موتی

لہ قدملنے ہلنا بہ فتح ہا بھی باندھا ہے چنانچہ میر نے اپنے شکارنامے میں لکھا ہے:۔

لگی گولی پڑنے نہ پھر چسل سکا   نہ جا گہہ سے اُکسا، نہ ٹک ہل سکا۔ (دیگر)
کیوں گردن ہلال ابھی سے ڈھلک چلی   ابرو تو اک طرف، پلک اس کی نہیں ہلی (سودا)
ممکن نہ تیر خوردہ تڑپ کر سنبھل سکے   مارا تری نگہ کا جگہ سے نہ ہل سکے (ش)

وہ زیور موتیوں کا، واہ! اور کچھ تن وہ موتی سا   پھر اس پر موتیا کے ہار، بازوبند، اور گجرا
سراپا زیب و زینت میں وہ عالم دیکھ کر اس کا   جو کہتا ہوں "ارے ظالم، ٹک اپنا نام تو بتلا"
تو ہنس کر مجھ سے یوں کہتی ہے وہ جادو نظر "موتی"

کڑے پازیب توڑے[1] جس گھڑی آپس میں لڑتے ہیں   تو ہر جھنکار میں کس کس طرح باہم جھگڑتے ہیں
کسی دل سے بگڑتے ہیں، کسی کے جی پہ اڑتے ہیں   کڑے سونے کے کیا، موتی بھی اس کے پاؤں پڑتے ہیں
اگر باور نہ ہو دیکھو ہیں اس کے کفش پر موتی

خفا ہو ان دنوں کچھ روٹھ بیٹھی ہے جو ہم سے وہ   تو اس کے غم میں جو ہم پر گزرتا ہے سو مت پوچھو
چلے آتے ہیں آنسو، دل پڑا ہے ہجر میں غش ہو   وہ دریا موتیوں کا ہم سے روٹھا ہو تو پھر یارو،
بھلا کیونکر نہ برساوے ہماری چشم تر موتی

شفق میں اتفاقاً جیسے سورج ڈوب کر نکلے   دیا ابر گلابی میں کہیں بجلی چمک جاوے
بیاں ہو کس طرح سے آہ! اس عالم کو کیا کہیے   تبسم کی جھلک میں یوں جھمک جاتے ہیں دانت اس کے
کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی

ہمیں کیونکر پری زادوں سے بوسوں کے نہ ہوں لہنے   جڑاؤ موتیوں کے اس غزل پر وار دیے گہنے
سخن کی کچھ جو اس کے دل میں ہے الفت لگی رہنے   نظیر اس ریختے کو سن وہ چنچلس کر یوں لگی کہنے
"اگر ہوتے تو میں دیتی تجھے اک تھال بھر موتی"

اس کا تجویز کرنا مشکل ہے کہ گویہ شخص کاجل کی کوٹھری میں لباس دامن دار پہن کر مدتوں جایا کیا مگر ساتھ اس کے اس کا دامن، اس کی آستین دھبوں سے پاک رہی۔ خود اس کے زمانے میں لوگوں کی اس کی نسبت مختلف رائیں تھیں۔ بُرے لوگ جن سے زمانہ بھرا پڑا ہے، اس کو یقیناً ایک چھٹا ہوا شہدا جانتے تھے۔ اس کے شاہدان بازاری کے ہاں زیادہ آنے جانے کی تاویل سوا اس کے ان کے ذہن میں کوئی تھی ہی نہیں کہ وہ ان سے ناپاک تعلقات رکھتا تھا۔ لیکن جن کو اس کے ساتھ خصوصیت تھی، اس کے دن رات کے جلیس تھے، وہ دیکھتے تھے کہ وہ ایک خاص حد سے زیادہ کسی شوخ رنگیں ادا سے مخاطبت نہیں کرتا ان کو تعجب بھی ہوتا تھا

---

[1] توڑا = زنجیر گلو خواہ پا جو بطور زیور اکثر عورتیں پہنا کرتی ہیں۔ (ش)

تھا کہ باوجود طرفِ ثانی کے التفاتِ زاید کے یہ سبقتِ زاید کیوں نہیں کرتا۔ بعض دفعہ اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "تم پر عورتیں مرتی ہیں اور تم کو کچھ التفات نہیں کاش ہم کو یہ موقع ملتا تو پھر تم دیکھتے کہ کیا بہار ہوتی۔" وہ اس قسم کی باتوں پر مُسکرا دیتا۔ احباب اس کے دیکھتے کہ بعض دِلرُباؤں کے ساتھ اس کو خاص شیفتگی ہے۔ اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کو وہ حد سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ ان کی صحبت میں ہر موقعہ فُرصت پر بیٹھا ملتا ہے۔ تخلیے کی صحبتیں بھی ان سے رہتی ہیں۔ اختلاط کی پینگیں بھی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ چٹکی کر رہا ہے۔ انگلیاں چٹخا رہا ہے۔ سر میں تیل ڈال رہا ہے۔ تلوا سہلا رہا ہے۔ ہتھیلی کو نرم نرم انگلیوں سے دبا رہا ہے۔ مگر کسی موقعہ عام پر ان کو دیکھ کر اس کی آنکھیں نہیں جھپکتیں۔ وہ ہر ایک موقعہ پر ان سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر نہایت کشادہ پیشانی سے باتیں کر سکتا ہے۔ تاڑنے والے اپنے فن کے قواعد کی رُو سے اس کو عشقی محکمے میں مجرم قرار دے نہیں سکتے، گو بدگمانی کبھی کبھی یوں ہی کچھ کانوں میں پھُونک دیتی ہے۔

نظیر کے بعض رندانہ کلام سے لوگ ایسا استنباط کر سکتے ہیں کہ وہ شاید عشق کی انتہائی ذلیل اور ناپاک حالت تک پہنچا ہو۔ چنانچہ اس کی اس غزل کے پڑھنے پر جس کا مطلع یہ ہے:۔

دیکھ کر کُرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی — دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

تھوڑی دیر کے لیے مجھ کو بھی ایسا شبہ پیدا ہوا تھا۔ غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل نظیر نے کسی دوست کی فرمائش سے عالمِ جوانی میں لکھی تھی۔ اس دوست کو کسی رنگین لباس شاید بازاری سے کسی خاص زمانے میں تعلق تھا اور تعلق انتہا سے بے تکلفی کو پہنچ کر بعض مبارک امراض کا بھی موجب ہوا تھا۔ مزاج تو ان کافروں کے نہایت نازک ہوتے ہیں۔ کسی دن کسی چیز کی فرمائش کی۔ وہ چیز تو بھیجی گئی مگر جس عورت کے ہاتھ بھیجی گئی وہ کوئی نہایت چالاک اور عیّار ماما تھی، رستے میں کھا گئی، اور وہاں جا کر کچھ جھوٹ سچ بنا دی۔ تحقیق کی فرصت کس کو، اور ہو بھی تو اتنی تاب کہاں؟ بگڑ کر فوراً منع کر دیا کہ "فلاں شخص ہماری ڈیوڑھی میں قدم رکھنے نہ پائے ورنہ ہم سے کوئی بُرا نہیں۔"

نظیر کے ہاں دوڑے ہوئے پہنچے "یار غضب ہوا۔ وہ کٹی تحفہ لینے آئی تھی وعدہ کر کے آؤں اور نہ بھیجوں، یہ کیوں کر ہو سکتا تھا مگر نہیں معلوم اس کمبخت نے کیا کیا کہ ان کو نہیں ملا۔ اب وہ بگڑی ہوئی ہیں۔ کوئی تدبیر ایسی کرو کہ ان کی رنجش مٹے۔" نظیر نے قلم اٹھایا اور فوراً ایک شوخ غزل لکھ دی۔ نظیر کے تخلص نے اثر مطلوب کی ضمانت کی۔

ممکن ہے کہ اس غزل کو خود نظیر کے سر مڑھا جائے، لیکن انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ اپنے عیوب کو اس اعلان کے ساتھ بیان کرے۔ اگر کسی شخص کو کوئی مرض ہو بھی تو اس آزادی کے ساتھ اس کو بیان نہیں کر سکتا۔

اور تو کیا ہے مگر ہلکے سے اک سوزاک کی ہے ہمارے پاس بھی اب تک نشانی آپ کی

علاوہ بریں ہم اس کے تمام کلام میں ایک خاص اخلاقی اثر پاتے ہیں جو صاف بتاتا ہے کہ وہ ایک پاک اور صاف اور گہرے سرچشمے سے آیا ہے۔ جزئیات میں گو اس کے رندوں کا گہرا تجربہ شامل ہے لیکن اس کے اور اخلاقی خیالات کی قوت اور گہرائی اس امر کا تصور بھی نہیں کرنے دیتی کہ وہ تجربے اس کے ذاتی ہیں۔

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ ہے زمین ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ رہتے ہیں دُنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

وہ بزم عیش میں ایک مقام پر لکھتا ہے کہ "ایک دل فریب شوخ میرے ہاں آئی، میں نے اس کی طرف خطاب کر کے یہ شعر پڑھا ۔

کرم کر دن باحوال غریباں زدل داراں زدل داری تواں گفت

تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کی آستین پکڑی۔

اس نے کہا۔ "اب میرا ٹھہرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا۔ "میرا تو جی چاہتا ہے۔"

اس نے کہا۔ "اگر تمہارا یہ جی چاہے کہ بوسہ لوں۔"

میں نے کہا۔ "میں تو پارسا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "اگر تم رند ہو جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تک تو ہوا نہیں۔" "آئندہ کی خدا جانے۔"

اس نے کہا۔ "تمھاری نظر سے تو رندی اب بہت قریب ہے"۔
وہ تو چلی گئی مگر میں اس خیال پر بہت دنوں تک ہنستا رہا۔

نظیر کی میلے ٹھیلوں میں شرکت

نظیر جس مزاج کا آدمی تھا وہ کبھی اپنے آپ کو میلے ٹھیلوں سے الگ رکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ انسانی حالات اور خیالات سے حکمت اور عقل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ انسانی تھیٹر کا ایک دُور اندیش اور صاحبِ نظر تماشائی تھا۔ وہ ڈراپ سین کے اُٹھنے پر اپنی آنکھیں کسی طرح بند رکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ رغبت اور نفرت رشک اور حسد عشق و محبّت کے معاملات سے تفصیلاً واقف ہونا چاہتا تھا۔ بچّوں کی معصومانہ خوشی، اور ان کی معصومانہ طلب اور خواہش، بوڑھوں کی متانت اور سنجیدگی اور قدرتی قناعت، عورتوں کا غرورِ حسن، اور شوقِ نمائش، جوانوں کا اکڑ بل، سب اس کو اپنی طرف مشغول کر لیتے ہیں۔ تیراکی کا میلہ ہو، کنکوّے کا میلہ ہو، کبوتر بازی کا میلہ ہو، دیوالی ہو، ہولی ہو، بلدیو جی کا میلہ ہو، کوئی تقریب ہو، کسی طرح کا تہوار ہو، سب میں اس کو جانا اور پوری طرح عاقلانہ لُطف اُٹھانا۔

میں دیکھتا ہوں کہ وہ ایک دفعہ خود برج جاکر ہولی کی سیر دیکھ رہا ہے:۔

یہ سیر ہولی کی ہم نے تو برج میں دیکھی   کہیں نہ ہوئے گی اس لُطف کی میاں ہولی
کوئی تو ڈوبا ہے دامن سے لے کے تا چولی   کوئی تو مُرلی بجاتا ہے کہ "کنہیا جی"
ہے دُھوم دھام یہ بے اختیار ہولی میں

گھروں سے سانوری اور گوریاں نکل چلیاں   کُسنبھی اوڑھنی، اور مست کرتی اچپلیاں
جدھر کو دیکھیں اُدھر مچ رہی ہیں رنگ رلیاں[1]   تمام برج کی پریوں سے بھر رہیں گلیاں
مزا ہے، سیر ہے، در ہر کنار ہولی میں

---

[1] رنگ رلیاں۔ کھیل تماشہ، ہنسی، چہل، مذاق، ٹھٹھا، ٹھٹھول، عیش و نشاط، عیش و عشرت، مزہ، لُطف۔

خون سے پھر ان کی رنگیں ہم نے گلیاں دیکھیاں
رنگ محلوں میں جنھوں نے رنگ رلیاں دیکھیاں   (ظفر) ش

جو کچھ کھاتی ہے ابلا[1] بہت پیا یاری — چلی ہے اپنے پیا پاس لے کے پچکاری
گلال دیکھ کے پھر چھاتی کھول دی ساری — پیا کی چھاتی سے لگ گئی وہ چاؤ کی ماری
نہ تاب دل کو رہی، نہ قرار ہولی میں

جو کوئی سیانی ہے ان میں، تو کوئی ہے ناکند — وہ شور بور تھیں الف سب رنگ سے نپٹ یک چند
کوئی دلاتی ہے ساتھن[2] کو یار کی سوگند — کہ "اب تو جامہ و انگیا کے ٹوٹے ہیں سب بند
پھر آکے کھیلیں گے ہو کر دوچار ہولی میں

آگرے کی ہولی یوں دیکھتے ہیں :-

ایک لونڈا خوش رُو جس کے چہرے پر گلاب کی پتیاں کھلی ہوئی ہیں، سب سے آگے ہے، اور سینکڑوں لونڈے پیچھے ہیں۔ جتنے ہیں سب کا کپڑا چھڑکواں رنگا ہے۔ یہ گل رخوں کا غول آگے ہے۔ بینوا بھی ہیں۔ پھر ان کے پیچھے عاشقوں کا غول ہے۔ یہ بھی ہزاروں ہیں عیش و تفریح کے رنگ میں سب ڈوبے ہوئے ہیں خوشی کی بہاریں دکھاتے چلے جارہے ہیں۔ میاں نظیر بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ پہلے گوکل پورے پہنچے، پھر نائی کی منڈی اور سیدخاں کی منڈی سے گزرتے ہوئے عالم گنج پہنچے، وہاں سے شاہ گنج پہنچے، پھر تاج گنج آئے۔ پھر کناری بازار میں رونق افروز ہوئے۔ وہاں سے موتی کٹرے آئے، پھر پیپل منڈی اور پنی گلی پہنچے، غرض تمام شہر کا چکر لگا آئے۔

میاں نظیر فرماتے ہیں کہ "چوک، چارسو جہاں گئے ہر جگہ اس قدر بھیڑ پائی کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی اور ہر طرف ایک رنگین باغ کھلا ہوا ہے۔"

بلدیوجی کا میلہ[3] :-

جاڑے کے دنوں میں آگرے کے قرب میں ہندوؤں کا یہ میلہ بڑی دھوم دھام

---

[1] ابلا۔ شاید نازک اندام (ش)

[2] ساتھن۔ ساتھ والی۔ ساتھ کی عورت۔ (ش)

[3] میرے ایک معز مخدوم مرزا محمد علی بیگ ہیں جو آگرے میں مدتوں سے وکالت کرتے ہیں اور وہیں ان کا وطن بھی ہے، اس میلے کی نسبت عبارت ذیل تحریر فرماتے ہیں۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سے ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے صوبہ بہار میں چھتر کا میلہ ہے۔ قریب قریب آگرے میں یہ بلدیوجی کا میلہ ہے۔ بلدیوجی کا جہاں مندر ہے وہاں سے دو دو کوس تک باغ اور جنگل سب لوگوں سے بھر جاتے ہیں۔ ہزاروں بساطی اپنی سوداگری کی بساط بچھائے گہنے اور مالا بیچ رہے ہیں۔

اتنے لوگوں کے ٹھٹھ لگے ہیں آ　　جو کر تل دھرنے کی نہیں ہے جا
لے کے مندر سے دو دو کوس لگا　　باغ و بن بھر رہے ہیں سب ہر جا
لاکھوں بکتے ہیں گہنے اور مالا

ہزاروں جھلملی دکانیں لگ رہی ہیں۔ موتی، مونگا خریدنا چاہیے، اس کی بھی کمی نہیں آئینہ کنگھی لینا چاہیے، اس کی بھی افراط ہے۔ حلوائی ایک طرف پڑے، لڈو جلیبی اور گٹے بیچ رہے ہیں۔ کھنک، گولے، نارنگی، سنگترے کی بہاریں دکھا رہے ہیں۔ کہیں مٹی اور کاٹھ کے کھلونے بک رہے ہیں۔ کہیں کا چمن ڈھیٹی پیر چنوا رہا ہے۔

لاکھوں بیٹھے بساطی اور منہار　　اپنا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی، بنگڑی[1] کی اک طرف جھنکار　　ٹوگری، پوتھ، انگوٹھی، چھلے، ہار
سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں　　پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
عیش عشرت کی لٹ رہیں دھڑیاں[2]　　دال موٹھیں، منگوچھی، اور بڑیاں
ہر طرف کھل رہے گل و ریحاں　　ہار، بدھی، مٹھائی اور پکواں
باجے انواع طرح کے بج رہے ہیں:۔

(ص ۸۵ سے آگے)

"میلۂ بلدیوجی از ایں شہر بفاصلہ تخمیناً ہشت فرسخ مے شود۔ قصبہ بکو چکے بایں نام در ضلع متھرا ہندو ہائے مجدے آنجا ساختہ اند۔ ایں معبد بسیار قدیم است نمی دانم کہ مے شود مگر ہر سال یک مرتبہ مے شود۔" ش

[1] بنگڑی۔ ایک قسم کی کانچ کی بل دار چوڑی　ش

[2] دھڑی پنسیری۔ دھڑیوں بافراط بکثرت پوری طرح سے　ش

اٹھائے لطف بٹھلا کر اسے گھڑیوں مزے لوٹے
مسی مالیدہ لب کے ہم نے بھی دھڑیوں مزے لوٹے　(نکہت)

اک طرف نوبتیں جھنگاریں[1] ہیں　　جھانجھ، مردنگ، راس دھاریں ہیں
جھانجھ، مردنگ، دف بجاتے ہیں　　راس منڈل بھجن سناتے ہیں

دُور دُور سے راجا، رجواڑے آتے ہیں۔ پالکی، ہاتھی، گھوڑے، رتھ بک رہے ہیں۔ مول تول ہو رہا ہے۔ جوگی، بیراگی، گیانی، دھیانی ہر قسم کی خلقت کا ہجوم ہے۔

میاں نظیر مولویوں کے فتوے کو کیا مانیں، اور تکفیر کو کیا جانیں۔ گو ہندوؤں کا میلہ ہے مگر اپنی اصلی خوش نیتی سے عقل اور شعور سیکھنے کے لیے آگئے ہیں۔ پہلے تو وحدۃ الوجود کی عینک لگا کر ہر طرف اسی ایک معبود کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ پھر میلے کی تفصیلات پر حکیمانہ نگاہ ڈالتے ہیں لوگوں کا جوق جوق ہر طرف سے آنا، خرید و فروخت کے بازار کا گرم ہونا، مندر کی تیاری، صحن مندر کی نفاست اس کے گنبد کی رفعت، مکلّف پردوں کا دروازہ پر چھوٹا ہونا۔ گنڈیر نہان کا ہونا۔ یہ سب باتیں تو خیر ہر معمولی نگاہ دیکھ سکتی ہے۔ (مگر یہ کچھ اس سے بھی سوا دیکھ رہے ہیں جو معمولی آنکھ نہیں دیکھ سکتی) ان کی آنکھیں عبرت کے روزن سے ڈھلکو[2] کا کام کر رہی ہیں۔ لوگوں کو کیا خبر کہ ایک شاعرانہ مذاق کا ڈھلکو ہمارے ساتھ ہے۔ وہ میلے کے ہجوم سے استفادہ کرتے اپنے مختلف اغراض کے حصول میں سرگرم ہیں۔ مگر ان کے تمام افعال ان کی نوٹ بک میں درج ہو رہے ہیں

کہیں عاشق نظارے مارے ہیں　　سو نگاہوں کی جیت ہارے ہیں
کوئی ابنوہ میں رہا ہے پھسل　　کوئی دھکوں میں کر رہا مَل دَھل
کتنے کرتے ہیں جست کُود اچھل　　کتنے کہتے ہیں مو چھل چھل چھل

"رنگ ہے، روپ ہے جھیلا ہے ۔ الخ"

کوئی تو کر رہا ہے چھل بٹّے[3]　　کوئی چڑھاتا ہے کھیر کے چھٹے[4]

---

[1] جھنگار۔ نوبت کی آواز نوبت کی ٹکور۔ (ش)

[2] جاسوس (م)

[3] چھل، چھند، چلتر، پھگل، پاکھنڈ۔ بشامدلریوں کے وہ گول گول ڈھکنے جس میں گولیاں رکھ کر غائب کرتے ہیں چھل بٹے فن فریب مکر و خدع* دم اور دھوکا۔ (ش)

* خدع = فریب کرنا۔ دغا دینا۔ (م)

[4] چشایا چھٹا، چاٹ سے، ماخوذ ہے۔ اصل میں اس غذا کو کہتے ہیں جو معمولی غذا کے علاوہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہر طرف گُل بدن رنگیلے ہیں　　نُک پلک غنچہ لب سجیلے ہیں
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں　　دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
خشک، تر، نرم، سُوکھے گیلے ہیں　　ٹیڑھے، بل دار، اور نُکیلے ہیں
جوڑے بھی سُرخ سبز پیلے ہیں　　پیار اُلفت بہانے حیلے ہیں
کوئی چنچل چلے ہے ٹھُمکی چال　　کچھ وہ پتلی کمر، وہ لمبے بال
آنکھوں میں حُسن کے نشے رنگ لال　　مصری، ماکھن کے ہاتھوں اُوپر تھال
کچھ وہ پوشاک، کچھ وہ حُسن وجمال　　مالنوں کا زیادہ اُن سے کمال
ڈال دیں ہار کا گلے میں جال　　بدّھی[1] ہو کریں صاف دل کو نکال
لوٹے پڑتے گنواری اور گنوار　　جس گنواری کو چلیے دھکّا مار
گر کے دے گالی، یوں کہے ہے پُکار　　"کیسو اِٹھلا[2] چلے ہے داڑھی جار"
مٹّی اور کاٹھ کے کھلونے ڈھیر　　کوئی لیوے ہے کوئی دیوے پھیر
کوئی کُمھاری کے کر رہا ہتھ پھیر　　کوئی کاچھن کے چُن رہا ہے بیر
کوئی کنجڑن سے لڑ رہا مُنہ پھیر　　کوئی بنیے کو مارتا ہے سیر
گالی، ڈنگ، مارکوٹ سانجھ سویر　　لاٹھی پاٹھی ہے، شور وغُل اندھیر
سیکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں　　پھُول گیندوں کے ہار کی لڑیاں

(صـ 87 سے آگے)
تبدیل ذائقہ کے لیے پکایا کرتے ہیں مثلاً فرنی، کھیر، یا قوتی۔ برسمِ ہند کے مُطابق چونکہ یہ چیزیں اکثر میٹھی ہوتی ہیں، اس لیے چٹخے کا اطلاق میٹھی چیزوں پر ہونے لگا۔ چٹخے کا میٹھے کے ساتھ مل کر ایک اصطلاح خاص بن جانا یہ بھی اس کی دلیل ہے۔ چٹخے میٹھوں کا مزہ پڑنا، دونوں کی چاٹ لگنا کھٹے میٹھے کا مزہ پڑنا۔ (ش)

[1] بدّھی۔ وہ پھولوں کا ہار جو بیاہ شادی میں دولہا کے گلے اور بغلوں میں حمائل وار باہم متقاطع ڈالتے ہیں۔ یہاں بدّھی میں ایک خفیف ایہام بھی ہے۔ (ش)

[2] اِٹھلانا۔ تکلّف سے چلنا، نازو انداز سے چلنا، مٹک کر چلنا، جان کر انجان بننا (اصل میں اینٹھو اینٹھ کر چلنا)۔ (ش)

کہیں چھوٹیں انار پھلجھڑیاں　　کہیں کھلتی ہیں دل کی گل جھڑیاں
کہیں اُلفت سے انکھڑیاں لڑیاں　　کہیں بانہیں گلے میں ہیں پڑیاں
عیش و عشرت کی لُٹ رہیں دھڑیاں　　دال موٹھیں، منگوچھی اور بڑیاں
لگ رہی بھیڑ اس قدر ٹھٹھ ہو　　راہ آگے کو اور نہ پیچھے کو
جو جہاں تھا وہیں پھنسا پھردو　　جس کو کھینچے ہیں گر پڑے ہے سو
بیٹھے کہتے ہیں کھاکے دھکوں کو　　"جے مہاراج، رام رام بھجو"
اور گنور دل پکار کر ہو ہو　　اب تو لٹھ دار ہے لگانے کو
ناچ اور رنگ کے کھڑاکے ہیں　　گھنگھرو اور تال کے جھناکے ہیں
نقلیں، قصّے، کہانی سا کے[1] ہیں　　کھنڈ، دُہرے کبت کتھاکے ہیں
کہیں آغوش کے لپاکے ہیں　　کہیں بوسوں کے سوجھپاکے[2] ہیں
تھرتھری دانت پر کڑاکے ہیں　　تسپہ جاڑے کے سوجھڑاکے[3] ہیں
کوئی آکر بہانے اور مِس[4] سے　　مل رہا ہے ملا ہے دل جس سے
ہوتے ہیں آملاپ جس تس سے　　لڑ رہا ہے کوئی کہیں رِس[5] سے
کوئی کھویا گیا ہے مجلس سے　　کوئی چلائے پوچھیے کس سے
کہنی بازوں میں لگ رہے گھسے　　اور دھکا پیل اور گھماں گھسے
نازنیں ہیں و سانوری گوری　　جن کی نازک ہر اک پری پوری

---

[1] یہاں ساکے سے وہ داستانیں مراد ہیں جو کچھ ہندو ایک جگہ بیٹھ کر اپنے نامور بہادروں کے متعلق دل بہلانے کے لیے گا گا کر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً آلا اودل کی لڑائی۔ کنور بجے کے معرکے ساکے ہندوؤں میں شاھنامہ اور داستانِ عنتر اور داستانِ امیر حمزہ کے قائم مقام ہیں۔ (ش)

[2] جھپاکا۔ جلدی سے کوئی کام کرنا۔ (ش)

[3] جھڑاکا۔ جھپٹ، جھڑپ، ہلکی سی لڑائی، دو دو چونچیں، دو دو ہاتھ (ش)

[4] مِس۔ مکر، فریب، دغا۔ (ش)

[5] رِس۔ غضب، غصّہ، خفگی، ناراضی، آزردگی، ہٹ ضد، اڑ (ش)

کرکے چتون نگاہ کی ڈوری — دل کو چھینے ہیں سب برازوری[1]
دھوم ناز و ادا جھکا جھوری[2] — برج میں جیسے مچ رہی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری — چوری کیسی کہ صاف سرزوری
خلق آتی ہے سب جڑی جھٹری — چیز رکھتے ہیں باندھ کر جکڑی
کوئی دوڑے ہے ہاتھ لے لکڑی — "دوڑیو چور لے چلا گھٹڑی"
جیب[3] کترنی کہیں گئی پکڑی — کہیں ٹوٹی دکان اور ٹھہڑی[4]
چور نے تاک لی کہیں پگڑی — سو تماشے ہنسی خوشی پھکڑی

ہر چند نظیر کی نواسی نے بیان کیا کہ میاں نظیر میلے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ لیکن خود ان کی تصانیف میں شواہد اس کے خلاف میں موجود ہیں۔ ان کے قول کی توجیہ یوں ہوسکتی ہے کہ شاید بڑھاپے میں انھوں نے جانا آنا ضعیف پیری کے سبب چھوڑ دیا ہو نظیر نے ایک پوری کتاب لکھی ہے جس میں فقط انھوں نے اپنے میلوں ٹھیلوں میں شریک ہونے کا حال قلم بند کیا ہے، اور جو دلچسپ واقعات ان کو پیش آتے ہیں ان کو سیاہی کے آبِ حیات سے بقائے دوام بخشی ہے۔ اس کتاب کا نام بزمِ عیش ہے شاید آگرے سے زیادہ دوسرے شہر میں میلے بھی ہوتے ہوں۔ ہر چھوٹی سی بات پر وہاں ایک میلا ہو جایا کرتا ہے تیراکی کے میلے ہیں۔ کنکوے[5] کے میلے ہیں۔

---

[1] براجوری۔ زبردستی، دھینگا دھینگی۔ (ش)
[2] جھک جوری۔ دھینگا مشتی، چھین جھپٹ، ہاتھا پائی، توڑا مروڑی، نوچا کھسوٹی۔ (ش)
[3] جیب کترنی۔ جیب کترنے کا آلہ۔ (ش)
[4] ٹھہڑی۔ تصغیر، ہاٹ، چھوٹی سی دکان۔ (ش)
[5] کنکوے کے میلے کے متعلق میرے مخدوم مرزا محمد علی بیگ وکیل آگرہ یوں تحریر فرماتے ہیں۔
"پتنگ بازی ہر شخص در خانۂ خود می کند ہر سال بجا ہائے مختلف مردم مجتمع شدہ یک روز یا دو روز باہم پتنگ بازی کنند نام آن مجمع زر جلا می باشد در میدان مے روند و بہ تلہائے بلند بایں کار مشغول شوند"
ایک دوسرے آگرے کے دوست سے یوں معلوم ہوا۔ پتنگ کے میلے کو زر جلا کہتے ہیں۔
(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کبوتربازی کے میلے ہیں۔ پھر خدا جانے کاہے کے میلے ہیں۔

قبل اس کے کہ میں بزم عیش دیکھوں خود کلیات نظیرؔ سے اس کا پورا ثبوت ملتا تھا کہ نظیرؔ سے کوئی میلہ چھوٹتا نہ تھا۔ چاہے ہندوؤں کا ہو، چاہے مسلمانوں کا۔ بزم عیش کے دیکھنے سے اس خیال کی تصدیق ہوئی۔ آغاز کتاب میں نظیرؔ میلوں کی کثرت کو یوں لکھتے ہیں۔

اس شہر میں انواع قسم کے مجمع اور فرحت افزا میلے ہوتے ہیں ہر ایک میلے کا نام مشہور ہے اور ہر ایک کے لیے جگہ مقرر ہے۔ میلے کے دن تماشائی بکثرت جمع ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ زریں پوشاک پہن پہن کر چاندنی پر رونق افروز ہیں۔ مسندیں بچھائے بچھائے رنڈیاں کہیں تبسم سے گلزار کھلا رہی ہیں، اور کہیں ٹہل ٹہل کر سرو رواں کی بہار دکھا رہی ہیں۔ گانے بجانے والوں کا بھی ہر طرف ہجوم ہے۔ پان سے جس کا دیکھو مکھڑا لال ہے۔ ہاتھ میں پھولوں کے گجرے پڑے ہوئے ہیں۔ کہیں شراب کا دور چل رہا ہے۔ حقے چل رہے ہیں۔ سودے والے بھی اپنا بازار جمائے ہوئے ہیں۔

دسہرے[۱] کے دن کی ایک نقل یوں لکھتے ہیں۔

کہ صبح کے وقت میں جمنا کے کنارے پہنچا۔ دیکھا کہ میلہ لگا ہوا ہے۔ گوری گوری صورتوں کی بہار صبح کی صباحت سے زیادہ پیاری، اور نہانے میں ان کا پانی

(ص۹۰ سے آگے)

نرجلا تاج گنج کے روضے میں بھی ہوتی ہے۔ پیر گیلانی میں بھی ہوتی ہے۔ (پیر گیلانی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابو العلا کا مزار ہے) شہر سے کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ایک مقام ہے، جوگی بھوگی۔ وہاں بھی ہوتی ہے۔ بڑے میدان سے کوسوں تک پیچ چلے جاتے ہیں۔

[۱] دسہرہ جیٹھ کے مہینے کی دسویں تاریخ جس میں گنگا اشنان کرنے سے صاحبان ہنود کے اعتقاد کے موافق گناہ دھوئے جاتے ہیں۔ اسوج (آسن) کے مہینے کی دسویں تاریخ کا بڑا بھاری تیوہار جس میں نو روز پہلے سے پوجا وغیرہ کرتے اور اخیر دن دیوی کی مورتی ٹیسو جھانجی سانجی وغیرہ کو دریا میں ڈالتے ہیں اور چونکہ رام چندر جی نے انہی دنوں میں راون پر چڑھائی کر کے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سے بھیگا ہوا جسم شبنم سے بھیگے ہوئے پھول سے زیادہ خوش نُما۔ کنارے برہمن اپنی بساط بچھائے بیٹھے ہیں۔ اور تلک[1] کی چیزوں سے ان کی بساط رنگین ہو رہی ہے۔ رتھوں کی چھتری جگمگا رہی ہے اور زرّیں زین گھوڑوں کی پیٹھ پر چم چم کر رہے ہیں سہ

عیاں ہر جا بہار جامۂ زیباں نمایاں ناز و حُسن دل فریباں
صفِ اہلِ تماشا زینت افزا ہمہ اسبابِ خوشں وقتی مہیّا
بروئے نیل کنٹھ از یمن بہرہ زہے فرحت فزا روز دسہرہ

ایک صنم جو نہایت گورا چٹّا تھا، نہا دھو کر پیشانی پر قشقہ کھینچ کر اپنے گھر کو چلا۔ اس سے بات کرنے کے شوق میں، میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ جب میری طرف نگاہ کی تو میں نے کہا "اے دل آرام جے سیتارام"۔

مُسکرایا اور پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو۔؟"

کہا "عرضِ حال"۔

کہا "فرماؤ"۔

میں نے کہا "شری رام چندر نے لنکا فتح کی اور تمھارے سُورما حسن نے میرے دل کا گڑھ۔

بُود در زور دلِ من راون رام کردند بتاں رام کی سُوں"

پوچھا۔ "اس بات کا گواہ"۔

میں نے کہا۔ "ہنومان"۔

(صـ 91 سے آگے)
فتح پائی تھی، ان کی لیلا رچاتے اور بڑی خوشی مناتے ہیں۔ (ش)
شہباز نے ہندی مہینہ غلط لکھا ہے۔ یہ اہم تہوار آسن (کنوار) میں ہوتا ہے۔ (م)
[1] تلک۔ قشقہ ٹیکا وہ نشان جو ہندو لوگ صندل یا رولی یا سیندور وغیرہ کا لگاتے ہیں۔ رولی ایک قسم کی سُرخ اور خشک چیز، جس کا ہندو لوگ تلک لگاتے اور اسے ہلدی پھٹکری اور ترشی سے بناتے ہیں۔ لکھو (ش)

ہنسا اور گھر تک مجھ سے باتیں کرتا ہوا ساتھ گیا۔

جس راجہ کے یہاں یہ متعلق تھے اس کے یہاں بڑی دھوم سے راس[1] کا جشن ہوتا تھا، اور اکثر کچھ تو تعلقِ دربار کے سبب اور کچھ شوقِ جبلّی کے باعث ان کو اس جشن میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ایک شب میں مجمع حالی (راجہ کے یہاں کا جشن مراد ہے) میں پہنچا۔ دیکھا کہ راس کی بڑی تیاریاں ہیں۔ چاندنی سفید، نہایت بڑی، دُور تک وسعت کے ساتھ بچھی ہوئی ہے۔ لوگ عُمدہ عُمدہ پوشاک پُر تزئیں پہنے ہوئے قرینے سے بیٹھے ہیں آداب کے ساتھ گفتگو ہو رہی ہے۔ راس دھاریوں[2] کی زیب و زینت قابلِ دید۔ بوٹی بوٹی ان کی ناز سے پڑی پھڑک رہی تھی۔ چمکیلے لباس کی محبوبی بیان نہیں ہو سکتی اور جڑاؤ مکٹ کی سرپر جگمگاہٹ تحریر میں نہیں آسکتی۔ معلوم ہوتا ہے سورج کی کرنیں اس سے نکل رہی ہیں۔ پھر زہرہ جبیں سکھیاں اور ان کے زرّیں پیراہن۔ نرت راس قسم کا ہوتا تھا کہ ناگاہ ناچنے لگے اور بھجن[3] اس طور پر گایا جاتا تھا کہ ہر زبان کو ہر بھجن کی رٹ لگ جائے۔ آوازیں جادو اور ساز کے میل میں عقل و ہوش کی ترقی۔ تبکرار ہر لیلا ہماں خیال پیشینہ در آئینہ دیدہ مہیّا و باظہار ہر کر دہا ہوں تصوّرِ شانِ رادھیکا[4] و شوکت کنہیا بصدائے بانسری ادائے نند کشورن و برسم چھاک آوری نیاز گوپیان و نازِ مدن موہن — نہاگر ویدن نند لال ہر چاں کر ہر سکھی بدم سردی در بہانے کہ "میں ہم دوانی پھر دی" و عیاں شدن مدن گوپال

---

[1] راس — کھیل ناچ تماشہ جیسا شری کرشن نے گوپیوں کے ساتھ کیا تھا جسے راس لیلا بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ اب تک کاتک اور پھاگن میں راس دھاری اس کھیل کی نقل کیا کرتے ہیں۔ (ش)

[2] راس دھاری۔ وہ ناچنے والے لڑکے جو کرشن جی اور ان کی گوپیوں کے کھیل کی نقل کرتے ہیں۔ (ش)

[3] بھجن — خدا کی تعریف کے گیت۔ دیوتاؤں کی تعریف کے گیت۔ (ش)

[4] رادھا رادھکا — کرشن جی کی ایک نہایت پیاری گوپی کا نام۔ فقرۂ بھجن "رادھا کرشن بول تیرا کیا لگے گا مول"۔ (ش)

چنیں کہ ہر گوپی بخوش دل در صدائے کہ "میں ہر پاں" [۱] لیننے بوصول جھانکی [۲] معروف الطاف کنج بہاری۔ واکثرے بحصول درشن مشغول گفتن "بلہاری [۳]" و لہا فرحت امتزاج و برزبانہا "جے مہاراج"۔

چناں خوش حال گردیدم، کہ در دل نشاط و عیش و عشرت کرد منزل
برائے دیدن راس کمل نین بیایم بعد ازیں بالرّاس والعین

شاید مشکل سے کوئی شاعر مسلمان ایسا نکلے گا جس کے کلام میں اس طرح ہندوؤں کے میلوں اور تقریبوں کی بلا تعصب آزادی اور نیک نیتی کے ساتھ تعریف ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظیر کتنا بڑا غیر متعصب آدمی تھا۔ اور نہ صرف یہی، بلکہ یہ بھی کہ ان کو شاعری کا مفہوم کس قدر صحیح معلوم تھا۔ شاعر اگر مذہبی تعصبات کو دخل دے تو گویا وہ اپنے فن کے پہلے اصول سے قطع نظر کرتا ہے۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ فقط کسی خاص مذہب کے لوگوں کے مرغوبات و منفورات [۴] سے واقف ہو اور فقط اسی

---

[۱] جھانکی۔ دید، نظارہ، دید بازی، لیلا، نمائش، روپ جو پردے کے اندر سے بھر کر باہر کھلتے ہیں۔ سوانگ تماشہ (ش)

[۲] بلہاری۔ قربان، تصدق، صدقہ داری، نثار (ش)

کنہیّا جی کی راس کاتک میں ہوتی ہے۔ کنہیّا جی کی راس یعنی ایک قسم کی لیلا جس میں ایک شخص کنہیّا بنتا ہے۔ سرخ لباس بریں، زریں مکٹ سر پہ، ہاتھوں میں بانسری، ایک لونڈا رادھکا بنتا ہے۔ کچھ لونڈے سکھیاں اور گوپیاں بنتی ہیں۔ کنہیّا جی نرت کرتے ہیں۔ پھر حلقہ بنا کے ہاتھ جوڑ کے ناچتے ہیں۔ اکثر کسی کو پکڑ لیتے ہیں۔ پھر کسی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سکھیوں سے رمز و کنایے کرتے ہیں۔ مردنگ اور کھنجری بج رہی ہے۔ گھنگرو جھنک رہے ہیں۔ (ش)

کشن کے مختلف نام ہیں۔ بلدیو جی، ہر، سیکشن، سیام، من ہرن، مُراری، موہن، نول کشور، بہاری سیام برن، اوتاری، کنہیا، مرلی دھر، من موہن، کنج بہاری، گوپال، منوہر، گھنشام، اُمل، بنواری، نندلال، نول گر دھاری، شنکر، مُرلیا والے، مدن متوارے، نند دُلارے۔ کشن ہندوؤں کے عقیدے میں گویا خدا ہیں۔ (ش)

[۴] منفورات۔ نفر (نفرت) کی جمع۔ (م)

ایک مذہب کے لوگوں کو خیالی تفریح بخشے، بلکہ اس کا موضوع عموماً نوعِ انسانی کی طبیعت ہے۔ عید کی تقریب کے بیان سے جو مسرّت اور تفریح، کہ کسی مسلمان کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے، وہ ہرگز کسی ہندو کے دل میں ہو نہیں سکتی۔ گو کتنے ہی عُمدہ الفاظ اور محاورات میں کیوں نہ ہو۔ (۳۱) لیے کہ اس تقریب سے ان کے کسی گزشتہ یا آئندہ مسرّت کو بہ خطِ مستقیم تعلّق نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ان کی کسی تقریب کا اگر بیان ہو تو وہی اثر بلکہ شاید بعض موقع پر اس سے زاید اثر پیدا کر سکتا ہے۔ کنہیّا جی کی راس، مہادیو جی کا بیاہ، بلدیو جی کا میلہ وغیرہ ان کا صرف نام ہی ہندوؤں کے لیے ایک طلسمِ مسرّت ہے، اس لیے کہ ان کی ہزاروں اُمنگیں اور حوصلے ان تقریبوں سے متعلق رہی ہیں اور ہیں، اور نہیں معلوم کتنے زمانے تک متعلق رہیں گی۔ پس جس صورت میں کوئی شاعر ہندوؤں کو خوش کرنا چاہے تو تھوڑی دیر کے لیے ہندو بن بیٹھے۔ وہی روزمرّے بھی استعمال کرے کہ خصوصیاتِ زبان سے بھی ایک کیفیت غیر محسوس طور پر قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ راس، مُکٹ، نرت، مکھ بلاس، برن، چندرماں، رُوپ، سروپ، ان میں سے ہر لفظ کسی نہ کسی رگِ نشاط کو حرکت میں لاتا ہے اور آہستہ آہستہ ایک اچھا زمزمہ خوشی اور خوش کیفی کا دل میں پیدا کر دیتا ہے۔ اسی بُنیاد پر نظیرؔ مواقعِ عشرتِ انسانی کے بیان میں کسی خاص مذہب کی قید نہیں رکھتا اور بلا تعصب بیان کرتا ہے کہ ہر مذہب کا آدمی اس سے متلذّذ ہو سکے۔ کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظیرؔ کے دل میں وحدۃ الوجود کا مسئلہ بڑے زور سے جما ہوا تھا اور وہ ہر شے کو مظہرِ صفاتِ الٰہی و ذاتِ باری جانتا تھا، اور ہر ذرّے میں اسی کا جلوہ ظہور مانتا تھا۔ پس مہادیو، کرشن وغیرہ اس کے نزدیک کیوں کر قابلِ نفرت ہو سکتے ہیں، جن کی ذات بہ روایت ہنود مظہرِ کرامات بھی تھی۔ نظیرؔ اصل میں کبیر گرو نانک وغیرہ کے عقیدے کا آدمی تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو افراط اور تفریط کے عالم میں جانتا تھا اور صلحِ کُل کا جُویا تھا۔ صلحِ کُل بھی اس طریقے سے کہ سب ایک ہی صانع کے بنائے ہوئے ہیں۔ آدمی آدمی سب برابر، عداوت کی وجہ کیا؟ مذہب میں جو فرق ہے وہ الفاظ کا فرق ہے۔ معنی سب کے ایک ہیں۔ ہنود جس کو اوتار کہتے ہیں مسلمان اسی کو پیغمبر کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ

نظیرؔ کو ہندوؤں کی بھی بہت صحبت رہی تھی اور ان کے علمار کے خیالات تصوف سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے کرتا وقتیکہ مدّتوں آدمی ہندوؤں میں نہ بیٹھا ہو، ان کے محاورات اس بے تکلّفی کے ساتھ باندھ نہیں سکتا اور اتنے دِل نشین حالات قلم بند نہیں کر سکتا۔

سیرِ دریا۔

دریا کی سیر میں تو ہم نے میاں نظیرؔ کو کلیات میں بھی مصروف دیکھا ہے تیراکی کا میلہ یاد ہوگا۔ قدرمتین میں بھی ایک جگہ وہ دریا کے شوق کی لہریں دکھاتے ہیں۔ وہ روز عام نہان کا تھا۔ میلہ قابلِ دید تھا۔ پیدل جانا منظور نہیں۔ سواری موجود نہیں۔ ناچار ایک دوست سے بذریعہ خط کر رتھ منگوا بھیجی۔ ان دنوں بگھی اور فٹن کا رواج نہ تھا۔ بڑے بڑے امرار رتھوں پر سوار ہوتے تھے اور رتھوں میں بڑی تیاری کی جاتی تھی۔ چاندی سونے کے کلس، مخمل کی چھتری ہزار ہزار روپے جوڑی کے گجراتی بیل۔ رقعۂ طلب یوں شروع ہوتا ہے۔

محیطِ بخشش و بذلِ استقامت ملاذ و منبعِ احسان سلامت
چو شوقِ صحبتِ رنگیں نگارم ہمانا موجِ دریا در شمارم
مگر بعد از سلامِ الفت آرا بہ نوکِ خامہ آرم مدعا را
کہ امروز از برائے غسلِ دریا جہانے حاضر و خلقے است یکجا
چنیں مجمع نہ باشد جائے دیگر بہ جوش آمد مگر دریائے دیگر
نظر نامے رسد یکسر بہار است چمن بر ساحلِ دریا نثار است
ز غسلِ مرد ماں و بازیِ آب بہر سو شوخ گرداب بے تاب
ز عکسِ گل عذاراں آبِ دریا بہ رنگِ نہر گلشن در نظرہا
بہ ساحل بس کہ میں رویاں عیانند شکارِ دامِ الفت ماہیا نند
بہ فرحت قطرہ زن ہر موجِ آب ست مے مقصود در جامِ حباب است
بہارِ حسن و آبِ بحر در جوش بہم پہلو بہ پہلو دوش بر دوش
چو بر دریا چنیں رنگیں بہارست دلم از بہر آں پر بے قرار ست

درایں صورت، نظر بر بے قراری — عطا سازند رتھ بہر سواری
چوزاں مجمع ہمہ شادند امروز — کنم من ہم دلِ خود عشرت اندوز
کہ باشد دیدنِ عالم غنیمت — اگر یک لحظہ باشد دم غنیمت
نظیر اکنوں ندارد غیر ازیں یاد — کہ باشد خانۂ الطاف آباد

بزمِ عشرت میں شرکت:-

کسی عشرت کی بزم میں ایک شوخ دل فریب کے ناچ سے میں لطف اٹھا رہا تھا اس کے کانوں کے جھمکے اس طرح سے جھوم رہے تھے کہ ہزاروں بے قراریاں دل میں پیدا ہوتی تھیں۔ اور بازو کے بانک[1] اپنی قربت کے سبب دونوں ہاتھوں سے تسلیم نیاز چاہتے تھے۔ میں نے دونوں کی تعریف یوں موزوں کی ؎

جُنبش جُھمکۂ تو مئے سازد — خاطرِ آرمیدہ را بیتاب
بانک بر بازوے تو، اے سیم تن، از حُسنِ خم
می نُماید ایں کہ من ہم بانکبازِ طرفہ ام

سُن کر وہ عورت بہت ہی خوش ہوئی۔

ہے دسہرے میں بھی یوں گو فرحت و زینت نظیر — پر دیوالی[2] بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے

دیوالی:-

درشب دیوالی کہ بہ لطف آن در و دیوار مجلی و زنگارین می شود، و ہر بام برآمدہ

---

[1] بانک۔ ایک قسم کا زیور جو ہندونیاں پاؤں میں اور مسلمانیاں بازو پر پہنتی ہیں۔ بانک فنِ سپہ گری میں سے ایک ورزش کا نام ہے۔ جسے بکیتی کہتے ہیں اور اسے کٹار نما ٹیڑھی چھریوں سے بیٹھ کر یا لیٹ کر کھیلتے ہیں۔ (ش)

[2] دیوالی ہندوؤں کا ایک مشہور تہوار جس میں لکشمی کی پوجا ہوتی اور بہت سی روشنی کی جاتی ہے۔ یہ تہوار کاتک کی پندرہ تاریخ کو ہوتا ہے۔ اس میں ہندو کثرت سے جُوا کھیلتے ہیں اور چور چوری کو نکلتے ہیں ان کے اعتقاد میں آج کی جیت سے برس روز تک جیت رہتی ہے۔ (ش)

زیبا درنگیں۔ نازنیناں بر لباس درخشاں، و اُلفت گزیناں بر کام دل شاداں در بازار بازارِ زینت، و بہر دکان۔ دکان پر رونق۔ دکان داراں مسرور و نظارگیان پر سرور۔ چراغاں صف ترصیع بستہ، و لمحات آں بسویت پیوستہ (ابیات)

زشیرینی دکان ہا زینت ارقام — عیاں سیم دگر باپستہ بادام
فراواں خوشی دلی در ہر قیاسے — نمایاں جا بجا، کھیلین بتاسے
کسے خرما[10] طلب از لطف یابی — کسے مسرورِ برفی[11] و گلابی
کسے دیوانہ تلنگنی[12] دلفریبی — کسے خوشحال از لطف جلیبی
کسے مشغول لڈو سیو مٹھری — کسے گجرے بکف، بر دوش ٹھٹھری
کسے را اسپ خواہش در تگ و تاز — کرگیرد اسپ خوش رنگ و پراز ساز
کسے را دل درین اُمیدواری — کرگیرد فیل بہ زرّیں عماری
کسے تکرار در گُڈا بہل خوشتر — کسے را بحث طوطی بہر دیگر
کسے بہرِ خیالِ طبع عالی — گرفت از شوق فانوس خیالی
برین اشیائے بازی طُرفہ و بہ — خریداران فراہم از کرو مہ
از مرطلعت ملاقاتے گردید و ہم سخنی دست داد — گفت "حسن این چراغاں چہ قدر"
گفتم "چناں کہ شمع دیان بہ مشاہدۂ آں — یا چراغ افروز مراد از دیدن ایشاں"
متبسم گردید۔

سلونو:۔

ہندوؤں کا ایک تہوار ہے سلونو۔ اس تہوار میں برہمن ہاتھوں میں راکھی

---

[10] خرما۔ چھوہارا، کھجور۔ (ش)
[11] برفی۔ بالوشاہی، ایک قسم کی مٹھائی۔ (ش)
[12] تلنگنی۔ ایک قسم کی شیرینی جو نہایت پتلی شیشے کی شکل کی بنائی جاتی ہے۔ اس میں خربوزے کے بیج، کالی مرچیں۔ کھانڈ ڈال کر قیوام پکاتے اور اس کے کوزے بنا لیتے ہیں۔ ابتدا میں بیجوں کے بجائے تل ڈالا کرتے تھے اور اسی وجہ سے اس کا نام تل انگنی رکھا تھا۔ (ش)

باندھتے پھرتے ہیں اور زرد دھان کی کونپلیں بانٹتے ہیں۔ نظیرؔ تو ہندو مسلمان سب کے ہواخواہ ہیں۔ ان کو اس تہوار سے بھی لُطف اُٹھانا ہے۔

چلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی[1] سُنہری سبز ریشم، زرد، اور گُلنار کی راکھی
بنی ہے گو کہ نادر، خوب ہر سردار کی راکھی سلونو میں عجب رنگیں ہے اس دلدار کی راکھی
نہ پہنچے ایک گُل کو یار جس گُلزار کی راکھی

عیاں ہے اب تو راکھی بھی، چمن بھی، گُل بھی، شبنم بھی جھمک جاتا ہے موتی، اور جھلک جاتا ہے ریشم بھی
تماشا ہے اہا ہا ہا! غنیمت ہے یہ عالم بھی اُٹھانا ہاتھ پیارے، واہ واہ! ٹُک دیکھ لیں ہم بھی
تمھارے موتیوں کی اور زری[2] کے تار کی راکھی

مچی ہے ہر طرف کیا کیا سلونو کی بہار اب تو ہر اک گُل رو پھرے ہے، راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو
ہوس جو دل میں گزرے ہے، کہوں کیا آہ! میں تم کو یہی آتا ہے جی میں بن کے باہمن[3] آج تو یارو
میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

ہوئی ہے زیب و زینت اور خوباں کو تو راکھی سے و لیکن تم سے اے جاں اور کچھ راکھی کے گُل پھوٗے
دیوانی بُلبلیں ہوں دیکھ گُل چُننے لگیں تنکے تمہارے ہاتھ نے مہندی نے انگشتوں نے ناخن نے
گلستاں کی، چمن کی، باغ کی، گلزار کی راکھی

ادا سے ہاتھ اُٹھنے میں گُل راکھی جو ہلتے ہیں کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ! چھلتے ہیں
کہاں نازک یہ پہنچے اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں
جو کچھ خوبی میں ہے اس شوخِ گُل رُخسار کی راکھی

---

[1] راکھی۔ ہاتھ کی رکھشا، یعنی محافظت کرنے والا۔ وہ رنگین تاگا یا ایک خاص وضع کا چمکدار کنگن جو ہندو لوگ سلونو کے تہوار پر ہاتھوں میں برہمنوں سے بندھواتے یا بہن اپنے بھائی کی کلائی میں باندھ دیتی ہے تاکہ وہ بلیات سے محفوظ و مصوّن[4] رہے۔ (ش)

[2] زری۔ سُنہری تار، سونے کے تار، چاندی کے تار جن پر سونے کا ملمع ہو۔ (ش)

[3] بامن یا باہمن۔ ہندوؤں کی نہایت افضل ذات، برہما کے ویدوں کا عالم۔ صحیح برہمن ہے۔ (ش)

[4] مصوّن۔ محفوظ اور نگہبانی کیا گیا۔ (م)

پھرتی ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حُسن کے تارے   تو اُن کی راکھیوں کو دیکھ اے جاں چاؤ کے مارے
پہن زنّار اور قشقہ لگا ماتھے اُپر بارے   نظیرؔ آیا ہے بامھن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھالو اس سے تم ہنس کر اب اس تہوار کی راکھی

بزم عیش میں فرماتے ہیں۔ سلونو عجب لُطف رکھتا ہے کہ نمک سے شکر نکالتا ہے ؎

نمایاں عالم باز ینت و شان   ز راکھی زیب ہر ساعد فراواں
ازاں راکھی کہ در دستِ بتاں است   بہارِ طُرفہ بہرِ عاشقاں است

ایک دفعہ سلونو ہی کے دن ایک برہمن کے ساتھ جس کی ہم رازی کا ٹیکا دل کی پیشانی پر اور دم سازی کا زنّار خاطر کے کندھے پر رکھتا تھا، ایک صنم کے گھر گیا جب راکھی کی بہار اس کے ہاتھ میں دیکھی تو یہ شعر پڑھا ؎

راکھی اگرچہ باہمگی سازے کند   لیکن بحسنِ دستِ بتاں نازمی کند

ہنسا اور کہا مصر تو راکھی باندھنے کے لیے آئے تم کس لیے آئے؟
میں نے کہا "دل باندھنے کے لیے" بہت ہنسا۔

بسنت[1] :-

بسنت کا زمانہ بھی عجب جوشش انگیز زمانہ ہوتا ہے۔ آفتاب دکن کے سفر سے پھر مہربانی کے سامان کے ساتھ پلٹتا ہے نباتات وحیوانات میں تازہ زندگی آتی ہے۔ شاخوں پر سبز ہری ہری کونپلیں نمودار ہوتی ہیں۔ ٹہنیوں پر چڑیوں کے طلسم انگیز نغمے سُنائی دیتے ہیں۔ دلوں میں اُمنگ زور کرتی ہے اور خوشی اور عیش کے فوّارے کو خوشنما طور پر اُچھالتی ہے۔ نیچر کا بہار راگ غم اور کلفت اداس بن میں اس سرے سے اس سرے تک آگ لگاتا ہے۔ فطرتی شاعر خیال کی شاخ پر بیٹھ کر کوئل سے زیادہ مست ہوتا ہے اور پپیہے سے زیادہ دل آویز اور طلسم انگیز تانیں سُناتا ہے۔

---

[1] بسنت ہندی رُتوں میں سے ایک رُت کا نام ہے جو چیت سے بیساکھ تک رہتی ہے۔ موسم بہار۔ وسط مارچ سے آخر مئی تک کا موسم۔ وہ میلہ جو موسم بہار میں بزرگوں کے مزار اور دیبی دیوتاؤں کے استھانوں پر سرسوں کے پھول چڑھا کر کرتے ہیں۔ (ش)

بسنت کا زمانہ آگیا ہے۔ گلابی جاڑا پڑتا ہے۔ اعتدال کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ طبیعتیں جو سردی کے اثر سے ڈوبی ہوئی تھیں آہستہ آہستہ ابھرنے لگی ہیں۔ قدرتی جوش ترنم کا ہر سر میں ہو رہا ہے۔ وہ دیکھیے میاں نظیر بیٹھے گنگنا رہے ہیں۔ کچھ آزادوں[1] کا سا لہجہ معلوم ہوتا ہے مگر راہ اچھی ہے۔

جب پھول کا سرسوں کے ہوا آکے کھلنتا ۔۔۔ اور عیش کی نظروں سے نگاہوں کا لڑنتا
ہم نے بھی دل اپنے کے تئیں کرکے بجنتا ۔۔۔ اور ہنس کے کہا یار سے "اے لکڑ بھونتا[2]"
سب کی تو بسنتیں ہیں یہ یاروں کا بسنتا

ایک پھول کا گیندوں کے منگایا رسے بجرا[3] ۔۔۔ دس من کا لیا یار گندھا ہاتھ کا گجرا
جب آنکھ سے سورج کی ڈھلا رات کا کجرا[4] ۔۔۔ جا یار سے مل کر یہ کہا "اے مرے رجرا[5]"
سب ـــــ الخ

تھے اپنے گلے میں تو کئی من کے پڑے ہار ۔۔۔ اور یار کے گجرے بھی تھے اک دھوں[6] کی مقدار
آنکھوں میں نشے مئے کے ابلتے تھے دھوا دھار ۔۔۔ جو سامنے آتا تھا یہی کہتے تھے للکار
سب ـــــ الخ

---

1. آزادوں ـــ یہ لفظ شہباز نے متعدد جگہوں پر استعمال کیا ہے۔ دیکھو صفحات 100، 211، 212، 243، 311۔ ان کی مراد ان افراد سے ہے جو سماجی یا ادبی ضوابط و اقدار سے بے نیاز و لاپروا ہوں۔ (م) تصحیف ـــ حروف کو الٹ پلٹ کر دینا۔ (م)
2. بھونتا اس لفظ کی کوئی تحقیق نہ ہو سکی۔ دونوں نسخوں میں لکڑ بھونتا لکھا ہے۔ آزادوں کے لہجے میں لڑکے کو لکڑا اور لکڑے کو بہ تخفیف لکڑ کر لیا ہو تو تعجب نہیں اور بھونتا دل کو بھاونے والا۔ اے لکڑ بھونتا۔ یعنی اے خوش ادا لکڑے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اکڑ بھونتا ہو اور انقلاب تصحیف سے موجود قالب میں در آیا ہو۔ اکڑ بھونتا اکڑ بھوں یا اکڑ فوں کا آزادانہ لہجہ۔ (ش)
3. بجرا ـــ بجرا ایک بڑی قسم کی گول اور خوشنما کشتی جس میں امیر لوگ بیٹھ کر سیر کرتے ہیں۔ (ش)
4. کجرا ـــ کاجل کا آزادانہ لہجہ۔ (ش)
5. رجرا ـــ راج کی تصغیر آزادوں کی گرامر کے مطابق۔ (ش)
6. دھوں ـــ ایک بیس سیر کا وزن، آدھا من صحیح ادھون ہے۔ دھیلے کی طرح الف (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پگڑی میں ہماری تھے جو گیندلوں کے کئی پیڑ — ہر جھونک میں لگتی تھی بسنتوں کے تئیں اپڑ
ساقی نے بھی مٹکے سے دیا مُنہ کے تئیں بیڑ — ہر بات میں ہوتی تھی اسی بات کی اُچھیڑ

سب ـــــ الخ

پھر راگ بسنتی[1] کا ہوا آن کے کھٹکا — دھوسے[2] کے برابر وہ لگا باجنے[3] مٹکا
دل کھیت میں سرسوں میں ہر اک پھول سے اٹکا — ہر بات میں ہوتا تھا اسی بات کا لٹکا

"سب ـــــ الخ"

جب کھیت پہ سرسوں کے دیا جا کے قدم گاڑ — سب کھیت اُٹھا سر کے اُپر رکھ لیا جھجھاڑ
محبوب رنگیلوں کی بھی اک ساتھ لگی جھاڑ[4] — ہر جھاڑ سے سرسوں کے بھی کہتی تھی یہی جھاڑ

سب ـــــ الخ

خوش بیٹھے ہیں سب شاہ وزیر آج آہاہا! — دل شاد ہیں ادنا و فقیر آج آہاہا!
بُلبُل کی نکلتی ہے صفیر آج آہاہا! — کہتا یہی پھرتا ہے نظیر آج آہاہا!

"سب کی تو بسنتیں ہیں پہ یاروں کا بسنتا"

اب جوش کسی قدر اعتدال آیا تو پھر یوں گاتے ہیں :-

نکلے ہو کس بہار سے تم زرد پوش ہو — جس کی نوید پہنچی ہے رنگ بسنت کو
دی برہیں اب لباسِ بسنتی کو جیسے جا — ایسے ہی تم ہمارے بھی سینے سے آلگو
گر ہم نشے میں بوسہ کہیں دو تو لطف سے — تم پاس مُنہ کو لا کے یہ ہنس کر کہو کہ "لو"
بیٹھو چمن میں نرگس و صد برگ کی طرف — نظارہ کر کے عیش و مسرّت کی داد دو
سُن کر بسنت مطرب زرّیں لباس سے — بھر بھر کے جام پھر مئے گُل رنگ کے پیو

(صـــ 101 سے آگے)
یہاں بھی تخفیف میں آیا۔ (ش)

[1] بسنت ـ سری راگ کی چوتھی راگنی۔ (ش)
[2] دھوسا ـ دمامہ بڑا نقارہ ہے۔ (ش)
[3] باجنے ـ بجنے کا لہجہ آزادانہ۔ (ش)
[4] جھاڑ ـ تار یلسلہ انقطار تسلسل۔ (ش)

کچھ قمریوں کے نغمے کو دو سامعے میں رکھ   کچھ بلبلوں کا زمزمۂ دل کشا سنو
مطلب ہے یہ نظیرؔ کا یوں دیکھ کر بسنت
ہو تم بھی شاد دل کو ہمارے بھی خوش کرو۔

ایک یار سے تو یوں مزے مزے کی باتیں ہوئیں اب دوسرے صنم تشریف لاتے ہیں۔

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دل کشائی   ہنس کر کہا یہ ہم نے[1] اے جاں بسنت آئی
سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر   پوشاک زر فشانی اپنی وہیں رنگائی
جب رنگی آئی اس کی پوشاک پر نزاکت   سرسوں کی شاخ پُر گل پھر جلد اک منگائی
اک پنکھڑی اٹھا کر نازک سی انگلیوں میں   رنگت کو اس کی اپنی پوشاک سے ملائی
جس دم کیا مقابل کسوت سے اپنی اس کو   دیکھا تو اس کی رنگت اس پر ہوئی سوائی
پھر تو بصد مسرت اور سو نزاکتوں سے   نازک بدن پر اپنے پوشاک وہ کھپائی
چمپے کا عطر مل کر موتیے سے پھر خوشی ہو   سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی
بن ٹھن کے اس طرح سے پھر راہ لی چمن کی   دیکھی بہار گلشن بہر طرب فزائی
جس جس روش کے اوپر جا کر ہوا نمایاں   کس کس روش سے اپنی آن و ادا دکھائی
کیا کیا بیاں ہو جیسے چمکی چمن چمن میں   وہ زرد پوشی اس کی وہ طرز دل رُبائی
صد برگ نے صفت کی نرگس نے بے تامل   لکھنے کو وصف اس کا اپنی قلم اٹھائی
پھر صحن میں چمن کے آیا بحسن و خوبی   اور طرفہ تر بسنتی اک انجمن بنائی
اس انجمن میں بیٹھا جب ناز و تمکنت سے   گلدستہ اس کے آگے ہنس ہنس بسنت لائی
کی مطربوں نے خوش خوش آغازِ نغمہ سازی   ساقی نے جام زریں بھر بھر کے مے پلائی

دیکھ اس کو اور وہ محفل اس کی نظیرؔ ہر دم
کیا کیا بسنت آ کر اس وقت جگمگائی

---

[1] تانیث فعل با وجود اظہارِ علامت مفعول اور اساتذہ کے کلام میں بھی ہے۔ مرزا رفیع سوداؔ فرماتے ہیں۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

دوسرا راگ سُنیے ایک یار کی ڈیوڑھی پر جا کر گا رہے ہیں۔

جوشِ نشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا   ہے طُرفہ روزگار طرب زا بسنت کا
باغوں میں لُطف نشو و نما کی ہیں کثرتیں   بزموں میں نغمہ خوش دلی افزا بسنت کا
پھرتے ہیں کر لباس بسنتی وہ دلبراں   ہے جن سے زر نگار سراپا بسنت کا
جا در پہ یار کے یہ کہا ہم نے صبحدم: "اے جاں ہے اب تو ہر کہیں ہر جا بسنت کا
تشریف تم نہ لائے جو ہو کر بسنتی پوش   کیسے گناہ ہم نے کیا کیا بسنت کا
سُنتے ہی اس بہار سے نکلا کر جس کے تئیں   دل دیکھتے ہی ہو گیا شیدا بسنت کا

اپنا وہ خوش لباس بسنتی دکھا نظیر
چمکایا حُسن یار نے کیا کیا بسنت کا

یہ تو ہندی راگنیاں ہوئیں اب بعض عجمی مقام سُنیے :۔

زہے بسنت کہ آغازِ سرمایۂ بہار ست و شروعِ پیرایہ برگ و بار۔ بُلبل بہوائے بوسہ پائے گُل سراز زیر بال برکشید و قمری بہ تمنائے نظارہ بالائے سرو؛ از کنجِ آشیاں پرید۔ شاخِ گلبن از غنچہ و گل زیب خمیدن یافت و شمشاد و صنوبر باہتزاز صبا زمنت چمیدن۔ نسیم سحری شگفتگی افزود و بادِ بہاری چہرۂ ترقی نمود۔ نہال شوق بو فورِ بالیدن۔ و شاخِ تمنا مسرورِ نو دمیدن۔ حُسن بآرایش، وعشق بافزائش۔ نغمہ سازان بسرائیدن بسنت طرب فزا و ترنم پردازان۔ ترانۂ عندلیبان ہم صدا۔ ہر جا بزم نشاط و ہر مکاں محفل انبساط ؎

از جوشِ بہار زر فشانی   دلہا بہزار شادمانی
وز کثرتِ خلعتِ طلائی   سامان ہزار دل کشائی

وقتے بروز بسنت بہر نظارۂ نازنیانِ نو بہار و دلفریبانِ بسنتی شعار برآمدم۔

(صـــــ 103 سے آگے)

ڈالی بازار جو سودا نے متاعِ دل کو   لُٹ گئی دیکھتے ہی جنس خریدار کی طرح

مولوی عبدالقادر سورۂ بروج کے ایک فائدے میں لکھتے ہیں۔ "پھر شہر میں ہر محلّے کے آگے کھائی کھود دائی اسے آگ سے بھری۔ یہ محاورہ اب بھی زبانوں پر ہے۔ (ش)

چوں دارِ کوچہ گردیدم۔ چندیں نازنین بسنتی لباس را بہ سازِ طرب دیدم۔ مسرور شُدم و گفتم ؎

چہ جائے غیر چنیں است ایں لباسِ بسنت   کہ دل بہ جلوہ رُباید ز دستِ سادہ[1] بسنت

تبسّم کردند و بجائے ترصّدِ زر متوجّہ شدند۔

نظیر دہلی سے آگرے جاتا ہے

ابھی تک نظیر دہلی میں تھا، مگر اب سین بدلتا ہے۔ دہلی جہاں وہ پیدا ہوا، جہاں اس نے پرورش پائی، جہاں وہ جوان ہوا، اس کو ایک تازہ اور بڑی آفت کا سامنا ہے۔ نادر[2] کو اپنی خون ریزیوں کا سکّہ بٹھا کر گئے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔ ظالم کی عمر کوتاہ، گو وہ اس جہاں سے جا چکا ہے، مگر احمد شاہ دُرّانی اس کا جانشین موجود ہے اس کے دو حملے متواتر ہو چکے ہیں گو پہلے حملے میں سرہند[3] کے میدان میں محمد شاہ کی خوش قسمتی سے احمد شاہ، اس کے بیٹے کے ہاتھ سے شکست کھا کر اس کو لوٹ جانا پڑا تھا۔ مگر محمد شاہ کی آنکھ بند ہوتے پیچھے[4] اب تو وہ لاہور اور مُلتان دونوں کو دبائے بیٹھا[5] ہے۔ بادشاہ[6] سلامت ایک نامرد مگر مُنہ چڑھے خواجہ سرا کے مارے جانے سے اپنے وزیرِ اعظم صفدر جنگ (صوبہ دار اودھ) سے بے زار ہیں، اور انتقام کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ غازی الدّین اگرچہ صفدر جنگ ہی کا بڑھایا ہوا ہے اور سپہ سالاری

---

[1] سادہ، بے وقوف۔ مورکھ، بھوندو، بھولا بھالا، سیدھا سادہ ؎

ہر صبح جو خورشید ترے مُنہ پر چڑھے ہے   ایسا نہ ہو یہ سادہ کہیں جی سے اُتر جائے (میر)

ایضاً۔ کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے ؎

لگے ہے ہمیں وہ تو عیّار سا   سادہ بسنت اُتو بسنت (ش)

[2] نادر کا حملہ 1739 میں ہوا تھا۔ (ش)

[3] احمد شاہ نے دُرّانی کو مارچ 1748ء میں میدان سرہند میں شکست دی تھی۔ (ش)

[4] محمد شاہ اپریل 1748ء میں مرا۔ (ش)

[5] دُرّانی کا دوسرا حملہ 1751ء میں ہوا تھا۔ (ش)

[6] احمد شاہ (ش)

کے رُتبے کو اسی کا پہنچایا ہے، مگر اس نامرادانہ کام میں بادشاہ کا دست و بازو بنتا ہے۔ اس اختلاف کے سرچشمے سے شہر میں خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ ہول کر آن کران ندیوں پر پُل باندھتا ہے۔ صفدر جنگ مصلحت وقت سمجھ کر کنارے ہو جاتا ہے۔ گو بادشاہ پہلے سے آنکھیں کھولے بیٹھا تھا، مگر جب غازی الدّین کی بے اعتدالیوں سے اس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور چشم نمائی کے لیے شہر سے باہر جاتا ہے، تو بر عوض اس کے کر کامیابی اس کو آنکھیں نکالنے کا موقع دے، شکست خود اس کی آنکھیں نکلواتی ہے[7]۔ اور اہلِ نظر آیۂ فاعتبروا یا اولی الابصار[8] پڑھواتی ہے۔ عالمگیر ایک ناتجربہ کار شخص اس کا جانشین ہوتا ہے۔ غازی الدّین اس سے وہ کام لیتا ہے، جو کٹھ پُتلی والے کٹھ پُتلیوں سے لیتے ہیں۔ اپنے حریف صفدر جنگ کے مرنے کے بعد آپ وزیرِ اعظم بنتا ہے۔ مگر اس بڑے عہدے کی عزّت سنبھال نہیں سکتا۔ ظالمانہ کاروائیاں اس کی اہلِ لشکر کو بیزار کرتی ہیں اور انہی کے ہاتھ سے اس کو سر و پا برہنہ سڑکوں پر گھسیٹواتی ہیں۔ اپنی سنگ جانی سے بچ نکلتا ہے اور سنگ دلی سے تمام باغیوں کو خون میں نہلاتا ہے۔ پھر دماغ جو چلتا ہے تو دُرّانی کے مقابلے کے حوصلے ہوتے ہیں۔ پنجاب تشریف لے جاتے ہیں، اور دُرّانی کے جانشین کو غُرفش[9] دکھاتے ہیں۔ دُرّانی ایسے کُتّوں کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ بجلی کی طرح انڈس پار اُترتا ہے، اور جنگی سونٹے سے ان کی خبر لیتا ہے۔ یہ دُم دبا کر انقیاد و اطاعت کے خیموں میں گھستے[10] پھرتے ہیں۔

اہلِ دہلی جن کی نگاہوں کے سامنے نادر کی تصویر لباسِ خونی میں پھر رہی ہے ان کے دلوں کا اس وقت کیا حال ہوگا؟ اس قیامتِ صغریٰ کو ابھی تک پورے اٹھارہ برس نہیں ہوتے۔ لوگوں کے دلوں سے ابھی عزیزوں کے داغ نہیں بھولے سینکڑوں مکان ابھی تک بے مکیں

---

[7] احمد شاہ 1754 میں تخت سے اُتار گیا اور اسی سال اس کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ غازی الدّین نے نکلوائیں۔ (ش)

[8] ترجمہ اے آنکھ والو عبرت حاصل کرو (قرآن) (م)

[9] غرفش۔ غصّہ کی بات تاؤ دکھانا۔ (م)

[10] یہ 1756 کا واقعہ ہے دُرّانی کا تیسرا حملہ یہی ہے جس میں وہ دہلی آیا اور نادر شاہ کے واقعے خون ریزی کو تازہ کر دیا۔ (ش)

پڑے ہوئے ہیں، آباد نہیں ہوئے۔ ہزاروں عورتیں ہنوز اپنے لُٹے ہوئے زیوروں کو رو رہی ہیں، پورے بن نہیں چکے۔ نظیر کو گو نادر کے حملے کے وقت ہوش نہ تھا، مگر ہوش سنبھلتے ہی وہ اس کی ہوش اُڑانے والی داستانیں سُننے لگا۔ چشم دید بیان کرنے والوں کی گذشتہ خوف کے تصوّر سے پتھرائی ہوئی آنکھیں اور اُوپر کو کھنچی ہوئی بھنویں اس کے آغازِ عمر کے توہم آمیز دل پر نقش کالحجر ہو گئی ہیں۔ عجب نہیں اگر وہ گہوارے میں بھی نادر کے تذکروں سے ڈرایا گیا ہو۔ نادر کو وہ آدمی سے کچھ زیادہ اور دیو سے کچھ کم سمجھتا ہے، اور کیوں کر نہ سمجھے کہ گھر کی عورتیں اس کا نام سُنتے ہی کانپ اُٹھتی ہیں۔ ان کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قریب قریب ان پر وہ عالم طاری ہوتا ہے جو تسلیط کے وقت آسیب زدوں پر ہوتا ہے۔

دُرّانی کے دہلی آنے کی خبریں شہر میں گرم ہیں۔ بقول عقلائے فرنگ ؎

بُری خبروں کے لگ جاتے ہیں پَر سے

یہ خبریں بُرائی کے انہی ضرب المثل پروں سے اُڑتی پڑتی نظیر کے گھر میں بھی پہنچی ہیں۔ گھر کی عورتوں کے دل تو وہ تھے کہ اگر لوگ جھوٹوں بھی کہتے تو وہ سچ جانیں؛ چہ جائیکہ یہاں تو بدقسمتی سے خبر بھی سچ تھی۔ سُنتے کے ساتھ سب کے ہوش جاتے رہے۔ عورتوں کا بڑا بنک ہے زیور۔ اس پر پنڈول[1] کا پہرہ بٹھایا گیا۔ شاید یہ پہرہ نادر کے حملے کے وقت بھی مفید ہوا ہو اور نظیر سے بُلا کر کہا گیا کہ بابا یہ شہر اب رہنے کے قابل نہیں۔ تم کو کیا خبر۔ تم اس مصیبت کو کیا جانو۔ ہم لوگ اپنی آنکھوں سے اس ولائتی گڈریے کے کرتوت دیکھ چکے ہیں۔ سوا پہر شہر میں لہو کی ندیاں بہتی رہیں۔ لوگوں کے سرکٹوروں کی طرح تیرتے پھرتے تھے۔ لوٹ مچی تو ایسی کر دو مہینے تک ولائیتوں نے دم نہ لیا۔ گھر گھر گھستے پھرتے تھے اور جان مال آبرو سب پر ہاتھ مارتے تھے۔ دُرّانی بھی آخر اسی کا چیلا ہے۔ یہ بھی زہر ہی کا بُجھا ہوا ہوگا۔ اس دفعہ نہیں معلوم کیوں کر ہم لوگوں کا گھر بچ گیا۔ شاید غریبی آڑے آئی ہو۔ مگر اب کے بچنے کی کوئی

---

[1] پنڈول۔ ایک قسم کی سفید مٹّی جو لیپنے پوتنے کے کام آتی ہے۔ زر و مال کو خوف و خطرے محفوظ رکھنے کی خاطر دیوار میں چھپا کر اوپر سے سفیدی پھروا دینا۔ (م)

شکل نہیں۔ جس طرح بنے یہاں سے جلد نکل چلو۔ شہر میں بھاگڑ مچ چکی تھی۔ اس پر عورتوں کی اشک آلودہ تقریر، نظیر بے چین ہو گیا۔ فوراً جس طرح بن پڑا رتھ، بہلی، ڈولی جو سواری میسّر ہوئی، دروازے پر لاکر کھڑی کی۔ گھر میں دو ہی عورتیں تھیں۔ ماں اور نانی، تیسرا آپ۔ نانی کے حواس کچھ تو بڑھاپے نے کھوئے تھے، کچھ اس آفت کے تصوّر کی نذر ہوئے۔ وہ کیا کرتیں۔ البتہ ماں کسی قدر حواس میں تھیں۔ نظیر اور اُنھوں نے دونوں نے مل کر سارا اسباب سمیٹا اور سواریوں پر ٹھکانے سے رکھا۔ گھر تھا تو خالی، یہی تین تو ہوں گے نہیں۔ آخر لونڈیاں، باندیاں، نوکر چاکر بھی ہوں گے۔ چلنے لگے تو اچھا خاصہ دس بارہ آدمیوں کا قافلہ تھا۔ یہ قافلہ آگرے کو روانہ ہوا۔ اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی کہ آگرے کو کیوں اختیار کیا گیا۔ شاید کوئی قرابت مند پہلے سے وہاں ہو۔ یا یہ خیال ہو کر دہلی کے بعد اس سے بہتر ان دنوں کوئی شہر محفوظ و معمورہ نہ تھا۔ بہر حال، کوئی سبب ہو یہ لوگ بخسلاح استعجال آگرے پہنچے اور وہاں مٹھائی کے پُل پر قیام کیا۔

باب 3

نظیر کی شادی

جب تک ہندوستان میں دُرّانی کے قدم رہے کس کی شامت آئی تھی کہ شادی کا نام لیتا۔ تمام ملک میں ایک زلزلہ مچا ہوا تھا اور ہر طرف بے امنی پھیلی ہوئی تھی۔ آنے کو نظیر آگرے سے آیا مگر اس آفت نے اس کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ آگرے کے قریب تک یہ بلا پہنچ چکی تھی۔ وہ تو خیریت ہوئی اس کے لشکر میں وبا پھیلی جس کی وجہ سے کچھ یوں ہی سا لوٹ کر جاٹوں کے مُلک کو متھرا کے ایک مذہبی میلے میں کئی ہزار جوگیوں سنیاسیوں اور دوسرے ہنود کی بھینٹ لیتا ہوا اُوپر ہی اُوپر اپنی ولایت کو لوٹ گیا۔

آدمی کی یہ بھی فطرت ہے کہ خطرہ اگرچہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو مگر جب وہ ٹل گیا تو پھر ایسا بے فکر ہو جاتا ہے گویا کبھی وہ خطرہ تھا ہی نہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ جس قدر خطرہ بڑا ہوتا ہے اسی قدر زیادہ زور سے طبیعت انسانی کا یہ خاصہ ظاہر ہوتا ہے۔

دُرّانی کے حملے سے دلوں میں جو پریشانیاں پیدا ہوئی تھیں وہ انتہائی درجے کی تھیں۔ مایوسی کا یہ حال تھا کہ کم ہی اشخاص ایسے ہوں گے جو یہ نہ سمجھتے ہوں کہ ہم پر حضرت عزرائیل کا آٹھوں پہر سخت پہرہ ہے۔ عالم تردّد میں جب نفس تنگی کرنے کو لگتا تھا تو بعض اوقات خود اپنا جسم قبر بن کر فشار دیتا تھا۔ تنہا مکان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے آنکھوں کے تلے یکایک اندھیرا چھا گیا۔ کانوں کو نکیرین کی آہٹ سُنائی دینے لگی۔ سوالات کا تار بندھا ہوا ہے۔ اور یہ ایک دو روز کی

کیفیت نہ تھی، بلکہ مہینوں کا مشغلہ۔

مقامِ غور ہے کہ جب ان مُصیبت مندوں کے سر سے وہ بلا ٹلی ہوگی تو پھر اُن کے دلوں میں خیالاتِ شکر کس زور سے اُبھرے ہوں گے۔ کتنے ہاتھ دعا کے لیے اُٹھے ہوں گے اور کتنے سر سجدے میں جھکے ہوں گے۔ کتنی چادریں کن کن مزاروں پر چڑھی ہوں گی اور کتنی منتیں کہاں کہاں اُتری ہوں گی۔

لیکن کیا اس صدمۂ عظیم کی تلافی کے لیے یہی معمول رسمی باتیں کافی ہو سکتی ہیں۔ ہرگز نہیں۔ نیچر جو اپنے وقت کا ابن سینا ہے، اپنا قانون لے کر آتا ہے اور غفلت کی معجون کھلا کر گذشتہ ہولناک واقعات کو دلوں سے یک قلم بُھلا دیتا ہے طفلانہ خوشیاں اور اُمنگیں اُن بھرتی ہیں، اور بے فکریوں کے مشغلے ہر طرف کثرت سے پھیل جاتے ہیں۔

نظیر کے گھر میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ کچھ تو ان کی جبلّت میں بُزدلی کچھ سن کا تقاضا — دُرّانی کے خوف سے جس قدر ان کے دل چور ہوئے تھے، شاید کم کسی کے ہوئے ہوں گے۔ تعجّب ہے کہ اس اتنی مدّت تک یہ زندہ کیوں کر رہیں۔ بہرحال جب اس مُصیبت کو جھیل گئیں تو اب تو خدا نے اچھے دن دکھائے۔ ابتدائی مراتبِ شکر و سپاس سے فراغت حاصل کر کے سب سے پہلے ان کے خیالات نظیر کی شادی کی طرف رجوع ہوئے۔ نظیر جوان ہوا۔ تنہا گھبراتا ہوگا۔ کوئی دُلہن سلیقے کی مل جاتی تو اس کا دل بہلتا۔ لڑکے کی خبر گیری کچھ مردوں ہی سے خوب ہوتی ہے۔ ہم کیا جان سکتے ہیں کہ کہاں جاتا ہے کہاں آتا ہے۔ شہر کا واسطہ ہے۔ ہر طرح کی صحبت ہے۔ خدا جانے کس صحبت میں بیٹھ کر کیا ڈھنگ اختیار کرے۔ اس کے ابا یہاں ہوتے تو اس کو روکتے ٹوکتے۔ ہم پردے کی عورتیں کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ پرایا شہر ہے۔ اس میں ہم کو کون جانتا ہے۔ ہم کو کون بیٹی دے گا۔

نظیر جب سے آگرے میں آیا تھا، ابتدا میں تو یہ بھی تردّدات میں مبتلا رہا۔ نیا شہر تھا۔ دُنیا کا بہت زیادہ تجربہ اس کو نہ تھا۔ تمام انتظام نئے کرنے تھے۔ مکان کا نیا بندوبست، فرش فروش کا نیا بندوبست، پانی کے لیے نیا سقّا، کپڑوں کے لیے نیا دھوبی — خلاصہ یہ کہ خانہ داری کے تمام جزیات و کلّیات اُمور کا از سرِ نو انتظام۔ ان جھگڑوں سے جب فراغت ہوئی تو رفتہ رفتہ اس نے کام کے لوگوں سے تعارف پیدا

کرنا شروع کیا۔ کچھ تعارف تو انتظام خانہ داری کے ضمن میں بھی ہوا تھا۔ مگر اس میں کچھ اس کے مذاقِ خاص کو دخل نہ تھا۔ اب یہ ایسے لوگوں سے تعارف پیدا کرنے لگا جن میں اس کی دل بستگی اور پسند کے لائق صفتیں موجود تھیں۔ کہیں سُنا کہ فلاں نوجوان نہایت ذہین اور طبیعت کا چالاک ہے۔ اُستاد اس کے مدّاح ہیں اور شہر میں اس کی بڑی تعریف ہے۔ فوراً کسی تقریب سے اس سے جاملا اور رسمِ آشنائی بڑھا کر مبادلۂ خیالات کرنے لگا۔ ہرچند ایک ذکی دوسرے ذکی اور ایک طبّاع دوسرے طبّاع کا جلد قائل نہیں ہوتا مگر غیر معمولی طبّاعی و ذکاوت کا کوئی کب تک انکار کرسکتا ہے۔ انصاف پسندی غالب آتی ہے۔ اور نظیر کی اذکیا[1] کی انجمن میں خود اذکیا کی زبان سے تعریف ہوتی ہے۔ اُن دِنوں اظہارِ جودت کا ایک بہت موقع مشاعرہ تھا۔ میر تقی کی شاعری اوج پر تھی تمام شہر اُن کا لوہا مانتا تھا۔ جس مشاعرے میں یہ شریک ہوتے اس کا مہینوں تذکرہ رہتا۔ اکثر سخن فہم اور سخن سنج اُن کا نام سُن کر بشوق شریک ہوتے اور محظوظ واپس آتے۔ شرکاءِ مشاعرہ کے رنگین اور چیدہ اشعار ہر ایک کی زبان پر ہوتے ہیں۔

نظیر دہلی سے آیا تھا تو شعر کہتا ہوا آیا تھا۔ جوانی، عاشقی کا گہرا رنگ اس کے مزاج میں بھر رہی تھی۔ طبیعت کی شوخی ہر وقت ایک تازہ گلدستہ سامنے لیے رہتی تھی۔ پہلے تو دو ایک دفعہ یوں ہی شریکِ مشاعرہ ہوا۔ جب اپنے ہم عمر سخن گویوں کا رنگ ڈھنگ دیکھ لیا تو ایک دفعہ خود اس کے دل میں یہی خیال پیدا ہوا کہ لاؤ اب کے میں بھی تو کچھ لکھوں۔ اور لوگ لکھتے تھے تو اساتذہ کی تقلید کرتے تھے۔ بڑی بے فکری سے لکھتے۔ ہفتوں میں غزل تمام کرتے۔ پھر اُستاد کے حضور لے جاتے۔ اُستاد کچھ شعر کاٹتے کچھ چھانٹتے۔ کسی شعر کی اصلاح فرماتے۔ بعض مُنہ چڑھے شاگردوں کو دو ایک شعر اپنے خزانۂ طبیعت سے بھی عطا کرتے۔ گو اس ترکیب سے معمولی واہ واہ سُبحان اللہ سے ان کے کان آشنا ہو جاتے تھے مگر کوئی غیر معمولی چرچا نہیں پھیلتا تھا۔ نظیر اپنا اُستاد آپ تھا۔ ہرچند تھوڑی بہت تقلید سے تو چارہ نہ تھا مگر طبیعت کی آزادی اور شوخی زیادہ تر اپنی طرف کھینچ کر لے جاتی تھی۔ جس سے قوتِ ایجاد کو پھولنے پھلنے کا اچھا موقع ہاتھ

---

[1] ذکی کی جمع۔ (م)

اُٹھا تھا۔ اسی عالم میں اس نے ایک شگفتہ اور لطیف غزل تیار کی۔ امتحاناً کسی دل دوست کو سنائی تو وہ مُصر ہوئے کہ اس کو اب کے مشاعرہ میں پڑھو اور ضرور پڑھو، تقریب کا میرا ذمہ۔ نظیرؔ اس دوست کی صلاح پہلے تو انکسار سے نہیں مانتا مگر خود نمائی دامن نہیں چھوڑتی بقول غنیمتؔ[1] ؎

پری روتابِ مستوری ندارد
چو در بندی سر از روزن برآرد

آخر جاتا ہے۔ نظیرؔ کو آئے ہوئے اتنا زمانہ ہو گیا تھا کہ کبھی طرح میرؔ صاحب تک بھی اس کا تذکرہ پہنچ گیا تھا۔ جب اس کی غزل کی تقریب کی گئی میرؔ صاحب نے اپنے مقدس لبوں سے اظہارِ تبسم فرما کر ایک مربیانہ ادا سے یوں ارشاد کیا۔ ہاں بھئی پڑھو اور ضرور پڑھو کُلّ جدید لذیذ، دہلی کے چٹخارے تو مشہور ہیں۔

دل کی دُھکڑ پکڑ اس وقت قابلِ ملاحظہ تھی۔ مگر تقریب ہو چکی تھی۔ اتنا بڑا اُستاد شوق ظاہر کر چکا تھا۔ پھر سوا پڑھنے کے چارہ کیا تھا۔ دل کو کڑا کر کے بند سے غزل کھولی اور ورق کو مضبوطی سے تھام کر ایک نیم محجوب ادا سے لوگوں کی طرف مخاطب ہوا۔ چاروں طرف سے "ارشاد ارشاد" کا غُل تھا۔ جس وقت نظیرؔ نے یہ مطلع پڑھا ہے لوگوں کا عجب عالم تھا ؎

نظر پڑا اک بتِ پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عُمر دیکھو تو دس برس کی پہ قہرِ آفت غضب خدا کا

ختمِ غزل پر میرؔ صاحب نے قریب بُلا کر پیٹھ ٹھونکی اور مکرر فرمایا عُمرت دراز باد۔

جس مشاعرہ کا یہ ذکر ہے اس میں گو میرؔ صاحب نے بھی غزل پڑھی۔ لوگوں کے دلوں میں نظیرؔ کے اشعار نے تعجب کے خیالات اس کثرت سے بھر دیے تھے کہ کسی اور بات کی گنجائش ہی نہ تھی، رنگ جمتا تو کیوں کر جمتا۔ ان دنوں کے حافظے دفتر کے دفتر یاد رکھ سکتے تھے۔ مگر ساتھ اس کے بھی بنظرِ مزید احتیاط کئی نقلیں لوگوں نے وہیں لیں اور کئی نظیرؔ کے گھر پہ آ کر لے گئے۔ نظیرؔ اپنی اس کامیابی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ جدھر جاتا

---

[1] غنیمت۔ فارسی شاعر (م)

تھا لوگوں سے داد پاتا تھا۔ جوان "مرحبا" اور "جنّدا" کہتے تھے اور بوڑھے "ماشاءاللہ، چشم بد دُور فرماتے تھے۔

شدہ شدہ اس کی شہرت ملکوں کی گلی میں بھی پہنچی۔ وہاں ایک دہلی کے بادشاہی[۵] احدی رہتے تھے۔ ان کا نام تو معلوم نہیں اور چنداں اس سے غرض بھی نہیں، مگر ان کے ایک داماد تھے جن کا نام محمد رحمٰن تھا۔ احدی صاحب کی چونکہ اللہ آمین کی ایک ہی بیٹی تھی، اپنے داماد کو بہت چاہتے تھے، گویا ایک طور پر ان کو خانہ داماد کرلیا تھا۔ ان کے دو لڑکے تھے خیرالدّین اور کریم الدّین اور ایک لڑکی جس کا نام معلوم نہیں۔ یہ لڑکی اب اس عُمر کو پہنچی تھی جس میں بُزرگوں خصوصاً بُزرگ عورتوں کو بڑی فکر ہوتی ہے۔ خانہ دامادی کے سبب باپ تو بے فکری کے ساتھ دونوں وقت کھاتے اور دندناتے تھے، مگر ماں اور نانی کو نیند نہ آتی تھی۔ احدی صاحب پر ہر حیلے بہانے سے تقاضے ہوئے کہ اس کی شادی کی فکر کرو۔ وہ بھی کہتے "مجھے خیال ہے۔ فکر ہی میں ہوں۔ کوئی ڈھب کا پیام آئے تو کہوں"۔

اسی اثناء میں نظیر کی طبّاعیوں کا حال سُنا۔ کسی موقع پر جب وہ تاج بی بی کے روضے کی سیر کو باغ میں آیا تھا تو اس کو دیکھا بھی تھا۔ احدی صاحب کے دل میں بڑے زور سے خیال آیا کہ ہم بھی دہلی کے ہیں اور اس لڑکے کا خاندان بھی دہلی کا ہے۔ کیا خوب ہوتا کہ یہ لڑکا ہم کو ملتا ــــــ شہر میں مشاطوں کی کیا کمی ہے۔ ایک کو بُلاؤ دس دوڑی آئیں۔ احدی صاحب نے کسی مشہور مشاطہ کو بُلایا اور اس سے اپنا عندیہ بیان کیا۔ اس نے کہا آپ فکر نہ کیجیے۔ یہ تو بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دو ہی چار روز کا ذکر ہے کہ خود لڑکے کی ماں نے مجھ کو بُلا کر بڑی منّت اور سماجت سے کہا تھا، اچھی کوئی لڑکی میرے ولی محمد کے لیے نہیں ٹھہرا دیتیں۔

مشاطہ احدی صاحب کے ہاں سے چل کر نظیر کے گھر آتی ہے اور یہاں اس کی ماں نانی پاس اپنا رنگ جماتی ہے۔ دُلہن کی صورت کی تعریف کرتی ہے ــــــ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ ہنر سلیقے کی بڑائی ہانکتی ہے۔ دسوں انگلیاں۔ دسو

---

۵ بادشاہی احدی۔ شاہی عہدہ مراد ہے۔ (م)

چراغ۔ حسب نسب کی خوبیاں جتاتی ہے۔ ان کے بُزرگوں میں بڑے بڑے لوگ ہوگزرے ہیں۔ ملکوں کی گلی اُنہی کی آباد کی ہوئی ہے۔ پہلے ان لوگوں کا بڑا دور دورہ تھا۔ قوم کے مغل تو ہیں ہی اور مغل بھی کون چُغتائی۔ ان کی جواں مردی میں شک کس کو ہوسکتا ہے؟ ملک میں لڑائی تھی۔ بادشاہ حیران تھے۔ کوئی تدبیر بن نہ پڑتی تھی۔ آخر لوگوں نے، نام تو یاد نہیں، مگر ان کے پرکھوں میں جو سب سے ہو بڑے گزرے ہیں، ان کا نام لیا۔ چھوٹتے ہی بُلوائے گئے اور لڑائی پر روانہ ہوئے۔ کل جمع ان کے ساتھ دو سو سپاہی تھے اور غنیم کی طرف خدا جھوٹ نہ بُلوائے تو کم سے کم دو لاکھ۔ مگر ان کی بہادری اور جُرأت کے صدقے جایئے کر دو گھنٹے میں پھر ایک کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ سچ ہے تلوار کی آنچ ایسی ہی ہوتی ہے۔ غرض اسی دن سے ان کو بادشاہ نے تمام فوج کا سردار کیا۔ اور یہ سپہ سالار کے نام سے مشہور ہوئے۔ مگر بیوی، دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے، اور نوکری موت کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ عروج دیکھ کر لوگ جلنے لگے۔ دراندازوں نے بادشاہ کے کان بھرے۔ بادشاہ تھے ذرا کان کے کچے۔ دم میں آگئے۔ حاکم کا قہر اور گنگا کی لہر مشہور بات ہے۔ فوراً حکم ہوگیا کہ کل صبح تک شہر چھوڑ دو، نہیں بال بچے سب کو لھو میں پلوا دیے جائیں گے۔ اس حکم کے بعد کھانا پینا کس کو خوش آسکتا تھا۔ راتوں رات وہاں سے روانہ ہوئے اور آگرے ہی میں آکر دم لیا۔ اسی زمانے سے پُرانی منڈی میں باغ خان عالم کے قریب ملکوں کی گلی میں آباد ہیں — پہلے تو بہت کچھ تھا مگر اس گئے گزرے وقت میں بھی کسی کے محتاج نہیں۔ دس کو دے کر کھاتے ہیں اور شہر میں ان کی بڑی آب رُو ہے۔

اس طرح کی باتوں سے نظیر کی ماں نانی کو وہ ایک آن میں شیشے میں اُتار کر قول قرار لے کر پھر ملکوں کی گلی واپس آجاتی ہے اور ہنستی ہوئی بڑے دعوی کے ساتھ انعام کا تقاضہ کرتی ہے۔ سب آؤ بھگت سے اس کو اُونچی پیڑھی پر بٹھاتی ہیں، اور پان پر پان زردے پر زردے دیے جاتی ہیں۔ بی مشاطہ پھر اصل پیام سُناتی ہیں اور ہنسی خوشی گھی شکر سے ان کا مُنہ بھرا جاتا ہے۔

ابتدائی امور کے بعد پھر ضابطے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ نظیر کے گھر کی عورتیں نظیر کو اپنے ارادے سے مطلع کرتی ہیں۔ وہ ایک خوش آیند ادا سے مسکرا کر شرماتا

ہوا جواب دیتا ہے "جیسی آپ لوگوں کی خوشی"۔۔۔اس رضامندی کے متعلق پیش گوئی کرنے والیاں داد لینے کو اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ کیوں بیوی ہیں نہ کہتی تھی صاحب زادے آپ کے حکم سے باہر نہ ہوں گے۔ پھر کسی دن نظیر کو بُرقعے کی تکلیف دی جاتی ہے۔گو اس پر جبر گزرتا ہے، مگر کسی طرح اپنے حسب و نسب کا رجز سُنا کر رہتا ہے۔ ملکوں کی گلی میں تو ناموں کی ایک لمبی فہرست گئی ہوگی مگر مجھے اُن میں سے صرف دو ہی معلوم ہوئے۔ ابن ہم غنیمت ست۔ وہ دو یہ ہیں۔ محمد فاروق اور محمد سلطان۔

رقعے کے بعد سخن ہارنے کی بازی آئی۔ نوری دروازے سے نظیر کی ماں اور نانی دو ایک اور پاس پڑوس کی عورتوں کو لے کر احدی صاحب کے گھر پہنچیں اور تجاہل عارفانہ کے ساتھ سخن ہار آئیں۔ اس لڑکی کو میں لوں گی۔ میں تم سے اس لڑکی کو مانگتی ہوں۔ یہ لڑکی تم مجھے دو۔۔۔ بقول شخصے، من بھاوے مُنڈیا ہلاوے۔ اُدھر سے بھی کچھ عاجزی انکساری کے کلمات کے ساتھ کہ ہم تمہارے لائق تو نہیں ہیں۔ اس لڑکی میں کیا ہے جس پر تم ریجھی ہو۔۔۔ اظہارِ رضامندی کیا گیا۔۔۔ اور آخر تاریخ منگنی کی مقرر ہو گئی۔

منگنی کے ایک ہفتہ قبل سے راگ رنگ شروع ہوا۔ نظیر کے گھر میں الگ اور نظیر کے منگیتر کے گھر میں الگ۔ اگر اُدھر گھوڑیاں گائی جاتی تھیں، تو اِدھر سہاگ۔ یوں منگنی کی خبر گھوڑیوں پر سوار ہو کر بڑے سہاگ سے نکلی اور گھر پہنچی۔

خیر سے وہ منگنی کی شبھ گھڑی نیک ساعت بھی آ ہی پہنچی۔ نظیر رنگین لباس پہن کر دُولہا بنتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لباس سے زیادہ آج کچھ ان کی طبیعت رنگین ہو رہی ہے۔ اپنے احباب اور مستورات کے ساتھ خوش خوش دُلہن کے گھر تشریف لے جاتے ہیں۔۔۔ اور اندر باہر خوشی کا باغ لگا دیتے ہیں۔ عورتوں کے سواری سے اُترتے ہی چڑھاوے کے سامان گھر میں پھیل جاتے ہیں۔ سونے چاندی کے زیور، گوٹے پٹھے اور پھولوں کے گہنے، دُہری دُہری انگوٹھیاں، مصری کے کوزے، خوش نما سنگار دان، ان میں سونے چاندی کے ورقوں سے مڑھی ہوئی پان کی بیڑیاں۔۔۔ دُلہن کے ہاتھ پیر رکھنے کے لیے رومالوں میں بندھے ہوئے روپے اشرفیاں، گود میں ڈالنے کے لیے ناریل، کھیلیں، بتاشے، لڈو، مٹکیوں میں بھری بھری کئی من شیرینی۔

اس سامان کے ساتھ گھر میں ایک خاص خوشی پھیل جاتی ہے۔ اب جس شخص کو دیکھیے، اس کی پیشانی ایک خاص روشنی سے چمکی ہوئی ہے۔ دلی اُمنگوں نے ہاتھ پاؤں میں بھی پھرتیاں بھردی ہیں — کوئی لپک کر اُدھر آتی ہے، کوئی جھپٹ کر اُدھر جاتی ہے۔ زنان خانے کی پُرانی دُنیا میں نئی دُنیا کی ہلچل ہے۔ اسی دُنیا میں ایک نئی نویلی رنگیلی البیلی کسی گوشے میں بیٹھی ہے — لوگوں کی ہر آہٹ اس کے دل میں بجلی کی لہریں پیدا کر رہی ہے۔ دل کیا ہے خاصہ لیڈن جار[1] ہے — دُور کی آہٹ رفتہ رفتہ ایک ممتاز چاپ ہو جاتی ہے۔ سگھڑ سہاگنوں کا ایک خوش نما جھنڈ اندر داخل ہوتا ہے۔ سُرخ جوڑے سے شفق پھُولتی ہے۔ گوٹے پٹھے سے بجلیاں چمکتی ہیں۔ زیورات سے تارے چھٹک جاتے ہیں۔ غرض ایک سادی خوزادی آرایش وزیبایش کے طلسم سے خاصی دُلہن بن جاتی ہے۔

سمدھنیں آنکھیں بچھائے باہر بیٹھی ہیں۔ دُلہن کی عُمر ہی کیا ہے۔ پھُول ہو رہی ہے۔ اس خوش بو پھول کو لوگ گود میں اُٹھا کر سمدھنوں کی گود میں لا رکھتے ہیں، سمدھنیں اور کون؟ نظیر کی ماں اور نانی۔ یہ دونوں رنگ ڈھنگ دیکھ کر جامے میں پھُولی نہیں سماتیں — دلوں سے خوشی کی بُلبل چہک کر لبوں پر آ بیٹھتی ہے اور "شادی مُبارک" کا مُبارک راگ بلند کرتی ہے۔ جہیز کے زیوروں پر چڑھاوے کے زیور تاروں بھری رات میں جگنو چمکاتے ہیں۔ شیریں لبوں کو مصری قند مکرر بناتی ہے۔ بیڑہ زمّرد سے لعل نکالتا ہے۔ ناریل، کھیلیں، بتاشے، لڈّو بھری ہوئی گود میں حلوائی کی دُکان کھول دیتے ہیں، گود بھری جا چُکی تو گھونگھٹ کی گھٹا دُور ہوئی۔ مُنہ چاند سا نکل آیا۔ آنکھیں ایک خاص ادا سے مُندی ہیں۔ چہرے پر اچھی خاصی تمتماہٹ ہے۔ بھولا پن رنگ لا رہا ہے۔ نیک بختوں کا بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے۔ دِلوں سے دُعائیں نکل رہی ہیں۔ اُنگلیاں خیال کی چٹخ رہی ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں رومال سے کھول کر روپے اور اشرفیاں رکھی جاتی ہیں۔ دہنے ہاتھ میں انگوٹھیوں کی بہار نظر آتی ہے۔ صدقے میں میراثنیں بھی کچھ پا جاتی ہیں۔ کہیں وہ نازک پھُول کمُلا

---

[1] لیڈن جار — Leden Jar، ظرف لبریز۔ (م)

نہ جائے، اس خیال سے اس کو گود میں اُٹھا کر پھر کوٹھری میں رکھ آتی ہیں۔ عطر کی شیشیاں دل کھول کر اخلاق کرتی ہیں۔ پھولوں کے ہار گلے کا ہار ہوتے ہیں۔ شربت مُنہ میٹھا کرتا ہے۔ نقدی شکریہ ادا کرتی ہیں۔ پھر اخیر میں چھالیا، الائچی رخصت کے پان دیتی ہے۔

اندر کا حال تو سُن چکے۔ اب باہر کا حال سُنیے۔ برادری برابری مشہور بات ہے۔ جب دُلہن کو بَرِّھاوا گیا تو کیا دُولہا کو نہ جاتا۔ نظیر بے چارہ مسافرت میں تھا۔ ہر چند اس کی ماں نانی دہلی کا ہُنر سلیقہ رکھتی تھیں مگر بے سرو سامانی میں کیا کر سکتی تھیں۔ دُلہن کے نانا شہر کے رئیس تھے۔ قدیم گھرانا تھا، وافر آمدنی تھی، سب طرح کا اطمینان رکھتے تھے۔ بیگم صاحب بھی دل کی سخی تھیں۔ بڑے حوصلے سے دولہا کا بَرِّھاوا بھیجا۔

گوٹے اور پھولوں کے گہنے ایسے تھے کہ بے اختیار درود پڑھنے لگے۔ آنکھوں میں روشنی آئی۔ دماغ نے تازگی پائی۔ دوشالہ خاص کشمیر کا۔ ملاست میں ملائی، نرمی میں ریشم۔ نقش و نگار میں قلم کار چھینٹ۔ رومال عدو میں طاق۔ روئے حُور کو کچھ مال نہ سمجھیں۔ تارِ زُلف کو اگر کچھ سمجھیں تو ہرنے کی مال سمجھیں۔ مردوں کو زیورات سے کیا کام، مگر نوشے کا ہاتھ خالی دیکھا نہیں جاتا۔ انگوٹھے کے لیے چاپ انگشتانہ ہے۔ چھوٹی اُنگلی کے لیے ایک مختصر سی انگشتری۔

نظیر نے گوٹے اور پھولوں کے گہنے تو بیٹھے ہی بیٹھے پہنے۔ جب دوشالے کی باری آئی تو کھڑا ہونا پڑا۔ شگفتہ مزاجی کی صبح میں سہانی شفق پھولی۔ چاپ انگشتانے نے ہاتھ کے انگوٹھے کو دل میں بٹھایا، اس خیال سے کہ نوشاہِ بلاغت کا چاؤش تھا۔ انگشتری نے چھوٹی انگلی کو آنکھوں میں جگہ دی، اس نظر سے کہ نو عروسِ فصاحت کی سہیلی تھی۔ رومال نے ہاتھ میں لالہ زار کھلایا۔ نقدی نے نثار ہو کر گُلِ اشرفی کی بہار دکھائی۔ شکریے کی شاخ سے سلام کے پھول برسنے لگے۔ پھر عطر کی خوشبو پھیلی۔ پان کا رنگ جما۔ شربت کے مزے ہوئے ـــــ چلیے منگنی ہوگئی، مُبارک سلامت۔ مگر اب تو رسموں کا تار بندھا۔ منگنی کے دوسرے ہی دن ملکوں کی گلی سے عورتیں چوبالے کر مٹھائی کے پُل پر جاتی ہیں۔ سامان کچھ اس قسم کے ہیں:۔

چوبے، پھولوں کے زیور، رومال، چاندی سونے کے ورقوں میں لپٹی ہوئی

بیڑیاں، ایک چاندی کا کٹورا، کسی قدر شکر، مونگ اور چاول کا بھوڑا۔

عورتیں اِدھر گھر میں اُتریں۔ اُدھر نظیر کو بُلا وا گیا۔ بہار کے ہاتھوں سے مُسکرا مُسکرا کر چھ نوالے کھلائے گئے۔ ساتویں نوالے پر بڑی ہنسی ہوئی۔ چوبے کے بعد چاندی کے کٹورے میں ٹونون کا شربت آیا اور پلایا گیا۔ پھر پاؤں کے بیڑے اور رومال ہاتھ پر رکھ دیے گئے۔ نظیر کی بہنیں کہاں تھیں کہ سوانگ بنتیں۔ اور اس کے مُنہ میں بیڑا رکھتیں۔ خود سے کھا لیتا ہے اور پھر جُھک جُھک کر سلام کرتا ہے۔ سلام سے خوش ہو کر عورتیں کچھ نچھاور کرتی ہیں۔ میراثنیں اور کمینیں[1] مُنہ مانگی مُراد پاتی ہیں۔

احدی صاحب کی طرف تو لوگوں کے دلوں میں شدّت سے ارمان بھرے ہوئے تھے۔ ان کو ان کے طور پر چھوڑ دیا جاتا تو شاید چاؤ نکالنے کے لیے برس دو برس بھی شادی کا مذکور نہ کرتے، مگر نظیر کی طرف جلدی تھی، کچھ تو اس وجہ سے کہ مسافرت کا عالم تھا۔ ان کے پاس وہ سامان نہ تھا کہ ہر تقریب میں سو دو سو خرچ کرتے۔ دوسرے نظیر اچھی طرح جوان ہو چکا تھا۔ پرایا شہر تھا۔ کوئی مرد سر پہ نہ تھا کہ دن رات اس کے حالات کی نگرانی کرتا۔ ہر وقت خوف میں گزرتی تھی کہ کہیں بُری صحبتوں میں بیٹھ کر راہ سے بے راہ نہ ہو جائے۔ تیسرے کچھ یہ بھی مقصود تھا کہ جلدی بہو گھر آئے اور گھر آباد ہو۔ نظیر کی ماں شاید کچھ ٹھہر بھی جاتی، مگر اس کی نانی کہاں دم لینے دیتی تھیں۔ اُن کی زبان پر دن رات یہی کلمہ تھا کہ زندگی کا موت کا ٹھکانہ نہیں۔ سانس آئی آئی نہ آئی۔ کل کی کس کو خبر ہے۔ دُنیا میں بہت رہ چکی اور سب ارمان نکل گئے۔ اب صرف ایک آرزو رہ گئی ہے کہ وہی محمد پروان چڑھے اور اس کے سر سہرا دیکھوں۔ اسی مطلب کو وہ دن میں سو طرح سے ادا کرتی تھیں اور سب کا خلاصہ یہ ہوتا تھا کہ جو ہو آج ہی ہو جائے۔

غرض منگنی کے ساتھ ساعت رکھنے کی دُھوم ہوئی۔ کسی مسجد میں چانولوں کے طشت میں کچھ نقدی رکھی گئی۔ قرآن مجید کھولا گیا۔ پھر قرآن کو گردان کے تاریخ مقرّرہ کا اعلان کر دیا گیا۔ مسجد کے مُلّا نے طشت کا جائزہ لیا۔ حاضرین پان کا بیڑا اور بتاسے

---

[1] کام کرنے والیاں۔ (م)

لے کر رُخصت ہوئے۔ گُڑ اندر بھیجا گیا۔

شام کو اُدھر دونوں طرف سے زردہ پکوا کر بانٹا گیا۔ اُدھر عورتیں شیرینی اور میوہ لے لے کر دُولہا اور دُلہن دونوں کے گھروں میں سواریوں پر سے اُترنے لگیں۔ ڈھولک نے میٹھے بولوں سے اُن کا خیر مقدم کیا۔ اُنھوں نے خوشی میں آکر سُریلی تانیں گوشِ زہرہ تک پہنچائیں، اور اب ساچق کے روز تک یہی معمول ہوا کہ روز آتیں اور گا بجا کر پھر اپنے اپنے گھر چلی جاتیں۔

جب نکاح کو صرف سات روز رہ گئے تو دُولہا دُلہن دونوں مائیوں بٹھائے گئے۔ دُولہا کا مائیوں بیٹھنا کچھ اس کی ماں اور نانی ہی کو خوشگوار آیا ہو گا۔ لیکن سچ پوچھیے تو مائیوں بیٹھنا تھا دُلہن کا، جس کا تصوّر ہمیں آج بھی خوش کر رہا ہے — اُن دنوں فوٹو کا رواج نہ تھا۔ مصوّر گھر میں گھسنے نہ پاتے تھے۔ فقط خیال کہاں تک نقاشی کرے۔ پھر بھی کچھ خوش نما خط و خال ہمیں دُور سے نظر آتے ہیں۔ شباب طفلی پر جھکا پڑتا ہے۔ طفلی شباب کو پرے ڈھکیل رہی ہے۔ ولائتی خون چمپئی رنگت پر شہاب چھڑک رہا ہے۔ مخموریت آنکھوں میں گلابی جھلکا رہی ہے، مسکراہٹ گالوں میں گڑھے ڈال کر گلاب کو کنوے جھنکواتی ہے۔ ٹھوڑی اپنی نوکیلی ترکیب سے سیب کے دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ بھنورا سے کالے کالے چمکیلے ریشم کے لچھے سر سے اُلجھتے سُلجھتے بکھرتے لہراتے پتلی لچکیلی کمر سے بالشت دو بالشت نیچے تک پاؤں پھیلاتے ہیں۔ ہم اس خوش نما تصویر کو بسنتی جوڑا پہنا کر کچھ نیک بختوں کے جھرمٹ میں ایک نائن کے ہاتھ میں چھوڑتے ہیں۔ اب وہ جانے اور اس کا کام۔ میوے اور پنجیریوں کے ناشتے اور دُودھ کے چائے پانی میں ہم بھی شوق سے شریک ہو سکتے تھے، مگر ابٹنا اندر پاؤں کب رکھنے دیتا ہے۔ خیر رُخصت۔

دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی، خصوصاً وہ دن جو خوشی کے ہیں۔ ان کو تو بجلی کے سے پر لگ جاتے ہیں۔ ہم اس خیال میں پڑے سوتے تھے کہ ابھی پورے سات دن باقی ہیں مگر آنکھ جو کھلتی ہے تو دیکھتے ہیں نظیرؔ کے گھر میں ساچق کے سامان ہو رہے ہیں۔ منتظمین سرگرمِ انتظام ہیں۔ قلی مزدوروں کا ہجوم ہے۔ آرائش کے سامان پھیلے ہوئے ہیں۔ مشعل اور آتش بازی کے ٹوکروں پر ایک صاحب لٹھ لیے ہوئے پہرہ

دے رہے ہیں۔ باہر سڑک پر گھوڑے ہنہنا رہے ہیں۔ تختِ رواں کے آس پاس کچھ بہشت کی قمریاں اِٹھلا رہی ہیں۔ روشن چوکی اور تاشے والے اپنی دُھن میں ہیں صحن میں جہاں عُمدہ نقش و نگار کی، مشکیاں رکھی ہوئی ہیں، کوئی صاحب تشریف لائے اور ڈھکنوں کے کنول پر پتلی پتلی بتّیاں چڑھا گئے کسی طرف سے ایک خوش نما خوان چلا آتا ہے، جس میں چار شیشے نقاشی کے کام کے ڈنڈیوں کے رنگ سے بھرے ہوئے اور کچھ شیشیاں تیل عطر وغیرہ کی رکھی ہوئی ہیں۔ مُنہ ان کا سلیقے سے گوٹے کے سُرخ کپڑے سے بندھے ہے۔ علاوہ ان کے سر پر باندھنے کے لیے کلاوے، مہندی، سُرمہ، مسی، تیل ڈالنے کی پیالیاں، کنگھیاں اور دو انگوٹھیاں بھی ہیں۔ ساتھ ہی اس کے دو سادی مٹکیاں چونے سے لپی ہوئی، مُنہ کلاوے سے بندھا ہوا۔ اس پر آٹے کی مچھلیاں چپکی ہوئیں ـــــ دو چنچل چھبیلی کمر کوٹے کو مٹکاتی لا رہی ہیں۔ پوچھنے سے معلوم ہوا ایک میں گُڑ کا گاڑھا شربت ہے اور دوسری میں دہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے، وہ دیکھیے وہ چڑھاوے کے جوڑے کا خوان بھی پہنچ گیا۔ ایک جوڑا تو بہت ہی بڑی تیاری کا ہے اور سلا سلایا تیار ہے مگر دوسرے جوڑے نے ابھی مقراض اور سوئی سے ملاقات بھی نہیں کی۔ گیارہ گز سُرخ ٹول ہے جس کو سہاگنیں سوہا کہتی ہیں اور پائجامے کے لیے سوا دو گز گلابی رنگ کی لین کلاٹ اور سبز گُلبدن کا تھان، جوڑے کے ساتھ زر نگار جوتی بھی ہے جس میں چاندی کے گھنگرو پڑے چھن چھن کر رہے ہیں اور وہ بیش بہا ازار بند بھی جس پر خود نظیرؔ کا یہ شعر صادق ہے :۔

گوٹا کناری بادلہ مقیش کے سوا تھے چار تولے موتی جو تولا ازار بند

اسی خوان میں وہ خوش نما لاٹ بھی قائم ہے جو ابرک پنّی گوٹے پٹھے اور کلابتون کی وجہ سے بڑی جگمگا رہی ہے۔ لاٹ نہیں، یہ واقع میں سہاگ کا طلسم ہے۔ تمام خوشبودار مصالح اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ خود خوش بو گواہ ہے۔ جوتری، جائفل زعفران چھوٹی بڑی الائچی جو ڈھونڈو سب موجود اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں دُلہن کے پہننے کی سونے کی نتھ بھی ہے، جس میں ایک نہیں تین تین چمکیلے سڈول موتی پڑے پاک دامانی کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ سُہاگ پڑا جو آپ نے سُنا ہو وہ یہی ہے۔ کچھ معلوم نہیں مطلب کیا ہے، مگر ایک نیک بخت ایک ٹوکرے

میں سوئے پالک کا ساگ بھی لا رہی ہے۔ لانے دو۔ میں نے نہیں دیکھا مگر لوگ کہتے ہیں کسی طرف دُلہن کی گود بھرنے اور آراستگی کے لوازمات بھی ہیں۔ بہت مُبارک۔

شہر میں مشہور ہے کہ آج نظیر کی ساچق[1] نکلے گی۔ نوری دروازے سے خان عالم کے باغ تک دورویہ انتظار نے اپنی کھڑکیاں کھول رکھی ہیں۔ جب شام کی سیاہی کسی قدر خوش نما طور پر پھیلی تو منتظمین میں ایک خاص سرگرمی آئی اور اس سرگرمی کے ساتھ مزدوروں اور قلیوں اور اسی درجے کے اور لوگوں میں ایک خاص ہل چل پیدا ہوئی۔ بے جان چیزیں جو زمین پر پڑی تھیں وہ سروں پر پھرنے لگیں۔ شلیکوں کے کنول آنکھوں کی طرح روشن ہوئے اور ستاروں کی طرح جگمگانے لگے۔ درہمی برہم ہوئی۔ انتظام نے نظام پایا۔ شکست خوردہ فوجیں سمٹ آئیں۔ ٹوٹی ہوئی صفیں جمنے لگیں۔ تلنگوں نے پرا باندھا۔ سواروں نے باگیں سنبھالیں۔ بہشتی قمریاں تخت رواں کے پنجرے میں ہو بیٹھیں۔ روشن چوکی پر راگنیوں کا جلوس ہوا۔ باجوں سے آسمان گونج اُٹھا۔ مشعلیں ہر طرف شعلہ فشاں ہیں۔ ہوائیوں نے ستاروں کو چھیڑنا شروع کیا۔ دیپک مہتاب نے چاند سورج کو چار چاند لگائے۔ غبارے سیاروں کا خاکا اُڑانے لگے۔ اناروں کے گُل فشاں نورانی پیڑ قائم ہیں۔ جوہی کے مُنہ سے مُسلسل پھُول جھڑ رہے ہیں۔

غرض اس ٹھاٹھ اور تیاری سے نظیر کی ساچق روانہ ہوئی۔ تماشائیوں کے چہرے خوشی کے نور سے چمکنے لگے۔ راہ دیکھنے والی آنکھیں راہ کی طرح روشن ہوئیں۔ ہرچند برات نوری دروازے سے کہیں دُور جا پہنچی ہے، پھر بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ ابھی نوری دروازے سے باہر نہیں نکلی۔ نوری دروازہ ساتھ ہے اور شاید خان عالم کے باغ میں اس کا بھی ملکوں کی گلی سے بیاہ ہونے والا ہے —— خدا راس لائے۔

ملکوں کی گلی میں احدی صاحب کی ڈیوڑھی کے متصل تماشائیوں کے دل کچھ خاص کیفیت سے رنگے ہوئے ہیں ان کی نگاہیں سرسری طور پر روشن نہیں ہوتیں۔ ان کی آنکھوں سے دل جھانک رہے ہیں اور انہی کھڑکیوں سے آرزوؤں کے قافلے

---

[1] ساچق —— رسم حنابندی۔ (م)

کے قافلہ نکلا چلا آتا ہے۔

کچھ مُلّا اور واعظ کا گھر تو تھا نہیں کہ احتیاط کی جاتی۔ خاصی طرح کڑھاؤ چڑھایا گیا۔ اصلی یا بُھنی ہوئی سواسینوں نے ایک ایک گُلگُلا اپنے ہاتھ سے چھوڑا۔ آٹے اور گُڑ کے ساتھ اپنا اپنا تیگ لیا۔ ساتھ کے ساتھ بیر اُشنوں نے اللہ میاں کی سلامتی پڑھی۔ اللہ میاں کے گیت سُنائے۔ پھر ایک کوری مٹکی آئی۔ شربت نے پیٹ بھر اس کی پیاس بجھائی۔ صندل نے منہ پر گلاب چھڑکا۔ ایک کلاوہ بندھی ہوئی بندھنی سہرا لٹکا کر سرتاج ہوئی۔ بندھنی کی ٹونٹی کے منہ میں سلامتی سے ایک پان کا بیڑا ابھی دبا ہوا ہے۔ اللہ میاں کی سنجیری جو سُنا ہو وہ یہی ہے۔ گلگلے نہیں معلوم کس بات پر منہ پھلاتے تھے۔ اللہ میاں کے رحم کو جوش آیا۔ چاول پسے اور مصری سے شیر و شکر ہوئے۔ گو اس لیپ سے گالوں کا ورم دفع نہیں ہوا، مگر پیشانی پر رضامندی کی چمک ضرور ہے۔ اینما تولوا فثم وجہ اللہ کی تفسیر طباق کی محراب میں آٹے کا مصلیٰ بچھاتے ہوئے اللہ میاں کی چومکھ بیان کر رہی ہے۔ جس کی چرب زبانی اور روشن بیانی ابین من الامس و اظہر من الشمس ہے۔ خوش عقیدہ سہاگنیں غش ہیں۔ اگر مثنوی شریف کی وہ شبان والی حکایت ٹھیک ہے تو ید بیضا کا چراغ یہاں بھی نہیں جل سکتا۔ خوش عقیدگی نے آنکھوں سے نیند کو اُڑایا ہے۔ نیک بختیں ہنسی خوشی جاگ رہی ہیں۔ بھینی بھینی رات ان کی مشک بو چوٹیوں اور معطر جوڑوں سے جاڑوں میں ہار سنگار کے جنگل کی چھاؤں ہو رہی ہے۔ لیجیے اب تو رکا تڑکا ہوا۔ چراغ جھلملا جھلملا کر رُخصت چاہتے ہیں۔ ستاروں کی انجمن بھی بکھرا ہی چاہتی ہے۔ حسینوں کے مُنہ چاند ہیں، مگر صبح کے چاند کی طرح پھیکے اور ماند۔ شب بیداری رنگ لا رہی ہے۔ کیا ہوا رنگ لاتی ہے تو لانے دو۔ کیا ایسے جاگتے نصیب روز آتے ہیں۔ مُلّا صاحب باہر انتظار میں گھبرا رہے ہیں۔ کوئی نیک بخت ہو تو ان کو بُلا لائے۔ نیاز کی چیزیں سب تیار ہیں۔ آئیں اور اللہ میاں کی سلامتی کی نیاز دیں جائیں۔ لیجیے مُلّا صاحب بھی آ ہی گئے۔ برزخ مبارک قابلِ دید ہے۔ کیا ہی عقیدت سے ہاتھ پھیلائے ہوئے زیرِ لب بڑ بڑا رہے ہیں۔ اپنا رنگ جمانے کے لیے خواہ مخواہ بھی دیر لگا رہے ہیں۔ اجی حضرت، کہیں جلدی اُٹھو بھی۔ اب تو عورتیں بھی گھبرا اُٹھیں۔ بڑے تقاضوں سے یہ فتنہ اُٹھا تو سہی مگر کچھ لے کر اُٹھا۔ چراغی کا دینا تو شاید ناگوار نہ گزرا ہوگا، مگر نہیں معلوم کیوں چلتے وقت

حضرت پر گالیوں کی بوچھاڑ خوب ہوئی۔

صبح سے دوپہر تک کچھ بہت زیادہ عرصہ نہ تھا، باتوں ہی باتوں میں گزر گیا۔ اب بی بی کے کھانے کی تیاری شروع ہوئی۔ چودہ طباقوں میں کھانا نکالا گیا۔ کورے برتن، سفید خشکہ، صاف دہی، شفاف شکر، شیریں میوہ، خوشبودار، غرض ہر چیز سے پاک دامنی آشکار۔ بیوی زنین جن کے حسب نسب میں کسی طرح کا فرق نہیں، جن کے چال چلن میں کسی قسم کا نقص نہیں، جن کے اخلاق بالکل شریفانہ، جن کی وفاداری و اطاعت ضرب المثل ـــ حضرت بی بی کے ہاف روزے سے مُنہ کو نورانی کیے ہوئے خراماں خراماں آ رہی ہیں ـــ پیغمبر صاحب اور پیروں کے چار طباق الگ کیے گئے۔ بی بی کی صحنکیں ان نیک بختوں کے آگے رکھی گئیں۔ پہلے سنجیری کے شربت سے سبھوں نے روزہ کھولا، پھر کھانے میں شریک ہوئیں۔ کھانے کے بعد سُرمہ، مہندی، عطر کی باری آئی۔ مہندی کچھ تو ہاتھوں میں رچی۔ جو ہاتھوں سے بچی وہ گھل کر اور طرح کام آئی۔ سادہ دلی رنگ لائی۔ بی بی کا کھانا ہو اور بی بی کے گیت نہ گائے جائیں، کوئی کہنے کی بات ہے۔ عقیدت کی آوازیں بلند ہیں۔ سنیں تو زہرہ بھی ریجھ جائے، مگر آنے کی اجازت ہی نہیں۔

لوگوں کو یاد ہوگا، دُلہن کے جوڑے کے ساتھ ساچق کے روز سوہے کے نام سے گیارہ گز سُرخ کپڑا بھی آیا تھا۔ اس کپڑے کا نصف گز پہلے دُلہن کے گھر کی بی بی زنوں میں تقسیم ہو کر گزوں سرخروئی حاصل کرتا ہے۔ مبارک وہ چوٹیاں جن میں اس کا موباف ہو۔ پھر باقی کتر بیونت کر وہی بیوی زنین اسی وقت دُلہن کا سوہا جوڑا سیتی ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ منقش شیشے جو ساچق کے دن سے نسبت کو بغل میں دبائے بیٹھے ہیں۔ کھُلتے ہیں اور ایک ہی غوطے میں دُلہن کے جوڑے کو بسنتی کر دیتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے برات کی رات بھی آ ہی پہنچی۔ نظیر تو ساچق ہی کے دن سے سُسرال میں براج رہے ہیں۔ چڑھاوا تو چڑھایا جا چکا ہے اب برات کے جوڑے پر نظر ہے۔ جوڑے کی تفصیل تو مجھے معلوم نہیں مگر اب دیکھتا ہوں کہ جوڑے کی کشتی ایک مکلّف خان پوش سے ڈھکی ہوئی آ رہی ہے۔ آگے آگے میراثینوں کا جھرمٹ

ہے۔ ٹونیں دل موہ لے رہے ہیں۔ دُلہن کے مُنہ سے کچھ اس طرح کے میٹھے بول سُنائی دے رہے ہیں۔

ہریالے بنے لاڈے پر میں ایسا ٹونا بناؤں گی
جب دیکھے مُکھ میرا ہی دیکھے میں تو سنگ لگئے پھروں گی

برات کا جوڑا جا چکا تو دُلہن کے والد بزرگوار اندر سے بُلائے گئے۔ ہر چند ان کے دل میں بیٹی کی جُدائی کے خیالات تلاطم پیدا کر رہے ہیں، مگر مصنوعی استقلال رومال سے گردِ ملال چہرے سے دور کرتا جاتا ہے۔ پیاری بیٹی کی صورت دیکھ کر استقلال کی گرفت سُست ہو جاتی ہے اور رومال ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ دِل اُمنڈ آتا ہے اور آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ہر چند گلے میں رقّت سے پھندے پڑے ہوئے ہیں مگر ایک ضروری فرض سر سے اُتارنا ہے۔ چپ کیوں کر رہیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہاتھ پر روپے اور پینڈیاں رکھیں اور لرزتی ہوئی آواز سے یہ فقرہ آویزہ گوش کیا۔

اے لڑکی لے آج میں تیرے فرض سے ادا ہوا۔

قیامت کا فقرہ تھا اس کے سُننے کے بعد کسی کو یارائے ضبط نہ رہا۔ گرد و پیش جتنے تھے سب رو رہے تھے سباپ بیٹی کے رونے کو پھر کیا پوچھتے ہو۔ سچ تو یہ ہے بقول شاہ نصیر

یوں نہ برستے دیکھیں ہوں گے مل کے کسی نے ساون بھادوں

عین خوشی میں یہ منظرِ رقّت شاید بعض طبیعت کو کسی قدر بے موقع معلوم ہو۔ مگر فطرتِ انسانی یوں ہی ہے اور اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

اِدھر تو یہ سماں تھا اُدھر نوشہ اور نوشہ کون ؟ میاں نظیر نہا دھو کپڑے بدل، اچھے خاصے دُولہا بن باہر تشریف لائے طوائفوں نے شادیانے کی دُھن میں سہرا گانا شروع کیا۔ گانا ہو ہی رہا تھا کہ مجتہد صاحب کے قدوم میمنت لزوم کی دُھوم مچی۔

تنہا نہیں ہوں یار و بانالہ و فغاں ہوں

مجتہد صاحب کے ساتھ شاہدین[1] بالغین حُریں بھی تشریف رکھتے ہیں۔ ہر چند مجتہد

---

[1] شاہدین بالغین حُریں ــــ وہ گواہ جو بالغ ہوں اور غلام نہ ہوں۔ (م)

صاحب کی شان میں کوئی کلمہ عرض کرنا سوءِ ادب ہے مگر کچھ تو سمدھیانے کا تعلق کچھ حضرت کا برزخِ مُبارک بے چین کیے دیتا ہے اور بے ساختہ پھبتی کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اب چاہے سوءِ ادب ہو چاہے استخفافِ مذہب، آئی پر چوکنا اپنے مذہب میں تو روا نہیں۔ سفید داڑھی اور نیلی پگڑی، معلوم ہوتا ہے چرخِ پیر نے رات کی پُرانی ساڑی سر سے لپیٹ لی ہے۔ آنکھیں زہرہ مشتری کی طرح چمک نہیں رہیں بلکہ ٹوٹی فلک سے قاضی چرخ کی آنکھیں لڑ رہی ہیں۔ گو ماند ہے، پھر بھی پیشانی تیسویں چوبیسویں کا چاند ہے۔ شک ہو تو یقین کے لیے گھٹے کی جھائیاں موجود ــــ داڑھی چاہے زقن سے حوضِ ناف تک کہکشاں کی طرح پھیلی ہوئی۔ دُم دار ستارے شرم کے مارے شاید اسی کنوے یا حوض میں ڈوب مرے۔ شدّتِ نزلہ سے ناک و لو سے گوش بہ گوش ڈوب کر دیکھیے تو تو بھی پانی ابھرتا نظر آئے۔ مونچھیں زہرِ تقویٰ میں بجھی ہوئی۔ شیرِ گردوں کی مونچھیں اکھاڑ رہی ہیں۔ بھنویں وہ زہر کی گانٹھ کہ عقربِ فلک کو پڑی ڈنک مار رہی ہیں۔

شمائل شریف کے بیان میں اس سے زیادہ موشگافی مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ بعضوں کو تو اتنی بھی زہر معلوم دی ہوگی لیکن شادی کا موقعہ ہے امّید ہے شربت کے گھونٹ کی طرح پی جائیں گے۔

آتے کے ساتھ پہلے تو سَر نمبر[1] بھاری بھرکم آواز سے سلام علیکم کا گونجتا گرجتا فقرہ سُنائی دیا۔ پھر اور قرآتیں چھٹنے لگیں۔ حروفِ حلقی کے بلغم در جلو مخارج نے سامع کا اُگلدان بھر دیا۔ قرآت کے گھن گرج لب و لہجہ نے کانوں کے حوض پر مینڈکوں کی سبزی منڈی قائم کر دی۔ حاضرینِ مجلس کی نگاہیں اس پر بھی مجتہد صاحب کے لبوں پر جمی ہوئی ہیں۔ گویا نگاہوں نے کانوں کے لیے ٹیلی فون کا تار باندھا ہے۔ لفظ لفظ توجّہ سے سُن رہے ہیں۔ اور اصل مقصود کا اصل خیر سے انتظار ہے۔ اتنے میں تہوّرانسار کا پیارا لفظ سُنائی دیا پھر نسبت محمد رحمان چغتائی، پھر اور مراتب۔ وکیل، بالنکاح، شاہدین، عادلین، بالغین، حسترین لاکھ، روپیہ، سکّہ، رائج الوقت، دینار سُرخ انتظار سماعت اب اعلا درجہ اشتیاق کو پہنچا ہوا ہے ــــ مجتہد صاحب نظیر سے دُوبدُو ہیں اور نظیر شرماتی ہوئی ترچھی نگاہوں سے ان کی طرف مخاطب کہ اتنے میں یہ زبردست

---

[1] سر نمبر ــ ابتدا۔ (م)

فقرہ سُننے میں آیا۔

انکھنک، بھو کتے بالصداق المعلوم

نظیر نے اس کے جواب میں کیا کہا معلوم نہیں۔ مگر دیکھا کر چاروں طرف سے مبارک باشد مبارک باشد کا غُل ہے اور ہر طرف چھوہارے لُٹ رہے ہیں۔

خرما اور ثواب جب لوگ لُوٹ چکے تو برات کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ کُل سامان وہی تھے جو ساچق میں بیان ہوئے نہ تھا تو ایک سہاگ پڑا ـــــ ہاں کچھ روشنی اور آتش بازی بھی زیادہ تھی۔ غرض باجے گاجے کے ساتھ برات نکلی اور گشت لگا کر بڑی رونق وخوبی سے دروازے لگی۔ دُلہن کے غُسل کا پانی نظیر کے گھوڑے کے نیچے ڈالا گیا، تڑا تڑ بھات کے گیند پڑے۔ سوار اور گھوڑا دونوں جھجکے۔ آس پاس پھلجھڑی سی چھُٹ گئی۔

اب نظیر نے پرستان میں پاؤں رکھا۔ دیوؤں نے اس کا پیچھا چھوڑا۔ پریاں اس کے ساتھ ہوئیں۔ گو نگاہ کو آزادی نہیں ہے مگر گھم گھمی بتاتی ہے کہ گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ ہر عمر کی نیک بختیں شوق کی گھبراہٹ میں بے حجابانہ نکل آئیں ہیں۔ گو نظیر ان کو دیکھتا نہیں مگر اپنی نسبت ان کی رائیں سُنتا ہے۔ گوشۂ چشم کسی قدر دیکھنے میں بھی مدد دیتے ہوں تو عجب نہیں۔ بہرحال اسی ہجوم فرحت لزوم کے ساتھ نظیر خراماں خراماں وسطِ صحن میں پہنچا۔ شامیانے کے نیچے تخت بچھا تھا۔ اس پر زرّیں جوتی کے ساتھ، مُنہ پر رنگین رومال رکھے ہوئے چڑھا۔ میراثن نے آن کر گلے میں کُلاوہ ڈالا اور ٹونے گانے شروع کیے۔ نظیر آخر شاعر تھا فوراً اس کا ذہن اس شعر کی طرف منتقل ہوا۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اُوست

ٹونوں کا ٹوٹکا ختم ہوا تو پہلے لَو میں سہاگا لگایا گیا۔ پھر کانوں میں پڑھ کر کسی نے یہ پھونکا۔

سونے میں سہاگا موتی میں دھاگا بنّے کا بنّی سے جی لاگا

سہاگے کے ساتھ پس پُشت ہینگ بھی سُلگ رہی تھی اور جادو کی مدہوش کرنے والی

خوشبو پھیلا رہی تھی۔ اُدھر دُلہن کے ہاتھ میں شکر رکھی گئی۔ خبر نہیں کچھ بیچ بھی ملے تھے یا نہیں، اُدھر بتاشوں سے شربت تیار ہوا اور کٹورے میں بھر کر نظیر کے سامنے آیا۔ ٹوٹکے سے کوئی بات خالی نہیں۔ یہاں شربت میں بھی دُلہن کے پہننے کی نتھ پڑی ہوئی تھی ـــــ رسم کے مُطابق آدھا شربت نظیر نے پیا آدھا دُلہن نے نوشِ جان فرمایا۔

ان رسوم کے بعد نظیر کو چار بجے تک آرام کرنے کی مہلت ملی۔ لیکن اس کے قلب کو آرام نہ تھا۔ خیالات میں اس کے ایک عجب تلاطم تھا اور یہ طوفان اُٹھایا ہوا تھا۔ شوق اور انتظار کا۔ یہ مہلت اس نے کس قدر گھڑیاں اور کڑیاں گن گن کر کاٹی، میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر جب ریت رسم کی دُھوم مچی تو عورتوں کو تو یہی کہتے سُنا کہ ابھی پوری طرح کمر بھی سیدھی نہ کی تھی کہ لو وقت آ گیا۔

میاں نظیر بھی پکڑے ہوئے گھر تشریف لائے اور ریت رسم کے سامان پہلے سات سہاگنوں نے مل کر سہاگ پُڑے کو کھولا اور اس کے اندر سے بالچھڑ، کپور، کچری، وغیرہ خوشبو چیزیں نکال نظیر کے آگے رکھیں۔ پھر چُپکے کے ساتھ بٹنا آیا۔ اب چاروں طرف سے فرمائش ہے کہ بیٹھ کر پی لو۔ جوانیں مُسکرا رہی ہیں۔ بڑی بوڑھیاں دل سے تقاضہ کر رہی ہیں۔ میراثنوں کے آگے ایک شربت کا کٹورا ہے جس میں سُرخ نگینے کی انگوٹھی پڑی ہوئی ہے۔ نظیر ابھی سروج پیش نہیں جُھکے کہ سالیوں نے آن کر آنکھوں میں سُرمہ لگایا۔ یہ سُرمہ نہ تھا جو تیوں کا پارا ہوا کاجل تھا۔

چشمِ ما روشن و دلِ ما شاد

اس سے زیادہ یہ ہوا کہ جو اُبٹنا دُلہن کے ملا جا چُکا تھا اس کے آٹھ چراغ بن کر آئے۔ چراغ کے جلو میں ایک شیر صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ تمام بدن پر کوڑیوں کے نقش و نگار، چھاج کے کٹھرے میں بند ہیں اور آٹھوں چراغ روشن۔ نظیر کہتا نہ تھا مگر اس سے زبردستی کہلوایا گیا۔

میں بھیڑ اور یہ شیر۔ میں بھیڑ اور یہ شیر

نظیر کی ماں نے اس ڈر سے کہ شیر کہیں ان کی بھیڑ کو کھا نہ جائے جلدی سے اس کا مُنہ بھرا اور

دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

کہہ کر قصّہ پاک کیا۔

نظیر کی پیری :۔

ناظرین نظیر کے لڑکپن اور جوانی کے تماشے تو دیکھ چکے اب ذرا اس کے بڑھاپے کی سیر بھی دیکھ لیں۔ نظیر لڑکا تھا جب بھی نظیر ہی تھا اور جوان تھا جب بھی نظیر ہی رہا۔ مگر وہ نظیر جس کی دُنیا میں اس قدر شہرت ہے، نہ لڑکا نظیر تھا نہ جوان بلکہ بوڑھا۔ ع

کہ کار آزمودہ است گرگِ کہن

نظیر کے لڑکپن اور جوانی کی تصویریں جو کھینچی گئی ہیں ان میں زیادہ تر خط و خال تخیل کے ہیں اس لیے کہ کوئی آدمی مجھے ایسا نہیں ملا جس نے کہا ہو کہ میں نے نظیر کو لڑکا یا جوان دیکھا ہے لیکن اس کو بوڑھا دیکھنے والے اب بھی کچھ لوگ دُنیا میں موجود ہیں۔ لڑکپن میں انھوں نے اسے بوڑھا دیکھا تھا اور شانِ خدا یہ ہے کہ اب لڑکے جوان سب خود انھیں بوڑھا دیکھ رہے ہیں۔

اس خصوص میں نظیر کی نواسی سے بڑھ کر شہادت کس کی ہو گی۔ جب نظیر مرے ہیں ان کی عُمر نواسی برس کی تھی۔ چونکہ اس عُمر میں آنکھوں کے شیشے بہت مجلّیٰ رہتے ہیں اور مشاہدے کا فوکس نہایت ٹھیک، لہٰذا ہم کو ان کے حافظے کے کیمرے میں نظیر کے بڑھاپے کا ایک عُمدہ نگیٹو مل گیا ہے، جس سے ہم ایک عُمدہ پازیٹو نہایت اعلا درجے کی پالش کے ساتھ تیار کر کے پیش کرتے ہیں۔ یقین ہے اس قسم کی نادر فوٹوگرافی کے قدر دان، سرآنکھوں سے اس کی خریداری فرمائیں گے اور دل ہی کے فریم میں جگہ دیں گے۔ اگر اس وقت میاں نظیر زندہ ہوتے اور اُن سے کہا جاتا کہ میاں صاحب چلیے ذرا چل کر تصویر کھنچوا لیجیے، تو انھیں پہلے تو اس کا یقین نہ آتا کہ پھر اگر یقین بھی آتا تو وہ گھڑیوں ٹالتے کہ میں بوڑھا ہو کر کیا تصویر کھنچواؤں گا۔ پھر اپنی نیک مزاجی سے راضی ہوتے تو بے تکلفی سے کہتے آؤ یوں ہی کھینچ لو۔ تیاری کو کہا جاتا تو گھنٹوں میں کہیں جا کر تیار ہوتے۔ لوگ کہتے تصویر کے لیے یہ رنگ موزوں نہیں۔ وہ کہتے مجھے اس رنگ کے سوا عادت نہیں۔ سیاہ غلاف

وضع ہے۔ وہ کہتے ہیں اس وقت گھوڑے پر نہیں بیٹھنا۔ لوگ کہتے آپ کی تصویر ہو تو ٹٹو ہی پر ہو۔ خلاصہ یہ کہ خدا جانے کیا کیا دِقتیں پیش آئیں اور اس پر بھی تصویر ان کی یا لوگوں کی پسند کے موافق ہوتی یا نہ ہوتی۔ اس وقت جس طرح چاہو ان کی تصویر کھینچ لے سکتے ہو، نہ انھیں تکلیف نہ تمھیں تکلّف۔

لیجیے میاں نظیرؔ تصویر کھنچوانے کو تشریف لیے آتے ہیں۔ ماشاءاللہ میانہ قد ہے۔ کُل طویلٌ احمق کے مینا حُمق سے دُور۔ کُل قصیرٍ فتنہ کے قصرِ فتنہ و فساد سے الگ۔ بدن اچھا تیار ہے سینہ چوڑا اور کیوں نہ ہو۔ کثرت کی عادت ہے۔ گو بُڑھاپے میں کسی قدر اس کثرت میں قِلّت آگئی ہے مگر پھر بھی دیوار کا پیچھا نہیں چُھٹا۔ گھر کے در و دیوار اُس کے گواہ ہیں۔ بُوڑھے کے دم خم کو اب کیا دیکھتے ہو، مگر ہاں کبھی ہو گا۔ مٹے ہوؤں کا نشانِ مزار باقی ہے ـــــ دیکھنا ہے تو اُس بلا کے ذہین اور خوش قیافہ چہرے کو دیکھو جس کی شکن شکن میں فکر رسا بسی ہوئی ہے۔ اور جس کے ہر بلند و پست سے نشیب و فراز دُنیا کا تجربہ ٹپک رہا ہے۔ صبحِ پیری کا سُہانا سماں ہے شگفتہ مزاجی سے کلیاں چٹک رہی ہیں اور خوشبو سے گلشن مہک رہا ہے۔ جبین جس پر غور و فکر کے قدر انداز نے ایک خاص شان سے بھنوؤں کی نقرئی کمانی کھینچ رکھی ہیں ـــــ دونوں کمانوں کے بیچ میں یکشادہ پیشانی مسے کا گلّے تل کھڑی ہے۔ گلّہ ہے یا ذوقؔ کے دل کا قائم مقام جہاں وہ کہتا ہے ؎

کیا کروں ان ابروئے پیوستہ کے دل بس میں ہے
ایک طُعمہ مچھلیاں دو کش مکش آپس میں ہے

یہ مسّہ کچھ ذہنی جانب دبا ہوا ہے۔ غور سے دیکھا تو رنگت اس کی کسی قدر مائل بہ سُرخی ہے۔ پیشانی سے نیچے اُتریے تو بھنوؤں کی محراب میں آنکھیں اثرِ پیری سے وقفِ عبادت ہیں۔ دیکھنے میں مچھوئی ہیں اور پتلیاں سیاہ۔ کان سرگوشی کر رہے ہیں کہ لو ہمیں نہیں دیکھتے۔ حال آں کہ نظیرؔ کے خبر رساں ہمیں ہیں۔ لاؤ صاحب تمھیں بھی دیکھ لیں، ہیں تو بڑے بڑے اور لو اُوپر سے ایک ہلکی بالوں کی جھالر بھی رکھتے ہیں جو بُڑھاپے کی ہوا میں خوشنما اُڑ رہی ہے۔

خوش بو کے قنّوج میں ناک بھی کچھ عطر فروشی کر رہی ہے۔ ذرا اس کا کٹر بھی

ملاحظہ کیجیے۔ ستواں ہے اور متوسط درجے کی نہ موٹی نہ پتلی معشوق ناک جنھوں نے ہمیشہ یہ کرا اس صفت سے ان کی ناک پر کوئی مکھی نہیں بیٹھتی۔

لیجیے اب مونچھوں کی سرحد آگئی۔ لو یہ تو حدِ شرع سے متجاوز ہیں۔ خاصی گرفت کے قابل۔ انہی کے زیرِ سایہ گویائی کے دو خوش نما چلتے پُرزے بھی ہیں جن کو ایک جانب سے دیکھیے تو لب ہیں اور دوسری جانب سے دیکھیے تو بُلبُل اور بُلبُل بھی کون ہزار داستان، جس نے ایک نہیں سینکڑوں دفعہ طوطیِ دبستان سرا کے ہونٹ مَل مَل دیے ہیں۔

مونچھوں نے جواب کو نیچے خشخشی داڑھی ہے۔ اگر وہ بھنگ چھان رہی ہیں تو یہ بھی پوست گھول رہی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ چونکہ ان کا عُمر بھر کتابوں سے تعلق رہتا تھا اس لیے حکمت سے خدا نے انھیں چہرہ بھی کتابی ہی عنایت کیا۔

اس وقت چونکہ تیاری تصویر کی ہے لہٰذا سر پر ایک چکّر دار پگڑی بندھی ہوئی ہے (ڈپٹی تراب علی صاحب فرماتے ہیں کہ محمد شاہی کھڑکی دار پگڑی یہی ہے) کسی وقتِ خاص میں جب پگڑی اُتری ہوئی ہو تو تمھیں نظر آئے گا کہ چاند پر بال اُڑنے ہوئے ہیں، گویا دماغ کا چاند و بالِ کلفت سے پاک ہے۔ پگڑی تو دیکھ چکے —— گلے میں انگرکھے کے اُوپر سے دوپٹے کی قدیمانہ شان بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں پستولیہ یا کوئی اور مہین کپڑا کہاں؟ —— گاڑھے گزی کا انگرکھا ہے۔ سیدھا پردہ نیچی چولی۔ (ڈپٹی تراب علی بالا بر فرماتے ہیں) برکا پاجامہ۔ جاڑے نہیں ہیں ورنہ فرخ آباد کی چھینٹ کا چوغہ بھی دیکھتے۔ پاؤں میں گھتیلی جوتی ہے۔ یہ تکلف تصویر کی وجہ سے ہے ورنہ عموماً چمڑے کی جوتی چپڑواں کر کے پہنتے ہیں۔ ہاتھ میں آڑو کی چھڑی اور دو انگوٹھیاں عقیق سُرخ اور فیروزے کی اُنگلی میں پڑی۔

وضع میں تھوڑا بہت تغیر واقع ہو سکتا ہے مثلاً اگر ان کے دُرویشانہ اور آزادانہ خیالات کا جلوہ دیکھنا چاہو تو انھیں کمبل اوڑھا دو۔ انھیں اوڑھنے میں اصلاً تامّل نہ ہوگا، لیکن اصلی وضع ان کی یہی ہے جو بیان ہوئی۔ اسی وضع میں وہ لوگوں کے پاس جاتے تھے اور اسی وضع میں ان کے ارکانِ خاندان ان کو دکھانا پسند کرتے ہیں۔ فوٹوگرافی میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ کبھی سیدھا کھڑا کر کے تصویر کھینچتے ہیں۔

کبھی کرسی پر بیٹھا دیتے ہیں۔ کبھی میز سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ کبھی ہاتھ میں کوئی کتاب دے دی جاتی ہے۔ بعض اوقات کوئی سواری بھی ہوتی ہے، گھوڑا، بگھی، فٹن، لینڈو، ٹمٹم، بائیسکل ان دنوں بائیسکل کہاں۔ بگھی، فٹن، لینڈو بھی بمشکل کہیں ہوں گی ـــ ان مہذب کی سواریوں کی جگہ رکھتیں، بہلیں البتہ نظر آتی ہیں۔ سواریوں کی پوری لسٹ دیکھنی منظور ہو تو نظیرؔ کی وہ نظم دیکھ لیجیے جس کی ٹیپ کا شعر یہ ہے:

جب چار کاندھے پر ہوئیں بھاری سواریاں
جھک مارتی یہ رہ گئیں ساری سواریاں

کبھی سیر دریا کے شوق میں نظیرؔ رتھ میں بھی بیٹھے ہیں لیکن رتھ میں بٹھاتے ہو تو پوری میلے کی تصویر کھینچو ورنہ ان کو اپنے قدیم الخدمت ٹٹو ہی پر رہنے دو ـــ مگر خبردار ہاتھ میں کوڑا نہ دینا اور ذرا لگام بھی ڈھیلی ہی رکھنا، بلکہ تم تکلف کیوں کرو ان کو تاج گنج سے چلنے دو۔ پھر بیسوں موقع ایسے آپ سے آپ مل جائیں گے کہ تم بے تکلف ان کی بے اطلاع SPONTANEOUS تصویر ان کی کھینچ لے سکو گے۔ چلتے چلتے گھوڑا اڑ گیا۔ رک کر گھاس پر منہ ڈالا۔ ایاز پیچھے ہے۔ نظیرؔ کو اس کا انتظار ہے۔ لو اب ایاز آگیا۔ لگام پکڑ کر گھوڑے کو آگے بڑھاتا ہے۔ بس تصویر کھینچ لو۔ شہر کی سرحد آگئی ہے۔ لوگ دورویہ سلام کر رہے ہیں۔ نظیرؔ کے دونوں ہاتھ بلند ہیں۔ بس تصویر کھینچ لو۔ کوئی صاحب گھوڑے کے پاس آن کھڑے ہوئے ہیں۔ باتیں ہو رہی ہیں۔ بس تصویر کھینچ لو۔ کتاب کے ساتھ اگر تصویر کھینچنی منظور ہے تو ہاتھ میں وہی قلمی نسخہ دے دو۔ جس کی نسبت لوگ بتاتے ہیں کہ انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ جلد بھی مختصر ہے اور اور انگریزی نما۔ اب جی چاہے کھول دو یا بند ہی رہنے دو۔ وہ نہ ملے تو انشائے مادھورام سہی۔ وہ بھی انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ کبھی کبھی گروپ بھی کھنچواتے ہیں۔ سب سے بہتر گروپ وہ ہوگا جس میں تمام اراکین خاندان مع خدام و عبید شریک ہوں۔ اولادوں کی جماعت کو آگے بڑھایئے۔ خلیفہ گلزار علی داہنی طرف ہوں اور میر نجف علی عرف مرزا جان میاں نظیرؔ کے داماد بائیں طرف۔ غلاموں کی صف پیچھے ہو مگر خدا بخش مرزا جان کے قریب رہیں کہ ان کی بیوی کو جہیز میں ملے ہیں۔ اور اب انہی کے کہلاتے ہیں۔ امام بخش خلیفہ گلزار علی کے قریب رہیں ایاز اپنے ٹٹو کو

لے کر دہنے بائیں کسی طرف کھڑے ہو جائیں۔ دولت نظیر کے پیچھے کھڑے کر دیے جائیں لیکن ان کی ٹوپی پر یہ مصرعہ ضرور کڑھا ہوا ہو۔

دولت کی یہی خوبی ہے سو نعمتیں کھا ڈال

کم بخت لونڈیاں کہتی ہیں کہ جب غلاموں کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو ہماری کیوں نہ کھینچی جائے۔ کھینچی تو جائے مگر تمھارا گروپ تمھاری بیویوں کے بغیر ٹھیک کیوں کر ہو سکتا ہے پہلے تو ان کو تو راضی کر و۔ لیجیے وہ بھی راضی ہو گئیں۔ بیچ میں نظیر کی بیوی تہورانسا بیگم تشریف رکھتی ہیں ان کی داہنی طرف ان کی صاجزادی امامی بیگم ہیں اور بائیں طرف ان کی کم عمر نواسی ولایتی بیگم جن کو پیار سے گھر بھر بیگم جان کہہ کر پکارتا ہے ـــــ ان کے پیچھے اپنے اپنے قرینے سے یہ چار لونڈیاں ہیں گلاب، بختاور، چندو، نجیبن، گلاب کا قیافہ کچھ مرہٹنوں سے ملتا ہے آخر اس کا سبب ؟ اجی یہ قوم کی مرہٹن ہے۔ مرہٹے کی قوم میں اس کا گلابو نام تھا۔ بنیے کے بارہ روپے اس پر آتے تھے ـــــ وہی بارہ روپے کو خریدی گئی۔ یوں بنیے کی قرض سے الگ سبکدوش ہوئی۔ زیورِ اسلام سے جداگانہ آراستہ ہوئی۔ گلابو میں ہندوپن کی بو تھی اس کو گلاب کے چھینٹوں سے دور کیا گیا۔ آدمی بوڑھا ہوتا ہے تو یکایک تو بوڑھا ہو نہیں جاتا۔ اس کے بھی مدارج ہیں۔ لیکن جن کے قویٰ اچھے ہوتے ہیں ان کا تنزل خود ان کو تو کیا دوسروں کو بھی کم محسوس ہوتا ہے۔ نظیر چونکہ اچھی صحت کا آدمی تھا اس لیے اس کو انحطاطِ قویٰ کا احساس بہت کم ہوا۔ وہ جہاں کہیں بوڑھوں کی زبان سے تعلّی کرتا ہے وہ بہت کچھ اس پردے میں اپنے خیالات اندرونی کا اظہار کرتا ہے۔ باوجود کر اس کی عمر قریب سو برس کے پہنچ چکی تھی مگر پھر بھی وہ عینک کا کبھی محتاج نہ ہوا۔ یا وہ چلتا تھا تو چھڑی ہاتھ میں رکھتا تھا مگر اس کا کچھ دست نگر نہ تھا۔ یہ بھی بڑھاپے کا ایک فیشن تھا۔ البتہ اُٹھتے بیٹھتے اس کو کسی قدر مشقت ہوتی تھی اور اس مشقت میں ان فقروں سے خدائے توانا سے استمداد کرتا تھا یا مفضّل بیہمال۔ یا عاجز نواز، یا غریب نواز، عموماً لوگ ایسے موقع پر یا علی کہتے ہیں۔ نظیر ہر چند شیعہ تھا مگر اس کا یا علی کے عوض ان فقروں سے کام لینا اس کی خوش عقیدگی اور موحدانہ خدا پرستی کی کافی دلیل ہے۔

سو برس کی عُمر تک کسی انسان کا پہنچنا انسان کی عُمدہ صحت اور معتدل کلیانہ زندگی کا خود کافی ثبوت ہے۔ لیکن اس ثبوت کو اس سے اور تقویت ہوتی ہے کہ اس طول عُمر کے ساتھ نظیر پر اخیر عُمر میں جب فالج کا مادہ گرا تو اس کے صدمے سے بھی اُنھوں نے کسی طرح جاں بری حاصل کی اور پانچ برس اس کے بعد بھی زندہ رہے۔ ان کی نواسی تو ان کی جاں بری کو اس امر پر محمول کرتی تھیں کہ فالج دہنی طرف پڑا تھا۔ لیکن میں تو ان کے عُمدہ قویٰ کی طرف اس کو منسوب کرتا ہوں۔

بعض اشخاص نے تو یہ بھی بیان کیا کہ حقیقت میں ان کو فالج سے صحتِ کُلّی ہو گئی تھی، لیکن اس خیال سے کہ لوگ زیادہ ستائیں نہیں انھوں نے شہرت دے رکھی تھی کہ وہ شکایت ابھی تک کچھ نہ کچھ چلی ہی جاتی ہے۔

مدارج عُمر کے تغیّرات سے انسان کے خیالات بھی بدلتے جاتے ہیں لیکن یہ تغیّرات بالکل دفعتہً نہیں آتے۔ ان کے زندہ عزیز بیان کرتے ہیں کہ یہ میلے ٹھیلے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ یہ ہمیں بھی تسلیم ہے۔ لیکن اس سے ایسا نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کبھی شریک ہی نہیں ہوئے۔ ان کی تحریریں بکثرت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اس قسم کی احتیاط اوائل میں کبھی مرعی نہیں رکھی۔ البتّہ اخیر عُمر میں جبکہ اتقاد پرہیزگاری کے خیالات بڑھنے لگے تو اس قسم کی احتیاط بہ تقاضائے عُمر بلا قصد بھی ان سے عمل میں آتی ہوگی۔ جب فالج نے پاؤں توڑ کر گھر میں بٹھا دیا اس وقت تو زیادہ تر

عصمت بی بی ستِ از بے چادری

کی راہ سے پرہیزگاری ہوگی۔

اخیر عُمر کی احتیاطوں میں لوگ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر شاذ و نادر طوائف کا کپڑا کپڑے سے مس ہوتا تو اس کو ظاہر کراتے تھے۔ ایسی صورت میں وہ رقص و سرود کیا دیکھتے لیکن بزم عیش میں وہ اکثر ہمیں نازنینوں سے پہلو بہ پہلو ملے۔ طرز تقریر بھی اس باب میں ساکت نہیں۔

ان کی اخیر عُمر کی احتیاط میں ایک بات یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ بمضمونِ فلیضحکوا قلیلاً و لیبکوا کثیراً اگر ہنستے تھے تو مُسکراہٹ سے ہنستے تھے۔

زور سے نہیں ہنستے تھے۔ اور بخیال ان انکر الاصوات لصوت الحمیر باتیں کہتے تھے تو نہایت آہستگی سے متوسط اور ملائم آواز میں۔

عادتیں بھی جوان کی بیان کی جاتی ہیں بالکل ثقہ لوگوں کی سی ہیں۔ ناس کبھی نہیں لیتے تھے۔ کوئی نشہ نہیں پیا۔ نہ افیون کھائی۔ صرف حقہ پیتے تھے اور کثرت سے پیتے۔ نظیر کی نواسی نے کہا سُلفہ پیتے تھے۔ بہادر علی صاحب لوا فرماتے ہیں، جست کی گڑگڑی ہی میں نہ سلفا بلکہ تواکیا بھروا کر۔ شاید اس سے فکر سخن میں مدد ملتی ہو۔ پان کبھی کھالیا تو کھالیا ورنہ عادت نہ تھی۔ منہ میں دو ہی تو ڈاڑھیں باقی رہ گئی تھیں۔ پس مستانہ نظموں سے نشہ خواری کا مضمون جو ناشی ہوتا ہے، وہ یا تو عالم جوانی سے متعلق ہوگا یا محض نقش ونگار ورق الخیال ہے۔

عبادت کی طرف بھی طبعیت کا جس عنوان سے میلان ہے اس سے کسی فسق و فجور کا کسی زمانے میں گمان نہیں ہو سکتا ہے۔ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، رمضان شریف آتے ہیں تو روزے بھی رکھتے ہیں اور جب تک خوب طرح تاریکی پھیل نہیں جاتی —— ہم سنیوں کی طرح گھبرا کر افطار بھی نہیں کرتے۔ عید۔ بقر عید میں نماز گھر میں پڑھتے تھے۔ سب عید ملنے کو آتے تھے۔ نماز روزے کے ساتھ قرآن بھی تلاوت کرتے تھے۔ آنکھوں میں مرتے دم تک روشنی تھی۔ کبھی عینک کی حاجت نہیں ہوئی۔ قرآن بھی بے عینک پڑھتے تھے بااین ہمہ ریوں کر تسبیح میں ایک طرح کا ریا تھا۔ اس لیے تسبیح کبھی ہاتھ میں نہ رکھی۔ چونکہ طریقہ امامیہ تھا اپنے مذہب کے مطابق تعزیہ داری بھی کرتے تھے۔ پچاس دن تک تعزیہ داری کرتے تھے۔

کھانے کو تو جوانی میں سب چیز کھاتے ہوں گے مگر بڑھاپے میں میٹھے چاول اور کھچڑی نہایت شوق سے کھاتے تھے اور بہت پسند کرتے تھے۔ گھی آدھ سیر روز کھاتے تھے۔ آچاروں میں لیموں کا آچار بہت پسند تھا۔ تیل کا آچار کبھی نہیں کھاتے۔ گلگلے اور چیلے بھی پسند کرتے تھے۔ پھلوں میں خربوزہ، آم، شریفہ، یہ چند پھل بہت مطبوع تھے۔

حالات نظیر کو خلاف توقع اس قدر طول ہوا کہ اب لوگ گھبرا گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو جلد سلسلہ ختم ہو۔ وقت طول میں ہے نہ اختصار میں، اگر

اختصار درکار ہے تو بسم اللہ ابھی لیجیے۔ فالج کا قصّہ تو آپ کو مکرّر سہ مکرّر معلوم ہی ہو چُکا ہے ـــــ اس مرض نے نظیرؔ کو خلافِ طبیعت، خلافِ عادت پانچ برس سے خانہ نشین کر دیا تھا۔ کہیں آتے جاتے نہ تھے۔ دن رات گھر ہی پڑے رہتے۔

بہت بڑا سفر یہ تھا کہ دالان سے صحن میں چلے آئے۔ صحن میں جانبِ شمال بیچ میں دو درخت نیم اور بیری کے لگے ہوئے تھے۔ یہ درخت اب بھی قائم ہیں جو ان کی قبر پہ سایہ کرتے ہیں۔ ان ہی درختوں کے سایہ میں بوریاں بچھا کر بیٹھ جاتے۔ مرزا نوازش علی کی روایت ہے کہ کبھی پلنگ پر نہیں بیٹھتے تھے۔

اکثر اہلِ اللہ سمجھ کر آزاد بینوا ان کو گھیرے رہتے۔ ان کے سوا کبھی کوئی صاحب مِلنے کو بھی آجاتے۔ یہ دو درخت گویا ان کے ڈرائنگ روم تھے۔ یہیں وہ زیادہ مِلتے۔ اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ انہی دو درختوں کے نیچے اُنھوں نے انتقال بھی کیا اور انہی کے نیچے دفن بھی ہیں۔ جہاں زندگی میں لوگوں سے مِلتے تھے وہیں بعد موت بھی لوگ اُن سے شرفِ زیارت حاصل کرتے ہیں۔

ان کی تجہیز تکفین کا جھگڑا اُوپر بتقاریب لکھا جا چُکا ہے۔ میاں نظیرؔ جب مر گئے تو ہندو شاگردوں نے چاہا کہ اپنے طور پر ان کی موت پر اظہارِ تاسف کریں۔ نظیرؔ کے خاندان کے لوگوں نے کچھ مخالفت کرنی چاہی تو ان ہندوؤں نے کہا اگر مخالفت کرو گے تو گرو نانک شاہ کا حال ہوگا۔ کہ نصف چادر مُسلمانوں نے دفن کی تھی اور نصف جلائی گئی تھی۔ اس تقریر پر وارثوں نے تعرّض چھوڑ دیا اور ان کو اپنے طور پر مرحوم نظیرؔ کی صلحِ کل کا خراج ادا کرنے دیا۔

جب نظیرؔ کا انتقال ہوا کئی ہزار آدمی ہندو مسلمان جمع تھے، چونکہ ان کا مذہب اثنا عشری تھا۔ بڑی دُھوم سے نمازِ جنازہ حسبِ مذہب اثنا عشری پڑھائی گئی مگر دو نمازیں ہوئیں جس قدر ان کے شاگرد اہلِ سُنت تھے اُنھوں نے الگ اپنا گروہ کر کے نماز پڑھی اور اُوپر کی چادر ان کی پارچہ پارچہ کر کے اہلِ ہنود لے گئے۔ نہیں معلوم ہندو شاگردوں نے پارچے رکھے، جلائے، کیا کیے۔

شاگردوں نے ان کی قبر سنگیں بنوائی۔ ہندو شاگردوں نے سوم کے دن مزار پر میلہ کیا۔ ناچ رنگ اور شیر خوانی ہوئی اور غلام رسول کی مسجد میں ان کے پھول ہوئے۔

میلا سال کے سال اب بھی ہوتا ہے۔

جب شاگردوں کا یہ جوش و خروش تھا تو یہ تو کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی موت کی تاریخیں نہ کہی ہوں گی۔ لیکن اب نہیں ملتیں۔ قبر گو پکی ہے لیکن لوحِ مزار کا کہیں پتہ نہیں ہوگی تو ضرور مگر امتدادِ زمانہ کی وجہ سے اب لوحِ طلسم کی طرح نظروں سے غائب ہے۔ میں نے اس کی تلاش صرف قطعہ تاریخ کے خیال سے کی۔ لوح تو نہ ملی مگر قطعہ تاریخ کے دو مصرعے ابتدا اور اخیر کے ہاتھ آگئے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ یہ مادہ تاریخ نظیر کے کسی شاگرد کا نکالا ہوا ہے اور اچھا ہے۔ اس میں صاف صاف شاہ عبدالعزیز کی تاریخ وفات کی جھلک پائی جاتی ہے جو مومن خاں نے 1239 ھ میں نظیر کی وفات سے کوئی سات برس پیشتر نکالی تھی۔

قطعہ تاریخ شروع یوں ہوتا ہے :۔

نظیر اکبر آبادی چو زیں دُنیائے ابتر شُد

اس کے بعد حسبِ معمول غالباً نظیر کے مواصفِ جمیلہ ہوں گے، منکسر متواضع، خاضع خاشع لطیفہ گو، بزلہ سنج، زندہ دل، مرنجامرنج، بحرِ فصاحت کے تیراک، بے ہمہ با ہمہ آزاد، بے باک وغیرہ وغیرہ۔ اور اس جان نواز ٹکورے کی تان ہاتف سروش، رضوان، روح القدس، لسان الغیب کے زمزموں سے مل کر آخر اس مصرعہ پر ٹوٹی ہے۔ مصرعہ تاریخی ہے۔

مخمس بے سروپا بیت بیدل فردِ بے سر شُد

یہ مادہ تاریخ مجھے بہ روایت منشی برج لال سے پہنچا ہے جو اکبر آباد کے باشندے اور قوم کے کھتری ہیں۔ یہ اپنے تئیں نظیر کا شاگرد بھی بتاتے ہیں۔ اس تاریخ سے 1246 ھ نکلتے ہیں۔ بیل صاحب جنھوں نے انگریزی میں ایشیائی شعراء کا مختصر تذکرہ لکھا ہے اس میں تاریخ وفات بدیں تفصیل درج ہے۔

روز دوشنبہ 26 رصفر 1242 ھ مطابق 16 راگست 1830ء۔ ڈپٹی تراب علی فرماتے ہیں کہ وہ 1243 ھ میں مرا۔ میر تقی مرحوم سے 22 ربرس بعد۔ وہ دوسرا جزو قریب قریب صحیح ہے مگر جزو اوّل غلط۔

نظیر کے اخلاق :۔

نظیر کے اس کلام کو چھوڑ کر جس میں کسی قدر اس نے اپنی چلبلی طبیعت سے زیادہ

آزادی کے ساتھ کام لیا ہے اور جو شاید اس کی ابتدائے جوانی کا کلام ہے، اس کے ہر فقرے سے اس کا ایک نہایت ہی شستہ اخلاق، اور مہذب اطوار کا آدمی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

سخاوت:۔

وہ شخص کیوں کر بخیل ہو سکتا ہے جس کے یہ خیالات ہوں۔

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا　　دُکھ اس میں تیری رُوح بہت پائے گی بابا
ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی بابا　　دولت جو تیرے یاں ہے نہ کام آئے گی بابا
پھر کیا تجھے اللہ سے رلوائے گی بابا

دولت جو ترے پاس ہے رکھ یاد تو یہ بات　　کھا تو بھی اور اللہ کی کر راہ میں خیرات
دینے سے اسی کے ترا اونچا رہے گا ہات　　اور یاں بھی تری گزرے گی سو عیش سے اوقات
اور واں بھی تجھے سیر سے یہ دکھلائے گی بابا

داتا کی تو مشکل کوئی اٹکی نہیں رہتی　　چڑھتی ہے پہاڑوں کے اُوپر ناؤ سخی کی
اور تو نے بخیلی سے اگر جمع اُسے کی　　تو یاد یہ رکھ بات کہ جب آوے گی سختی
خشکی میں تری ناؤ یہ ڈبوائے گی بابا

دولت جو ترے گھر میں یہ اب پھول ہے جوں پھول　　مردُود بھی یہ کرتی ہے اور کرتی ہے مقبول
جو چاہے ترے ساتھ چلے یاں سے یہ مجہول　　زنہار، خبردار ہو اس بات پہ مت پھول
یہ خنذی[1] ترے ساتھ نہیں جائے گی بابا

اس سے یہی بہتر ہے تو ہی آپ اسے کھا جا　　بیٹوں کو عزیزوں کو رفیقوں کو کھلا جا
سب رُو برو اپنے اسے عشرت میں اُڑا جا　　پھر شوق سے ہنستا ہوا جنّت کو چلا جا
ورنہ تجھے ہر دُکھ میں یہ پھنسوائے گی بابا

یہ تو نہ کسی پاس رہی ہے نہ رہے گی　　جو اور سے کرتی رہی وہ تجھ سے کرے گی
کچھ شک نہیں اس میں جو بڑھی ہے سو گھٹے گی　　جب تک تو جیے گا تجھے یہ چین نہ دے گی
اور مرتے ہوئے پھر یہ غضب لائے گی بابا

---

[1] خنذی ۔۔ بے ہودہ ہنسنے والی عورت، بے حیا، بے غیرت، قحبہ فاحشہ۔ (ش)

مائل بُخلا:۔

جب موت کا ہووے گا تجھے آن کے دھڑکا   اور نزع تیری آن کے دم دیوے گی بھڑکا
جب اُس میں جو اٹکے گا نہ دم نکلے گا پھڑکا   گُتوں میں روپے ڈال کے جب دیویں گے کھڑکا
تب تن سے تری جان نکل جائے گی بابا

تو لاکھ اگر مال کے صندوق بھرے گا   ہے یہ تو یقین آخرش اِک دِن تُو مرے گا
پھر بعد ترے اس پہ جو کوئی ہاتھ دھرے گا   وہ ناچ مزا دیکھے گا اور عیش کرے گا
اور رُوح تری قبر میں چلّاتے گی بابا

اس کی تو وہاں ڈھولک و مردنگ بجے گی   اور رُوح تری قبر میں حسرت سے جلے گی
وہ کھاوے گا اور تیرے تئیں آگ لگے گی   تا حشر تری رُوح کو پھر کل نہ پڑے گی
ایسا یہ تجھے گور میں تڑپائے گی بابا

جاوے گا تری گور کی جانب جو وہ ناگاہ   ساقی و صُراحی و پری زاد کے ہمراہ
رونا مجھے آتا ہے ترے حال پہ واللہ   جب دیکھے گا سو عیش میں تو اس کے تئیں آہ
کیا کیا تری چھاتی پہ یہ لہرائے گی[1] بابا

تو بھوت ہو چھاتی پہ اگر آن چڑھے گا   تو واں بھی ترے واسطے عامل کوئی بُلوا
شیشے میں اُتروا کے تجھے دیویں گے گڑوا   یہ خوب سا سُلگا کے کوئی ہار فلیتا
دُھونی ہی تری ناک میں دِلوائے گی بابا

گر ہوش ہے تجھ میں تو بخیلی کا نہ کر کام   اس کام کا آخر کو بدی ہوتا ہے انجام
تھُوکے گا کوئی کہہ کے کوئی دیوے گا دشنام   زنہار نہ لے گا کوئی ہر صبح ترا نام
پیزاریں ترے نام پہ لگوائے گی بابا

کہتا ہے نظیر اب جو یہ باتیں تجھے ہر آن   گر مرد ہے عاقل تو اُسے جھُوٹ تُو مت جان
ٹک غور سے کر گنج پہ قاروں کے ذرا دھیان   جیسا ہی اُسے اس نے کیا خوب پریشان
ویسا ہی مزا تجھ کو بھی دکھلائے گی بابا

---

[1] یہ لہراوے۔ (ش)

ان کی نواسی نے مجھ سے بیان کیا کہ "نانا جان بڑے ہی سخی مزاج کے آدمی[1] تھے۔ انھوں نے تمام عُمر اپنے ہاتھ سے روپیہ نہیں چُھوا۔ جہاں کہیں سے روپیہ آیا روپیہ لانے والے سے کہا کہ اس کو رومال میں باندھ دو۔ پھر اس رومال کا ایک سرا پکڑ کر جیسے کوئی نجس چیز ہو گھر میں ڈال جاتے، یا کسی آدمی سے کہتے کہ گھر بھجوا دو۔ نانی کا جس طرح جی چاہتا خرچ کرتیں۔ وہ پوچھتے بھی نہیں کہ کیا ہوا اور کِدھر گیا۔۔۔۔"

نظیر کی سیر چشمی اِس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس کو مختلف ریاستوں سے بُلاوا آیا لیکن وہ نہ گیا پہلے تو لکھنؤ[2] کے نواب نے بُلایا۔ غالباً اُس وقت میں سعادت علی خاں کا زمانہ ہوگا۔ وہ شعراء اور اہلِ علم کا بڑا قدر دان تھا۔ اپنی عام قدر دانی کے تقاضے سے اُس نے نظیر کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ تمھارے کلام کی شہرت نے ہمہ تن تمہارا اشتاق بنایا ہے۔ میرے دربار کو اپنی تشریف آوری سے زینت بخشو۔۔۔ قاصد کے ساتھ کچھ روپیہ بھی بھیجا تھا۔ بعض کہتے ہیں تین ہزار تھا، بعض دو سو۔ بہر حال جتنا ہو قاصد نے نظیر کے پیش کش کیا۔ نظیر نے لے کر گھر میں رکھا اور قاصد سے کہا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا۔ روپے کے کھٹکے سے اس کو رات بھر نیند نہ آئی۔ صبح کو آکر اس نے قاصد سے کہا "بھائی یہ روپیہ تو بڑے ہی بکھیڑے کی چیز ہے۔ چور کے ڈر کے مارے میری تو رات بھر اُدھیڑ بن میں گزری کہ نیند حرام ہو گئی۔ سو مجھ کو ایسی چیز لینی منظور نہیں۔ آرام سے اپنا سوتا ہوں اور شکر خدا بجالاتا ہوں۔ اپنی ایسی عُمدہ عافیت کو میں اِتنے

---

[1] میں مدحِ نظیر اب جو بناتا ہوں ہمیشہ   دولت ہی کا انعام میں پاتا ہوں ہمیشہ
کھاتا ہوں، کِھلاتا ہوں، لُٹاتا ہوں ہمیشہ   خیرات اسی در سے میں پاتا ہوں ہمیشہ
جاری ہے سدا میرے شہنشاہ کا باڑا[3]   (خیبر کی لڑائی کا آخیر بند)

[2] مجید حسن کاتب مفیدِ عام نے کہا "نظیر کو واجد علی شاہ نے بُلا بھیجا تھا۔ تین ہزار روپے بھی بھیجے تھے۔ رات بھر ان کے گھر میں روپیہ رہا، اس تردُّد سے اس کو نیند نہ آئی۔ اُنھوں نے کہا اتنا تعلق نے تو یہ تردّدات ہیں۔ جب پورا تعلق ہوگا خدا جانے کیا حال ہوگا۔ کمبخت کو پھیکو۔ یہ کہہ کر روپیہ واپس کیا اور نہ گئے۔ مجذوب سے آدمی تھے۔"

[3] باڑا دان۔ خیرات وغیرہ جو لوگ فقیروں جوگیوں وغیرہ کو دیتے ہیں۔

روپے کے لیے بیچ نہیں سکتا۔"

حافظ انور خاں[1] سے یہ روایت یوں سُنی گئی کہ مشہور ہے کہ لکھنؤ سے ان کی طلب میں بادشاہِ وقت کی طرف سے ایک قاصد دو سو روپیہ لے کر آیا تھا۔ بعض اس مقدار کے بیان کرنے میں مبالغہ بھی کرتے ہیں۔ آدمی جب ان کے مکان کے قریب آیا تو نظیر راستے میں ٹہل رہے تھے۔ آدمی نے ان سے پوچھا نظیر کا مکان کون سا ہے۔ اُنھوں نے کہا سیدھے چلے جایئے۔ نواب باندہ کے مکان کے پہلو میں ایک مختصر سا مکان ہے جس کے صحن میں نیم اور بیری کے دو درخت ہیں۔ بس وہی ان کا مکان ہے۔ وہ جب ان کے مکان پر پہنچا تو ڈیوڑھی پر جاکر آواز دی۔ اندر سے جواب ملا کہ وہ کہیں سِدھار گئے ہیں۔ اتنے میں ٹہلتے ٹہلتے میاں نظیر بھی آن پہنچے۔ جب قاصد پر ظاہر ہوا کہ نظیر یہی ہیں تو اس نے شکایت کی کہ آپ نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ پھر بڑے تپاک سے مِلا اور بعنوانِ معقول اپنے بادشاہ کا پیام دیا۔ نظیر نے کہا میں اپنے مالک سے پُوچھ لوں ایک شب کی مجھے مہلت ملے۔ دوسرے دن خوف زدہ صورت بنائے ہوئے پہنچے۔ کہ صاحب مجھے میں تو اپنے مالک کے ہاں سے بہت ہی ڈانٹا گیا کہ ایک آدمی دو دو کی نوکری۔ تو آپ اپنا روپیہ لیجیے اور مجھے معاف کیجیے۔ اس حکایت میں کسی قدر صوفیانہ رنگ زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔ عجب نہیں کہ خوش عقیدہ لوگوں نے خانقاہی مجلسوں کے گرم کرنے کے لیے کچھ تصرّف کیا ہو۔

ان کی نواسی نے اس حکایت کو نہایت سادگی سے ان الفاظ میں بیان کیا۔

"میں نے پُوچھا" لکھنؤ سے ان کو کوئی بُلاوا آیا تھا۔

"اُنھوں نے کہا" ہاں، وہاں کے نواب نے بُلا بھیجا تھا۔ لیکن اُنھوں نے کہا میں

---

[1] یہ ایک نابینا حافظ ہیں۔ آگرہ ان کا وطن ہے۔ ہر سال رمضان میں تراویح پڑھانے عظیم آباد تشریف لاتے ہیں۔ نیک بخدا آدمی ہیں۔ سن ساٹھ سے متجاوز ہوگا۔ نظیر کے اکثر شعر ان کو یاد ہیں۔ چنانچہ جن دنوں یہ صدرگلی میں وارد تھے "پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے" والی نظم اُنھوں نے پوری مجھے پڑھ کر سُنائی تھی اور وہیں نظیر کے بعض حالات بھی بیان کیے تھے۔ (ش)

ماشہ کا قلم ہلانے والا' میاں کدھر جاؤں۔ امیروں کے لائق کہاں ہوں ۔یہی کہہ کر ٹال دیا۔ اور نہ گئے ــــ"

غرض جو کچھ ہو۔ اس حکایت سے ان کی استغنا اور سیر چشمی ثابت ہوتی ہے۔

حافظ انور خاں نے بیان کیا کہ ایک روایت ہے کہ بھرت پور سے بھی ان کی طلب آئی تھی۔ وہاں کے راجہ نے بُلا بھیجا تھا۔ بعض کہتے ہیں، گئے اور بعض کہتے ہیں نہیں گئے۔ قول اوّل کے مطابق آگے سلسلۂ بیان یوں ہے کہ جب بھرت پور پہنچے تو راجہ نے بڑے تکلف کے ساتھ ان کے لیے مکان فرش فروش سے آراستہ کروایا اور بیس روپے ان کی تنخواہ کی۔ اُنھوں نے کہا۔ فرش تو اُٹھوا دیجیے۔ مجھ کو صرف ایک بوریا درکار ہے اور بیس روپے کیا ہوں گے۔ میری حاجت کو پانچ روپے بہت ہیں۔

اس حکایت کی میاں نظیر کی نواسی کے بیان سے تصدیق نہیں ہوتی۔ انھوں نے بیان کیا کہ شہر کے باہر فقط انھوں نے متھرا میں اوائل عُمر میں نوکری کی تھی اور وہ بھی پڑھانے ہی کی۔ اس کے بعد انھوں نے باہر کہیں نوکری کی ہی نہیں۔

ایک حکایت ان کی استغنا اور سیر چشمی کی خود ان کی نواسی کی زبانی معلوم ہوئی اور چونکہ یہ حکایت ابتدائے عُمر کی ہے اس سے ایسا یقین ہوتا ہے کہ یہ مادہ ان میں فطری طور پر ودیعت تھا۔ انھوں نے بیان کیا کہ ان کے والد جن کا نام محمد فاروق تھا، عظیم آباد میں نوکر تھے۔ کوئی نواب صاحب تھے، ان کے یہاں مصاحب تھے، جب انھوں نے قضا کی تو نواب صاحب نے میاں نظیر کو لکھ بھیجا کہ آپ کے والد نے قضا کی۔ تقدیر الٰہی سے کوئی چارہ نہیں۔ صبر کیجیے۔ مال جو وہ چھوڑ گئے ہیں اس پر تالے ڈلوا دیے ہیں۔ آپ ان کے وارث ہیں۔ آئیے اور آن کر لے جائیے۔ میاں نظیر نے لکھ بھیجا کہ "میں ماشے بھر کے قلم کا ہلانے والا، اتنے مال کے لیے کہاں کہاں مارا پھروں۔ آپ سب مال کو لے کر وہیں خیرات کر دیجیے"۔

سخاوت و عشرت کے بیان میں یہ بند بھی ان کی جبلّی فیاضی کو ظاہر کرتے ہیں۔

زردار ہے تو ہرگز مت مار اپنے من کو — تن زیب، تن سُکھوں سے ترسا نہ اپنے تن کو
جو زر[1] چلن چلیں چل تو بھی اُسی چلن کو — مُرشد کا ہے یہ نکتہ رکھ یاد اس سخن کو

---

[1] زمرد کو کہتے ہیں یہاں مردانِ راہِ طریقت مُراد ہیں۔ (ش)

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق، کوڑی نہ رکھ کفن کو

جا بیٹھ میکدوں میں سب دردِ غم سے ہٹ کر   جھمکا[1] گلابی مے کی پیالی اُلٹ پلٹ کر
محبوب دلبروں سے خوش ہو لپٹ لپٹ کر   پی دُودھ اور بتاشے[2] میوہ مٹھائی چٹ کر

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق، کوڑی نہ رکھ کفن کو

نعمتیں ہیں جتنی جو کچھ ملے سو کھا جا   تاش[3] اور بادلے[4] میں یک بار جگمگا جا
پاپی[5] بخیل مت بن داتا[6] سخی کہا جا   اک دم تو اپنا ڈنکا من مانتا بجا جا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق، کوڑی نہ رکھ کفن کو

صندوق میں جو زر ہے اس کو بھی لے گنوا دے   مے کے بہا کے نالے طبلوں کو کھڑکھڑا دے
کوٹھے، مکاں، حویلی سب کھود کر کھلا دے   کڑیوں تلک جلا دے اینٹوں تلک اُڑا دے

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق، کوڑی نہ رکھ کفن کو

جو جو بخیل کتنی زر چھوڑ کر مرے گا   یا کھائے گا جنوائی[7] یا خالصے[8] لگے گا
تیرا وہی ہے جو کچھ راہِ خدا میں دے گا   کھاتا کھلاتا، ہنستا تو بھی سدا رہے گا

---

[1] جھمکانا ـــ چمکانا، جھلکانا۔ (ش)

[2] بتاسا اور بتاشا دونوں صحیح۔ ایک قسم کی شیرینی جو بشکل حباب ہوا بھر کر بنائی جاتی ہے۔ (ش)

[3] تاش ـــ ایک قسم کا زری کا کپڑا جس کا تانا ریشم کا، بانا بادلے کا ہوتا ہے۔ زربفت، بادلہ، تمامی۔ (ش)

[4] بادلہ ـــ زری کا کپڑا جو ریشم اور چاندی کے تاروں سے بُنا جاتا ہے۔ تمامی۔ زری۔ (ش)

[5] پاپی ـــ کنجوس، بخیل، ممسک، خسیس، کشک دنی۔ (ش)

[6] داتا ـــ دینے والا، جوّاد، سخی، فیاض داتا پن کرے، کنجوس جھُر جھُر مرے۔ (ش)

[7] جنوائی ـــ بیٹی کا خاوند، داماد۔ (ش)

[8] خالصے لگنا ضبط ہونا، بے وارثا قرار پاکر سرکاری ملکیت میں داخل ہونا، رائیگاں جانا۔ (ش)

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق، کوڑی نہ رکھ کفن کو

گر آپڑے گا تجھ پہ کچھ حادثہ خلل کا — مالک پھر اور کوئی ٹھہرے گا تیرے دَل[1] کا
آگے سے دے دِلا کے ہو رہ تو اس سے ہلکا — کر فکر اپنے دل میں کچھ آج کا نہ کل کا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق، کوڑی نہ رکھ کفن کو

جس نے یہ زر دیا ہے پھر وہ ہی دھن بھی دے گا — مالوں، مکان، حویلی، باغ و چمن بھی دے گا
جیتا رہے گا جب تک کھانے کو اَن[2] بھی دے گا — مرجاوے گا تو وہ ہی تجھ کو کفن بھی دے گا

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق، کوڑی نہ رکھ کفن کو

جتنے گڑے دبے ہیں سب کھالے اور کھلالے — رکھ دُھن اسی کی دل میں اب کھالے اور کھلالے
اپنا سمجھ اسی کو جب کھالے اور کھلالے — اب تو نظیرؔ تُو بھی سب کھالے اور کھلالے

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق، کوڑی نہ رکھ کفن کو

ابوالقاسم پر قدرت اللہ قادری اپنے تذکرہ میں جس کی تاریخ اتمام 1221ھ ہے لکھتے ہیں کہ شیخ ولی محمد اکبر آبادی مشاعرے ہست دیرینہ مشق کر بالفعل دراں نواح علم او استادی مے افراز دو زرد محبّت واخلاص با ہر کس مے بازد بسیار سلیم الطبع وخوش اختلاط ونہایت نیک طلیت و مستحکم ارتباط شنیدہ مے شود۔ بر علمی اوقات گزاری مے کند وبکشادہ پیشانی ایامِ زندگی بسر مے برد۔

اخلاق نظیرؔ کے متعلق اس عبارت سے اتنے مضامین نکلتے ہیں کہ میاں نظیرؔ محبت کے بڑے پکّے تھے۔ جس شخص سے ملتے تھے خلوص کے ساتھ ملتے تھے اور دوستی اور محبت کے حقوق کی بڑی رعایت کرتے تھے۔ کسی شخص کے ساتھ ان کو عداوت اور رنجش

---

[1] دَل۔ فوج۔ لشکر۔ انبوہ۔ (ش)
[2] اَن۔ دانہ، اناج، غلّہ، گیہوں، چنا وغیرہ غذا، خورش اُدھار۔ (ش)

رکھتے نہیں سُنا گیا۔ مرنجہ مُرنج کی حکمت عملی کو پوری طرح برتتے تھے۔ صلح کل کے وسیع کمرے میں ہر شخص سے دل کھول کر ملتے تھے۔ مزاج میں خوش طبعی بھری ہوئی تھی جس مجلس میں ہوتے تھے ان کی باتوں سے لوگوں کے چہروں پر گلدستے کھل جاتے تھے طبیعت نہایت سلیم واقع ہوئی تھی۔ نادر نادر لطیفے اور اچھوتے اچھوتے چٹکلے ان کی زبان سے سُننے میں آتے تھے۔ طبیعت میں کسی قسم کا فساد نہ تھا۔ نیکی خمیرِ مزاج میں داخل تھی[1]۔ میاں نظیرؔ کی نواسی اور ان کے داماد مرزا نوازش علی کے بیان سے معلوم ہوا کہ حضرت بچوں کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔ بچے ان کو گھیرے رہتے تھے اور ان سے یہ ہنستے بولتے تھے اور ان کے بہلانے کو بہت سی دل لگی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے آس پاس جولاہے بہت آباد ہیں۔ ان کے بچّان کو آن کر گھیر لیا کرتے تھے۔ ان کی خاطر سے اکثر یہ کچھ تفریح کی نظمیں بھی لکھ دیا کرتے، مثلاً بیا، ریچھ کا بچہ، وغیر ذلک۔

میاں نظیرؔ کی نواسی کہتی تھیں کہ نانا کی زندگی میں میں بہت ہی چھوٹی تھی۔ جب کبھی گھر آتے اور میں ان کے پاس جاتی تو مجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے اور گانے لگتے۔

"موہن میرے آئے، للّن میرے آئے، کنجن میرے آئے"

ایسی محبت کرتے تھے کہ اس قسم کی محبت کرتے میں نے تو کسی بُزرگ کو نہیں دیکھا۔

چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی میاں نظیرؔ کو سلام کرتا تھا تو دونوں ہاتھوں سے اس کا جواب دیتے تھے۔ ایشیائی شعراء میں ہجو کا مرض عام ہے۔ عربی فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں عمائدِ شعراء نے ہجو سے اپنے کلام کو ناپاک کیا۔ متنبّی کا وہ شعر مشہور ہے۔

اسامرتی ضحکتہ کل رار　　　فطنت وانت اغبی الاغبیار

---

[1] نظیرؔ خود حمدِ الٰہی والی نظم میں صفاتِ انسانی کی تصریح کرتے ہیں۔

خصوصاً، بنی آدم خوش لقا　　　شرف ان سبھوں میں انہی کو دیا
بہ اسلام و ایمان و دینِ قدیم　　　عطا کی انہیں دولت معرفت
عبادت اطاعت نکو منزلت　　　حیا، حسن، اُلفت ادب مصلحت
تمیز و سخن، خلقِ خوش مکرمت

فردوسی کا ایک شعر محمود کی ہجو میں کس فارسی کے طالب علم کی زبان پر نہیں۔

پرستار زادہ نیاید بکار   اگرچہ بود زادۂ شہریار
اگر مادر شاہ بانو بُدے   مرا سیم و زر تا بزانو بُدے

انوری کا کلام بھی ہجو سے خالی نہیں۔ خاقانی نے تو ہجو کی انتہا کر دی کہ اپنے سسرے ابوالعلی گنجوی سے اُلجھ پڑا اور انتہا سے زیادہ رکیک مضامین اس کی شان میں قلم بند کیا۔

اُردو کے شعراء میں سودا مسلم الثبوت استاد ہے۔ جہاں اس کو قصائد کا امام مانا جاتا ہے، ہجو کا بھی لوگ پیشوا سمجھتے ہیں۔ اتنی ہجو شاید کسی شاعر کے قلم سے نہیں نکلی۔ میر حسن کے باپ عناحک کی ہجو اس نے کی ہے

ریم سوزاک پلا ہے تو شریر   رحم مادر سے اُلٹے نکلا ہو میر

میر کی ہجو اس نے کی۔ ندوی کی ہجو اس نے کی۔ مرزا علی کی ہجو اس نے کی۔ شیدائی فولاد خاں کو توال شاہجہاں آباد کی ہجو اس نے کی۔ مرزا فیضو کی چیچک کی ہجو اس نے کی۔ غرض جس سے ذرا رنجش ہوئی اس کی ہجو کر کے رکھ دی۔ جرأت اور کریلا بھانڈ کے مقابلے مشہور ہیں۔ جرأت کے اس دندان شکن جواب سے کون واقف نہیں جس کا آخری شعر یہ ہے۔

نے بگڑتا ہے، نے سلورتا ہے   باپ کی اپنے نقل کرتا ہے

مصحفی اور انشاء کے ہجو یہ معرکے زبان زد خلائق ہیں۔ (مزہ یہ تھا کہ اس قسم کے معرکے جب ہو چکتے تو پھر بعد میں دلوں میں کسی قسم کی کدورت باقی نہیں رہتی تھی۔ الحمدللہ کہ اب غیرت کا معیار کسی قدر بلند ہو گیا ہے۔)

باوجود کہ نظیر اس زمانے کے شعراء میں ہے جب کہ ہجو کوئی معیوب بات نہ تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قریب قریب ہجو ایک خاص فن کلام قرار پا گئی تھی جس پر شعراء طبیعت آزمائی کرنی ایک ضروری فریضۂ شاعری جانتے تھے۔ علاوہ بریں خود نظیر شوخیٔ طبع سے عاری نہیں۔ مزاج میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بات بات میں چوچلا تھا اور لفظ لفظ بذلہ چٹکلا۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنی خاص عالی ظرفی سے کسی کی ہجو سے اپنی زبان کو آشنا نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

اس کا مزاج کینہ سے پاک تھا۔ وہ کسی کی عداوت کو دل میں پرورش نہیں کرتا تھا۔ جس سے کچھ رنجش ہوئی بس اسی وقت تک رہی جب وقت نکل گیا، پھر اس کا خیال بھی نہیں۔ اس کا مزاج بہت ہی پاک وصاف واقع ہوا تھا۔ کسی کی بدسلوکی اس کو بہت زیادہ دیر تک طول نہیں رکھتی تھی۔ دریا میں جیسے ایک چھوٹی سی کنکری کے گرنے سے تغیّر پیدا ہو، بس کچھ اسی قسم کا تغیّر خلاف مزاج باتیں اس کی خوشی کی روانی پیدا کرتی تھیں۔ آن کی آن میں وہ تغیّر طبیعت کی بڑی اور زبردست موجوں کے تھپیڑے کھا کر فنا ہوجاتا تھا۔ بس ہجو کی لہر دل میں پیدا ہوتی تو کہاں سے ہوتی۔

اہلِ دُنیا کی مدحت :۔

مداحی بھی ایشیائی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ خلفائے عباسیہ کے صلونے شعرائے عرب کو مداحی کی چاٹ دلائی۔ سلاطین فارس کے انعاموں نے شعرائے عجم کو اس کی چاشنی سے آگاہ کیا۔ کم اولوالعزم بادشاہ ہوں گے جن کے دربار میں ایک شاعر باسم ملک الشعرا صرف اس خدمت پر مامور رہا ہو کر ہر خوشی کی تقریب میں عُمدہ عُمدہ قصائد میں نئی نئی تمہیدوں سے ان کے اوصاف جھوٹ سچ بیان کرے۔

عروج کے زمانے میں ہندوستان میں بھی سلاطین اسلام نے مدحت خواہی اور جائزہ بخشی کے میدان میں بہت زمانہ تک اپنے عجمی ہم چشموں کے ساتھ گھڑ دوڑ قائم رکھی ہے خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ قطب الدّین مبارک شاہ نے امیر خسرو کو ایک ہاتھی کے برابر وزن میں روپے انعام دیے۔

اس گئے گزرے وقت میں بھی جبکہ اسلامی سلطنت کا دیا ہندوستان میں جھلملا رہا تھا بعض اولوالعزم اور علم دوست عیش پسندوں کے فیض توجہ سے بہت کچھ شعراء کے دامنِ گل سے بھر جاتے تھے۔

گو اب بعض لوگ اُس زمانے کو یاد کرکے بے اختیار ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھیے تو ایک بڑی آفت ہم لوگوں کے سر سے دُور ہوگئی سلاطین کی مداحی کرتے کرتے شعراء میں ایک خاص مادہ خوش آمد کا پیدا ہوجاتا تھا، جب ان کے کلام کی قدرتی روانی میں فرق آجاتا تھا۔ ان کے خیالات کا آزادانہ لب ولہجہ باقی

نہیں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ تعریف کے مضامین پیدا کرنے میں نئے نئے انداز سے مبالغہ کو کام میں لاتے تھے۔ جھوٹ بکتے بکتے ان کو سیدھے سادے واقعات کے بیان میں لطف نہیں ملتا تھا۔ ان کے خیالات رفتہ رفتہ محدود ہو جاتے تھے۔ لفاظیوں کا ایک ایسا جھاڑ تیار ہو جاتا تھا کہ شاہدِ مطلب کا دامن اکثر کانٹوں سے الجھتا جاتا تھا۔ معلومات کے کل سرچشمے اپنا ذخیرہ بیجا مدّاحی کی ناپاک اور بے پایاں کھاڑی میں خالی کرتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ہماری شاعری کا ر بڑھ سمٹ کر ایک اِنچ سے زیادہ نہیں رہا تھا۔

اب اگر کوئی کسی کی مدحت نہ کرے تو کوئی شاباش کی بات نہیں، اس لیے کہ سِرے سے امید صلہ ہی مفقود ہے۔ مدّاحی مروّجہ کی قباحتیں اب گویا سب پر کھل گئی ہیں۔ اکثر سنجیدہ خیال لوگوں کی توجہ اور زرخیز زمینوں کی طرف مصروف ہو گئی ہے۔ دوسرے میدانوں میں لوگ اپنے اشہبِ قلم کو زیادہ امید منفعت کے ساتھ چمکار رہے ہیں۔ تعریف ان لوگوں کی ہے جن کو عین اس زمانہ اقبال مدّاحی میں اس کی قباحتوں پر نظر تھی۔ میں دیکھتا ہوں کہ نظیر انہی مستثنا لوگوں میں ہے جس طرح اس نے اپنی زبان قلم کو لوگوں کی ہجو سے روکا، اسی طرح اس نے اہل دُنیا کی مدح کی۔ آلائش سے بھی اس کو پاک رکھا۔ تمام کُلّیات میں اس کے ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے، جس میں کسی رئیس یا امیر یا نوّاب کی تعریف ہو۔ یہ بھی نہیں کہ اس کو کسی رئیس سے تعلق نہ ہو۔ راجا چیت سنگھ کے بیٹے کی سرکار میں وہ متعلق تھا۔ وہ اگر تعریف کرتا تو یقیناً راجا اس کو مناسب صلے دیتا اور یقیناً دنیاوی حیثیت سے اس کی حالت زیادہ شگفتہ ہوتی۔ عجب نہیں کہ بعض موقعوں پر حسنِ طلب کے اشارے بھی ہوئے ہوں لیکن اس کو خوشامد سے نفرت کُلّی تھی۔ وہ ایک بندۂ خدا کی مدحت اس درجہ میں انتہا درجہ کی بدعقلی جانتا تھا۔ اشاروں کو ہنسی میں ٹال جاتا ہوگا۔ رہا حُسن کلام، وہ اور مضامین کے مطلع سے اس طرح چمکا ہے کہ اب کسی عاقل کو جائے شکایت نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنی خداداد قوت شاعری کو اس سوء تصرّف سے بچا کر ایک اچھے مصرف میں لگایا اور کان طبیعت سے کاوش کر کے ایسے جوہر نکالے۔ جو اور شعراء کے مدحیہ جھوٹے جواہر سے ہر چند زیادہ چمکیلے نہ ہوں، مگر سچّے اور اصل جواہرات ہیں۔ اور ہر جوہری بازار میں عُمدہ قیمت میں بِک سکتے ہیں۔

ایک[1] جگہ خوشامد کی میاں نظیر نے تعریف بھی کی ہے لیکن اس سے یہ مدعا نہیں ہے کہ آدمی کمینوں کی طرح خوشامد کرے۔ اس کا منشا صرف اتنا ہی ہے کہ ایسی بات نہ کرے کہ دل کو کسی کے آزار پہنچے۔ معمولی اخلاق جن سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور ان میں اپنا کچھ نقصان بھی نہیں، مصلحت دُنیا کے لیے ان کے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ مناسب ہے۔ چار دن جس شخص کو جُھک کر سلام کیا، دل میں خوش ہو گیا۔ اگر کوئی کام آگیا تو اس نے اس کے کر دینے میں انکار نہ کیا۔ سلام کرنے سے ہمارا کچھ صرف نہیں ہوا۔ لیکن وقت پر کس قدر کام آگیا —— ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کرنا گو بعض مغرور مزاج کو ناگوار معلوم دے، لیکن اس میں کوئی دولت اپنے گھر سے نہیں جاتی، اور مخاطب ہے کہ اسی ذرا سی بات پر پھُولا جاتا ہے۔ نظیر کے مزاج میں انکسار چوں کر تائت مرثیہ کا تھا۔ وہ اس قسم کی اخلاقی خوشامد کا برتاؤ ہر شخص کے ساتھ کرتا تھا۔ وہ جیسا کہ بیان ہو چکا، ادنا۔ ادنا شخصوں کے سلام کا دونوں ہاتھوں سے جواب دیتا تھا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی کوئی بات کرتا تھا تو ہاتھ جوڑ کر اور ادب دِکھا کر۔ گھر باہر تمام اس کے اخلاق کا جال پھیلا ہوا تھا اور ہر دل اس کے دام میں اسیر تھا۔

حکیم میر قطب الدّین باطن کے تذکرۂ نغمۂ عندلیب سے نظیر کے اخلاق کے متعلق یہ باتیں مستنبط ہوتی ہیں۔ مزاج میں حلیم بہت تھا۔ لاکھ خلاف مزاج بات ہو، ماتھے پر بل نہیں۔ بہت کم لوگوں نے ان کو غُصّہ ہوتے دیکھا۔ جس بزم میں بیٹھتے اخلاق کے نور سے شمع انجمن معلوم ہوتے۔ نادرہ سنج ایسے بڑے تھے کہ کوئی بات لطیفے سے خالی نہ تھی۔ انجمن کو اپنی لطافت سے شگفتہ کر دیتے تھے۔ جود و احسان میں بھی بڑا رُتبہ رکھتے تھے۔ پاس پڑوس میں جو غریب غربا تھے ان کی اکثر خبر گیری فرماتے تھے۔ محتاج کو دیکھ کر ان کا دل دُکھ جاتا تھا۔ کسی سائل کو خالی نہ پھیرتے تھے، اور جو وقت پر کچھ نہ ہوتا تو نہایت گڑگڑا کر معذرت کرتے۔ بڑے صاحب ہمّت تھے۔ اپنی ہمّت کے آگے وہ شاہی گنج و خزانہ کو بھی کوئی چیز نہ سمجھتے تھے۔

---

[1] جس خوشامد کا نظیر نے ذکر کیا، یہ اکثر بڑے شہروں کا خاصہ ہے۔ خصوصاً جس شہر کی آبادی زیادہ تر تاجرانہ ہو، جیسے آگرہ ہے۔ (ش)

\

زیورِ حیا سے آراستہ تھے۔ جو اہلِ مروّت کا خاصہ ہے۔

نظیر کا مذہب اور مذاقِ تصوّف

نظیؔر کے کلام کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اہلِ سُنت و جماعت کے طریقۂ مروّجہ کے مطابق کہیں صحابۂ کرام کی مدحت نہیں کی۔ اہلِ سُنت و جماعت بطور معمول حمد و نعت کے بعد چاروں صحابیوں کی تعریف ضرور لکھتے ہیں۔ نظیؔر نے لیلیٰ مجنوں کے قصّہ میں صرف حمد و نعت پر اکتفا کی ہے۔ صحابیوں کا ذکر کیا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ حضرت علی کو بھی بھول گئے ہیں۔ اس کی مذہبی نظمیں کُلّیات میں شمار میں کُل گیارہ ہیں۔ ایک میں صرف خدا ہی کی حمد ہے۔ دوسری میں صرف خدا کی حمد۔ تیسری میں کلمے کی مواظبت[1] کی ہدایت۔ چوتھی میں حضرت علی کی منقبت۔ پانچویں میں پنجتن پاک کی تعریف۔ چھٹی میں حضرت علی کا معجزہ۔ ساتویں میں حضرت عباس کا معجزہ۔ آٹھویں میں پھر حضرت علی کی منقبت۔ نویں میں پھر حضرت علی کی منقبت۔ دسویں نظم بطور سلام ہے جس میں رسولؐ سے لے کر تمام اہلِ دل اور اولیا کے ساتھ اپنی حُسنِ عقیدت ظاہر کی ہے۔ گیارھویں میں حضرت سلیؔم چشتی کے عُرس کا ذکر ہے۔

کُلّیات کے علاوہ اور بھی بعض نظمیں سُنی گئی ہیں، جو فقیروں کی زبانوں پر صدا بن کر، گلیوں اور کوچوں میں غلغلہ مچاتی ہیں، مثلاً خیبر کی لڑائی، حضرت علی کا وہ معجزہ جس میں آپ نے ایک پہلوان کو زیر کیا اور وہ آپ کے ہاتھ پر مُسلمان ہوا، اور بھی شاید بہت سی نظمیں ہوں گی جو مجھ تک نہیں پہنچیں۔

ان تمام نظموں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خاندانِ اہلِ بیت کے ساتھ بڑی محبت رکھتا تھا۔ وہ خارجی پر لعنت کرتا ہے۔ وہ حضرت علی کی کرامات کو معجزہ کے ساتھ تعبیر کرتا ہے۔

ایک معجزہ تو اس نے حضرت علی کا یہ لکھا ہے کہ کسی بنّی[2] میں شیر اور شیرنی رہتے

---

[1] کارِ متواتر و مسلسل (م)

[2] بَن کا اسم تصغیر (م)

تھے۔ شیرنی نے اس بن میں دو بچے جنے۔ ایک دن اپنے بچوں کو چھاتی سے لگائے دُودھ پلا رہی تھی کہ اتنے میں کسی طرف سے بندوق کی صدا آئی۔ نرمادہ دونوں ڈر کر بھاگ گئے۔ آواز بندوق کی جس شکاری کی آئی تھی، وہ کوئی بادشاہ تھا۔ جو شکار کو نکلا تھا اور شکار کرتا ہوا آرہا تھا۔ جب اس مقام پر پہنچا تو اس نے شیر کے یہ دو بچے دیکھے۔ آدمی سے حکم کیا کہ ان کو اُونٹ پر رکھ لو۔ غرض اُونٹ پر رکھوا کے گھر کو لے گیا۔ یہ تو بچوں کا حال ہوا۔ اب شیر اور شیرنی کا حال سنیے۔ کچھ دیر بعد جب جنگل میں امن ہوا اور بندوق کی آواز دیر تک موقوف رہی تو دونوں واپس آئے مگر یہاں آکر دیکھیں تو بچوں کا کہیں پتہ نہیں۔ شیر تو وہیں غش کھا کر گرا اور شیرنی نے نجفِ اشرف کی راہ لی۔ نجف اشرف پہنچ کر تین دن وہ شیرنی بھوکی پڑی رہی۔ لاکھ لوگوں نے اس کو کھلانا، پلانا چاہا مگر اس نے کھانے پینے کی طرف رُخ ہی نہ کیا۔ ناچار وہاں کے شریفوں نے جس طرح قدیم سے کہنے کی راہ تھی، حضرت علی کی جناب مقدس میں عرض کی۔ وہاں سے ندا آئی کہ یہ شیرنی ظلم وستم کی ستائی ہے۔ بچوں کو اس کے کوئی پکڑ کر لے گیا ہے۔ اس کی فریاد لائی ہے۔ کل اس کا بھید تم سب پر آشکار ہو جائے گا۔ اِدھر شریفوں کو تو یہ جواب عنایت ہوا، اُدھر بادشاہ کا جا کر پلنگ اُلٹ دیا اور فرمایا کہ شیر کے دونوں بچوں کو تو کل نجف اشرف میں جلد بھیج دے ورنہ پھر بہت پچھتائے گا۔ بادشاہ تو تھر تھر کانپنے لگا اور گڑگڑا کر بولا کہ یا حضرت نجف تو یہاں سے پندرہ دن کی راہ ہے۔ کل ان کو وہاں کیوں کر بھیج دوں۔ حضرت کو فرمایا کہ جس وقت نور کا تڑکا ہو جلدی سے دونوں بچوں کو اُونٹ پر رکھوا کے اپنے شہر کی آبادی سے اُدھر بھجوا دے۔ جب یہ شہر کے دروازے پر پہنچیں گے غیب سے ایک ناقہ سوار پیدا ہوگا۔ صبح ہوتے ہی اس نے دونوں بچوں کو منگوا اُونٹ پر رکھوا جلدی سے روانہ کیا۔ جب لوگ شہر کے دروازے کے پاس پہنچے تو کیا دیکھیں کہ ایک شخص وہاں آدھی رات سے اُونٹ کی مہار پکڑے منتظر بیٹھا ہوا ہے۔ جاتے ہی دونوں بچے اس کے حوالے کیے۔ وہ بچوں کو لے کر روانہ ہوا اور پہر دن چڑھتے چڑھتے نجف اشرف میں پہنچ گیا۔

بچوں کے آنے کے جب غل ہوئے کروڑ   وہ شیرنی بھی تکنے لگی اپنے مُنہ کو موڑ

جب لا کے اس کے سامنے بچے دیے وہ چھوڑ   یوں خوش ہو چاٹنے لگی اُلفت کی کر جھنجھوڑ

— انسان جیسے کرتا ہے بچوں کو اپنے پیار —

بچّے بھی دوڑ ماں کے گلے سے لپٹ گئے   یوں جیسے کوئی دُور کا بچھڑا ہوا ملے
چھاتی پہ لوٹ لوٹ کے جا دُودھ سے مِلے   اس شیرنی کے جیسے کلیجے میں داغ تھے
ویسی ہی اس کے مُنہ پہ خوشی کی ہوئی بہار

جب اس نے بچے پائے تو ہو کر وہ شادماں   بچّوں سمیت اُٹھ کے وہ حیوان بے زباں
روضے کے سات بار تصدق ہوئی وہاں   پھر آستانہ چوم ہوئی واں سے وہ رواں
جا پہنچی اپنے دشت میں خوش ہو کے ایک بار

یہ نظم بہت مشہور ہے۔ تمام فقرا گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع میں اپنی غلامی کو حضرت علی کی جناب میں یوں عرض کرتے ہیں :۔

اے شاہ یہ نظیر تمہارا غلام ہے   رکھتا سوا تمہارے کسی سے نہ کام ہے
عاصی ہے، پُرگناہ ہے، اور ناتمام ہے   دن رات اس کا آپ سے اب یہ کلام ہے
"رکھ لیجیو میری آبرو یا شیر کردگار"

دوسرا معجزہ نظیر ہی کے الفاظ میں یوں ہے :۔

اک معجزہ کہتا ہوں میں اس شاہ کا سُن کر   موتی سے سخن ہیں، لو اسے دھاگے سے چُن کر
اک کافر بدذات چلا لڑنے کی دُھن کر   آسانے حیدر کے غضب آگ سا بُھن کر
جوں اُونٹ ذبح کرتے ہیں چلّا کے دہاڑا

کہنے لگا میں تم سے علی، کُشتی لڑوں گا   کُشتی کے جو ہیں پیچ علی، تم سے کروں گا
خم ٹھونک کے میدان میں علی تم سے لڑوں گا   ہاں یا علی میں آپ سے کچھ گر نہ پڑوں گا
ہر چند علی آپ نے دیووں کو پچھاڑا

جب شاہ اُٹھے جوش میں آطیش و غضب کے   یک بارگی اس کافر بدذات سے لپٹے
کر یادِ خدا ہاتھ کمربند میں اس کے   اک ہاتھ سے پھینکا جو اسے تین چرخ دے
یوں گر پڑا جُوں گرتا ہے دریا کا کراڑا

چاہا جو اُٹھے خوف سے وہ کانپ دھڑک کر   اس شاہ نے ماری وہیں اک لات کڑک کر
رُوح اس کی نکلنے لگی پنجرے سے پھڑک کر   نتھنوں سے لہو ڈال کے، ماتھے پہ چھڑک کر
منکر کا اجل لے چلی دریا کو نواڑا

دانتوں سے پکڑ تنکا وہ بولا علی آیا　　تقصیر ہوئی مجھ سے میں اپنا کیا پایا
پھر اس کو مسلمان کیا کلمہ پڑھایا　　کفار میں جا دین کے ڈنکے کو بجایا
دیں داری کو جاری کیا اور کفر کو گاڑا

یہ نظم میں نے ایک فقیر سے لکھ لی ہے۔ کلیات میں نہیں ہے۔ اس میں دو مصرعے یہ بھی ہیں :-

مولا مرا جس وقت تھا طفلی کے عہد میں　　کلّے کے تئیں اژدرِ خوں خوار کے پھاڑا

علی نے مہد میں چیرا ہے اژدر[1]　　علی نے کاٹ ڈالے عمرو عنتر[2]
الٹ ڈالا ہے اک حملے میں خیبر[3]　　غوّاص اشیار کا پھیرے گروہ سرور
تو ہو تریاق زہر اور زہر ریاق

علی کو مصطفیٰؐ نے جی کہا ہے　　علی کو جسمک جسمی کہا ہے
علی کو لحمک لحمی کہا ہے　　علی کو روحک روحی کہا ہے
یہ سمجھے وہ خدا دے جس کو ادراک

علی کو جو کوئی پہچانتا ہے　　برابر مصطفیٰؐ کے مانتا ہے
جو ان میں کچھ تفاوت جانتا ہے　　وہ اپنے خاک سر پر چھانتا ہے
لگائی اس نے دوزخ کی مگر تاک

جو رکھے دشمنی حیدر سے یک مو　　وہ بے شک ہے سیہ دل اور سیہ رو
جو لے شیکی سے نام مرتضیٰ کو　　نہ جاوے اس شقی کے منہ سے بدبو
کرے گر شاخ سے طوبیٰ کی مسواک

پڑھوں جس دم مناقب میں علی کا　　پھٹے سینہ مخالف خارجی کا[4]
تو اس اڑ جائے ہر اک ناجی کا　　دھڑک جاوے کلیجا مدعی کا
عدو کا دم میں ہو جاوے جگر چاک

---

1. قلعِ خیبر مرگ اژدر کھینچنا خورشید کا　　ہیں فسانے زور کے تیرے جہاں میں یادگار (مثنوی)
2. اٹھا ہے دو انگشت سے دروازۂ خیبر　　چیرا ہے کس انداز سے گہوارے میں اژدر (مثنوی)
کیا ہاتھ تھا جس سے کرگیا جان سے عنتر　　ظاہر کریاں تھا وہی ظاہر وہی مظہر
3. گر خارجی ہو آوے مرے آگے شل تاؤ　　پگڑی کو اس کی پھینک کے داڑھی کو لوں گھاڑ (مثنوی لطیفہ)

اُسی کو سر جُھکا سجدہ کیا خورشید انور نے　　اُسی کو لافتےٰ ہر دم کہا اللہ اکبر نے
اُسی کو لحمک لحمی کہا جانِ پیمبر نے　　اُسی کو دمک دمی کہا اس شاہ برتر نے

خدا و مصطفےٰ سے ہم قرابت اس کو کہتے ہیں

کیا مولا سے میرے گر کسی نے اک سوال آکر　　جو مانگا اک شتر اس کو دلائے سینکڑوں اشتر
اگر کچھ زر کی خواہش کی تو بخشے اس قدر گوہر　　کہ اس کا گھر بھرا اور اس کے ہمسایوں کا گھر باہر

کریم و اہل ہمت میں سخاوت اس کو کہتے ہیں

ا نے ایک حملے میں گرایا باب خیبر کا　　کروڑوں کافروں سے جا لڑا وہ اک تن تنہا
چہ بیر العلم میں کود کر دیوؤں کو جا مارا　　ہزاروں پہلوانوں سے کبھی اپنا نہ مُنہ موڑا

بہادر بے بدل یکتا شجاعت اس کو کہتے ہیں

کہا اس شاہ نے روز قیامت میں جو آؤں گا　　وہاں عرصات میں اپنے محبوں کو جو پاؤں گا
کھڑا ہو عرش کے آگے سبھوں کو بخشواؤں گا　　پلا کر جام کوثر سب کو جنت پہنچواؤں گا

علی کے دوستو حسن شفاعت اس کو کہتے ہیں

پنجتن کی تعریف میں ایک خاص نظم لکھی ہے جس میں خارجی کی پگڑی اور داڑھی کی یوں خبر لی ہے :-

نعرہ کروں جو حیدری ہل جاویں سب پہاڑ　　تھرّاویں چشمہ ساز ہلیں ڈر سے بوٹے جھاڑ

سُمرن مجھے بھلی ہے یہ پنجتن کے نام کی

پنجتن کی تعریف کے یہ بند بہت ہی مرغوب ہیں :-

محمدؐ اور علی یا قوتِ احمر　　دُرِ بحرِ خدا خاتون اطہر
زمرّدِ لعل ہیں شبیر شبّر　　جواہر خانۂ قدرت کے اندر

یہی پانچوں گُہر ہیں پنج تن پاک

انہی کے واسطے خلدِ عدن ہے　　انہی کے واسطے نہرِ لبن ہے
جنھیں ان کی محبت کا چلن ہے　　بہشتی حُلّہ اور ان کا بدن ہے

سدا سیر بہشت اور سایۂ پاک

حضرت عباس بن علی کا ایک معجزہ یوں لکھا ہے کہ آرکاٹ ایک شہر ہے۔ وہاں ایک ساہوکار تھا۔ جتنے زردار تھے سب میں اس کا رُتبہ بڑا تھا۔ اس کے ایک بیٹا سعادتمند برخوردار تھا۔

گل بدن، گل پیرہن، گل رنگ، گل رُو نام دار

چونکہ دوسرا اس کے کوئی بیٹا بیٹی نہ تھا۔ باپ اور ماں دونوں جی جان سے اس پر فدا تھے۔ نہایت تکلف کی پوشاک پہناتے اور زر و جواہر سے لادے رہتے۔ ان دنوں اس کا سن و سال تیرہ برس کا تھا، جب اس کو ماہِ محرم کا ہلال نظر آیا۔ یہ لڑکا چھپ چھپ کر تعزیہ خانوں میں جاتا اور مرثیوں میں شاہ کربلا کے غم کا حال سن کر سینے کو پیٹتا اور ماتم کر کے زار زار روتا۔ پھر تعزیے کے سامنے مودّب ہو کے سر جھکا کر ضریح پر کھڑا مورچھل جھلتا۔ جب علم اٹھتے تو لڑکوں کے ساتھ یا حسین کہہ کر علم اٹھا لیتا۔ شام سے آ کر قندیلیں جلاتا۔ قمقمے اور جھاڑ پر شمعیں چڑھاتا۔ عود سوزوں میں آگ لا کر ڈالتا اہلِ مجلس کو دوڑ دوڑ کر شربت پلاتا۔ غرض جتنا وہاں کا کاروبار تھا سب کرتا۔ اب تک اس کے باپ کو اس کی خبر نہ تھی۔ جب اس نے سنا جھڑکا طمانچے مارے، خوب تنبیہ کی اور کہا اے بے حیا، بدبخت، موذی، بدعلی، نابکار، کیا تو مجھے ذات سے نکالے گا۔ دن کو تو باپ نے یوں جھڑکا، لیکن چونکہ شہید کربلا کی محبت کا دل میں اس کے جوش تھا، وہ رات کو پھر تعزیہ خانوں میں دوڑا ہوا پہنچا۔ باپ اس کا وہاں سے پھر پکڑ لایا۔ الغرض سو سو طرح کے اس پر عذاب کیے مگر اس نے تعزیہ خانے کا جانا نہ چھوڑا۔

روتا اور ماتم ہی کرنا اس کے دل کو بھاتا تھا تعزیہ خانے کی جانب یوں وہ دوڑا جاتا تھا
جس طرح عاشق کسی معشوق کا ہو بے قرار

بند رقت یہ ہے :۔

جب تو سب نے تنگ ہو کر مصلحت ٹھانی بہم جس سے کرتا ہے یہ ماتم اور اٹھاتا ہے علم
کیوں نہ اب اس دم وہی ہاتھ اس کا کر ڈالو قلم کہہ کے یہ آخر کو سب نے بے قیامت ہے ستم
کاٹ ڈالا ہاتھ جلد اس بے گنہ کا ایک بار

الغرض اس مظلوم کا ہاتھ تن سے جدا کر کے اس کو کوٹھری میں بند کر اوپر سے قفل جڑ دیا، اور کھانا پانی سب موقوف کر دیا۔ لڑکا بھوکا پیاسا شام تک کوٹھری میں پڑا تھا اور اپنے ہاتھ کو دیکھ ڈاڑھیں مار مار کر روتا تھا۔

وہ اندھیری کوٹھری وہ بھوک وہ پانی کی پیاس ہاتھ سے لوہو کی بوندیں بھی ٹپکتی آس پاس
کس مصیبت میں پھنسا وہ گل بدن زریں لباس ہاتھ زخمی خون جاری، دل پریشاں جی اداس
کس سے مانگے داد اور کس کو پکارے بار بار

اپنی بے کسی درد میں رو رہا تھا۔ اس میں اس کوٹھری میں دیکھتا کیا ہے کہ ایک

دفعہ ہی نور کی تجلی ہوئی اور اس تجلّی میں اس کو ایک نوجوان نظر آیا۔ کاندھے کے اوپر علم، پہلو میں آب دار تیغ، ہاتھ میں داستانہ۔ پُشت کے اوپر سپر، تن میں سیمیں زرہ، فرق پر خود زرّیں، دائیں کو تیر و کماں، بائیں کو شمشیر و تیر۔

جس طرح ابر سیہ میں برق ہووے جلوہ گر
اس طرح اس کوٹھری میں آگیا وہ شہسوار

یہ جوان خود حضرت عبّاس بن علیؑ تھے۔ آپ کی توجّہ سے لڑکے کا ہاتھ درست ہو گیا جب ہاتھ درست ہو گیا وہ سوار غائب ہو گیا۔ صبح کو اس کوٹھری کا دروازہ خود بخود کُھل گیا۔ اب ماں باپ دیکھیں تو اس کا ہاتھ تن سے ملا ہوا ہے۔ پوچھا یہ کیا تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا جب بیان کیا، پھر تو سنتے ہی دونوں نے صدقِ دل سے کلمہ پڑھا۔

جب اس معجزے کی شہرت ہوئی تو تمام شہر کے لوگوں نے آکر اس لڑکے کو گھیر لیا۔ جو دیکھتا تھا اس کے ہاتھ چُوم لیتا تھا۔ اور آنکھوں سے لگا کر کہتا تھا کہ سُبحان اللہ دوستی کے پھُول نے کیا بہار دِکھلائی ہے۔

پھر ماں باپ اس لڑکے کو لے کر کربلا چلے گئے اور وہاں بھی اس لڑکے کی بڑی قدر ہوئی۔ روضے میں جب داخل ہوئے تو زیارت سے مشرّف ہو کر کچھ مکان بنوانے کی تجویز کی۔ لڑکے کے اہتمام سے نہایت منقّش اور زرنگار عمارت تعمیر کی۔

یہ معجزہ میں نے ایک دفعہ کسی مجلسِ عزا میں ایک حدیث خوان کی زبانی بھی سُنا تھا۔ عبارت نثر تھی اور تکلّف کے ساتھ لکھی گئی تھی۔ لیکن روانی جو نظیرؔ کی اس نظم میں ہے وہ کہاں۔ سلام کے یہ بند بھی نظیرؔ کے عقائد پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

پہلے اُس ختمِ رسالت سے کہو عشق اللہ صاحبِ خُلق و کرامت سے کہو عشق اللہ
گلشنِ دیں کی طراوت سے کہو عشق اللہ نورِ حق شافعِ اُمّت سے کہو عشق اللہ
ہر دم اس شاہِ ولایت سے کہو عشق اللہ

اور وہ ہے جس سے ہرا باغِ امامت کا چمن سبز پوشِ چمن جنّتِ فردوسِ حسن
زہر نے جس کا زمرّد سا کیا سبز بدن یاد کر، مومنو، اُس کا وہ ہرا پیراہن
سبزۂ باغِ امامت سے کہو عشق اللہ

اور وہ گُل جس سے ہے گلزارِ شہادت کا کھلا   لے گئے دشت بلا میں جو اُسے اہلِ جفا
تین دن رات کا پیاسا وہ بہادر یکتا   لشکرِ شام کو للکار کے تنہا وہ لڑا
گوہرِ دُرجِ شجاعت سے کہو عشق اللہ

اور جس مرد کا ہے نام بشۂ زین عبا   کربلا میں وہ اگر آہ کا شعلہ گرتا
جل کے لشکر وہ سبھی خاک سیہ ہو جاتا   پر سوا حق کی رضا اُس نے نہ کچھ دم مارا
اس جواں مرد کی ہمت سے کہو عشق اللہ

باقر و جعفر و کاظم و رضا شاہِ شہاں   اور تقی نور نبی اور وہ نقی قبلۂ جاں
عسکری مہدیِ ہادی وہ امامِ دوراں   ہیں زمانے میں یہی بارہ امام اے یاراں
سب ہر اک صاحب عزت سے کہو عشق اللہ

آں حضرت، حضرت علی[1]، امام حسنؑ[2]، امام حسینؑ[3]، امام زین العابدینؑ[4]، امام باقرؑ[5]، امام جعفرؑ[6]، امام کاظمؑ[7]، امام موسیٰؑ رضا[8]، امامؑ تقی[9]، امامؑ نقی[10]، امامؑ عسکری[11]، امامؑ مہدی[12] بارھوں امام کے نام اس نظم میں سلام بھیجا ہے۔

وہ نور دیدۂ احمد کہ جس کے رُتبے کی   حدیث بضعۃ منّی ہے دو جہاں میں گواہ

دو نظمیں حضرت سلیم چشتی کے جواہر صفات سے انتظام پاتی ہیں۔ ایک میں آپ کی صرف مدحت ہے۔ دوسری میں آپ کے عُرسِ شریف کی کیفیت۔ حضرت سلیم چشتی[1]، یہ وہ بُزرگ ہیں جن کی دُعا سے جہانگیر پیدا ہوا تھا۔ جیسا کہ اس کے نام سلیم سے ظاہر ہے۔ اکبر کو ان کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ فتح پور سیکری میں ان کا مزار ہے۔ روضہ بڑی تیاری کا بنا ہوا ہے۔ شاہی انتظام سے بنا ہے۔ آگرے سے سات آٹھ کوس ہے۔ ہر سال حضرت کا عُرس ہوتا ہے دُور دُور سے خلقت جمع ہوتی ہے۔ بڑا میلہ رہتا ہے۔

میاں نظیر کی مدحت کے خلوص آمیز انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضرت کے ساتھ خاص عقیدت تھی۔ دو جہاں کے سُلطان سردار ملک عرفان، مقبول خاص یزداں ع

---

[1] شیخ سلیم بن بہار الدین چشتی۔ 29 رمضان کو عُرس ہوتا ہے۔ فریدی ہیں۔ حضرت بابا کی اولاد۔ (ش)

عرش بریں کے تارے، اللہ کے سنوارے، قبلۂ صفا، کعبۂ ضیا، خلقت کے رہنما۔ محبوب کبریا ان القاب سے تو یاد کرتے ہی ہیں۔ نہیں، ایک بڑی بات یہ بھی کہتے ہیں کہ جس طرح شاہ بو علی قلندر بخشی الاولیا تھے، حضرت سلیم چشتی میر ساماں ہیں۔

شاہا شرف تو بخشی خالق کی سلطنت کے
اور تم ہو میر ساماں حضرت سلیم چشتی

اس بہار کا میلہ اس قدر قریب ہو اور آگرے کے شوقین جیوڑے چین سے بیٹھے رہیں۔ کوئی کہنے کی بات ہے۔ شوقین اپنے شوق کی رنگ میں اور خوش عقیدہ عقیدت کی جاں نواز اُمنگ میں میلے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ میاں نظیر بھی جا پہنچتے ہیں۔ کبھی صحنِ درگاہ پر نظر کرتے، کبھی مزار پر انوار کی تیاریوں سے آنکھوں کو اجالتے ہیں۔ کبھی جھرنے پر کھڑے نہانے کی سیر بھی دیکھ رہے ہیں۔ آدمیوں کی بھیڑ ہے۔ سبز، سُرخ، زرد ہر قسم کی پوشاکیں پہنے لوگ میلے میں پھر رہے ہیں۔ امیر، فقیر، بادشاہ زادے، نواب سبھی قسم کے لوگ جمع ہیں۔ پھولوں سے تمام مکان رشکِ گلزار ہو رہا ہے۔ ایک طرف مجلس مشائخوں کی جمی ہوئی ہے۔ راگ گائے جا رہے ہیں، حال ہو رہے ہیں۔ عارف الحق میاں علی احمد سجادہ نشین درگاہ اس حلقے میں، ایک خاص کیفیت کے ساتھ ممتاز ہیں۔ مُریدوں کو توجہ دے رہے ہیں۔ ہر میلے میں جس طرح عاشق مزاجوں کا بھی ایک جگھٹا ہوتا ہے یہاں بھی ہے۔ حسینوں کو دل رُبائی کا مشغلہ ہے۔ عاشقوں کو آہ وزاری سے کام ہے۔ دونوں کے باہمی معاملے نظیر کو اپنا عاشق بنائے ہوئے ہیں۔ وہ محویت کے ساتھ ان کے حالات دیکھ رہا ہے اور مزے لے رہا ہے۔

یہ اُمید تو کسی طرح کی جا نہیں سکتی کہ نظیر نے حضرت سلیم چشتی کی اس قدر مدحت اہلِ دُنیا کی خوش آمد یا ظاہرداری کی راہ سے کی ہو۔ ہر چند شیعوں میں تقیہ ہے، لیکن نظیر جس مزاج کا آدمی ہے، وہ اس قسم کا تقیہ کر نہیں سکتا۔ وہ اپنے خیالات کے ظاہر کرنے میں بڑا آزاد ہے۔ وہ جس قدر دل میں سمجھتا ہے اُتنا ہی ظاہر کرتا ہے۔ اس کے کلام کا کوئی حصّہ اس کی کوئی خیالی بُزدلی کو نہیں دکھاتا۔

ہر چند اس سے یقینی طور پر مستنبط نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سُنی تھا لیکن اس میں کسی طرح کا شک نہیں کہ اس کو مشائخ اور فقرا کے ساتھ ایک خاص خوش عقیدگی تھی۔ جس زمانے میں کہ وہ تھا، مسلمانوں پر ادبار اپنا پورا قبضہ کر چکا تھا۔ اقبال کا آفتاب

غروب ہوچکا تھا۔ راگ رنگ کی شفق پھول ہوئی تھی۔ مصائب کی شام تاریکی پھیلا رہی تھی۔ شامِ غربت کا عبرتناک سماں ہر مسافرِ زندگی کے پیشِ نظر تھا۔ قلوب عبرت کے اُداس اثر سے قدرتی طور پر متاثر تھے۔ دُنیا کے جاہ و اجلال کی بےثباتی ہر شخص کے دل پر نقش تھی۔ شامت زدہ اُمرا اپنی کوششوں کو بےحاصل اور ہمّت کو قاصر پاکر بزرگوں کی ہمّت سے مدد چاہتے تھے۔ افلاس زدہ غُربا خانقاہوں اور روضوں کی تسکین بار آب و ہوا میں کسی قدر تسکین پاتے تھے۔

مشائخوں کا بازار گرم تھا اور تصوف کے صبر و سکون بخش جنس کی بڑی دریادلی کے ساتھ خریداری ہو رہی تھی۔ مجاذیب کی قوّتِ جذب بہت بڑھ گئی تھی۔ ہزاروں آدمی بے اختیار کھنچے جا رہے ہیں۔ نوکری کی تلاش میں بہتیرا سر مارا۔ اُمّید واری کرتے کرتے ہار گئے۔ نہ ملی تو اب شاہ جھونپڑا کی خدمت میں دوڑے جا رہے ہیں۔ گورنمنٹ نے جاگیر ضبط کر لی۔ عرضیاں دیں۔ وکیل کے ذریعہ سے بہتیرا غُل مچایا۔ ایک نہ سُنی گئی۔ اب کسی نے کان میں پھونک دیا ہے کہ ٹکیا شاہ بڑے روشن باطن ہیں۔ عالم کا سیاہ و سفید انہی کے ہاتھ میں ہے۔ دن رات انھیں کے آستانے پر دھرنا دیے پڑے ہیں۔

کر بیٹھے ہیں فضلِ خداساز پہ تکیہ　　جب بن نہ پڑی بات کچھ اپنی تگ و دو سے (انشا)

نظیرؔ کوئی فرشتہ تو تھا نہیں کہ اپنے کو زمانے کے پُرزور اثر سے بچا لیتا۔ عبرت اور ہمدردی کی غیر معمولی قوت نے اس کو اور کمزور کر دیا تھا۔ وہ اخلاق کا جویا تھا، لیکن لوگوں میں کج اخلاقیاں عام تھیں۔ یہ کیمیا اس کو کیوں ملنے لگی تھی۔ صوفیوں کی گرد کا رواں اس کو اس کیمیا کی کچھ اُمّید دلاتی تھی۔ وہ اس گروہ کے ساتھ ہو لیا اور تا دمِ مرگ لپٹا رہا۔ محبّتِ اہلِ بیت تو صوفیوں کا بھی بڑا تمغا ہے۔ چونکہ فیضِ روحانی کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات سے قائم ہے۔ یہ محبّت ایک طبعی بات ہے۔ بعضوں کو تو یہ محبّت حدِ تفضیل تک لے گئی ہے اور اکثر متّہم بہ شیعت بھی ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے نظیرؔ کو مذہب بھی اس گروہ کے ساتھ عقیدت رکھنے میں مانع نہیں ہو سکتا تھا۔

صوفیوں میں بیٹھتے بیٹھتے اس پر عام جلوۂ باری کی حقیقت روشن ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ وحدۃ الوجود کا آفتاب کس طرح ہر ذرّے کے مطلع سے چمک رہا ہے۔ اس یقین کے ساتھ بھی اس کی زبان گُستاخ نہیں۔ وہ ادب کے قرینے ملحوظ رکھتا ہے۔

منصور کی طرح انا الحق کے شور سے توحید کی رُوئی نہیں دُھنکتا ـــــ عرفان کی عینک چڑھی ہوئی ہے۔ غور کے تال ادب کی کمانی میں جھک رہے ہیں۔ نگاہیں کہاں سے کہاں پہنچتی ہیں۔ کہتا ہے :۔

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان　　ہر باغ میں، ہر دشت میں، ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں بارنگ میں، نیرنگ میں پہچان　　منزل میں، مقامات میں، فرسنگ میں پہچان
نت رُوم میں، نت ہند میں اور زنگ میں پہچان　　ہر راہ میں، ہر ساتھ میں، ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان　　ہر دھوم میں، ہر صلح میں، ہر جنگ میں پہچان

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دِلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

پھل پات کہیں شاخ کہیں پھول کہیں بیل　　نرگس کہیں سوسن کہیں بیلا کہیں رابیل
آزاد کوئی سب سے کسی کا ہے کہیں میل　　ملتا ہے کوئی راکھ، چنبیلی کا کوئی تیل
کرتا ہے کوئی ظلم کو، لیتا ہے کوئی جھیل　　باندھے کہیں تلوار اُٹھاتا ہے کہیں سیل[1]
ادنا کوئی اعلا کوئی سوکھا کوئی ڈنٹھر پیل　　جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب کھیل

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان ـــــ الخ

گاتا ہے کوئی شوق میں، کرتا ہے کوئی حال　　پھانکے ہے کوئی خاک، اُڑاتا ہے کوئی مال
ہنستا ہے کوئی شاد، کسی کا ہے بُرا حال　　روتا ہے کوئی ہو کے غم و درد میں پامال
ناچے ہے کوئی شوخ بجاتا ہے کوئی تال　　پہنے ہے کوئی چیتھڑے، اوڑھے ہے کوئی شال
کرتا ہے کوئی ناز دِکھاتا ہے کوئی بال　　جب غور سے دیکھا تو اسی کی ہے یہ سب چال

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان ـــــ الخ

جاتا ہے حرم میں کوئی قرآن بغل مار　　کہتا ہے کوئی دَیر میں پوتھی کے سماچار[2]
پہنچا ہے کوئی پار بھٹکتا ہے کوئی وار　　بیٹھا ہے کوئی عیش میں، پھرتا ہے کوئی خوار
عاجز کوئی بے کس کوئی ظالم کوئی لٹھ مار　　مفلس کوئی ناچار، تواںگر کوئی زردار

---

[1] بھالا۔ برچھا۔ (ش)

[2] روایات۔ (ش)

زخمی کوئی ماندا کوئی اچھا کوئی بدکار   جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں سب اسرار
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان ـــــ الخ

ہے کوئی ولی دوست، کوئی جان کا دُشمن   بیٹھا ہے پہاڑوں میں کوئی پھرتا ہے بن بن
مالا کوئی جپتا ہے، کوئی شوق میں سُمرن   چھوڑے ہے کوئی مال، سمیٹے ہے کوئی دھن
نکلے ہے جواہر کے کوئی پہن کے ابرن   لوٹے ہے کوئی خاک میں رو رو کے ملا تن
جوگی کوئی بھوگی کوئی سوگی کوئی سوگن   جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب فن
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

سردی کہیں گرمی کہیں جاڑا کہیں برسات   دوزخ کہیں بیکنٹھ، کہیں ارض و سمٰوات
حوریں کہیں غلماں، کہیں پریاں کہیں جنات   اوجڑ کہیں بستی، کہیں جنگل کہیں ربوات
سختی کہیں راحت، کہیں گردش کہیں سکنات   شادی کہیں ماتم، کہیں نور اور کہیں ظلمات
تارے کہیں سورج، کہیں بُرج اور کہیں دن رات   جب غور سے دیکھا سب اسی کے ہیں طلسمات
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان ـــــ الخ

بیچے ہے جواہر کوئی زر سیم طلا رانگ   مارے کوئی پارے کو بناوے کوئی مرگانگ[1]
دیتا ہے کوئی ہاتھ سے لیتا ہے کوئی مانگ   محتاج کوئی قوت کا، رکھتا ہے کوئی دانگ
ٹھہرا ہے کوئی چور، لگاتا ہے کوئی تھانگ[2]   ملتا ہے کوئی پوست کو، چھانے ہے کوئی بھانگ
گھنٹا ہے کہیں جھانجھ، کہیں سُکھ کہیں بانگ   جب غور سے دیکھا تو اسی کے ہیں یہ سب سوانگ
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان

ناری کوئی بادی، کوئی خاکی کوئی آبی   صوفی کوئی زاہد، کوئی بدمست شرابی
باتیں کوئی بیٹھا ہوا کرتا ہے کتابی   پیتا ہے کوئی کیف کوئی مئے کی گلابی
مارے ہے زٹل کوئی، کہیں جیب ہے دابی   سچا کوئی جھوٹا ہے، کوئی رند خرابی
کالا کوئی گورا کوئی پیلا کوئی آبی   ہیں اس کی ہی قدرت کے یہ سب لال گلابی
ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان ـــــ الخ

---

[1] مرگانگ ـــ کشتہ (ش)۔
[2] تھانگ ـــ چوری کا مال رکھتا ہے۔ (ش)

کیا حُسن کہیں پایا ہے اللہ ہی اللہ　　کیا عشق کہیں چھایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا رنگ یہ رنگوایا ہے اللہ ہی اللہ　　کیا نور یہ جھمکایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا دُھوپ ہے کیا سایہ ہے اللہ ہی اللہ　　کیا بہروپ، کیا مایا ہے اللہ ہی اللہ
کیا ٹھاٹھ یہ ٹھہرایا ہے اللہ ہی اللہ　　کیا بھید نظیرؔ آیا ہے اللہ ہی اللہ

ہر آن میں، ہر بات میں، ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر ہر اک رنگ میں پہچان

مصنوع میں صانع نظر آوے تو نظیرؔ آہ　　نزدیک ہی کیا ہے کہ جہاں دُور کی سُوجھی

توحید کے وِلّی دروازے سے نکل کر صُلح کُل کے اجمیر کی طرف میاں نظیرؔ کس آسانی سے جا رہے ہیں۔ حرم سے دیر تک ان کو کوئی زیادہ فاصلہ نظر نہیں آتا۔ قرآن اور پوتھی دونوں کو وہ ایک ہی جزودان میں رکھتے ہیں۔ تسبیح اور سُمرن دونوں کو ایک ہی ہاتھ سے پھیرتے ہیں۔ صوفی کو جوگی اور زاہد کو بھوگی سے بغل گیر دیکھتے ہیں چھانجھ، گھنٹے، سنکھ سب سے اذان کی آواز سُنتے ہیں۔

فقرا کے تکیے پر سریع الاعتقادی اور عجائب پرستی نے ان دنوں ہندوؤں کا بھی ایک بڑا بھاری میلہ لگا رکھا تھا۔ یہی حال جوگیوں اور سنیاسیوں کے استھانوں میں مسلمانوں کا تھا۔ حاضرین کے تقاضوں سے اسلام اور کُفر دونوں قدرتی طور پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کو بڑھ رہے ہیں۔ شیخ و برہمن نے آپس میں صُلح کر لی تھی۔ عرفان کے محکمے میں توحید نے اس صُلح نامے پر مہر کی تھی۔ رام اور رحیم کا تفاوت اٹھ گیا تھا۔ اوتار اور پیمبر مُرادف قرار پا چکے تھے۔ گرونانک اور کبیرداس کے مقبول اسکولوں میں ہر مذہب کے اذکیا کثرت سے داخل ہو رہے تھے۔ بہت سے تعلیم پا کر نکل بھی چُکے تھے۔ جن میں سے بعض اپنی غیر معمولی ذہانت اور مناسبت طبع سے اعلا درجے کے پروفیسر بن گئے جاتے تھے۔ نظیرؔ بھی انہی ممتاز لوگوں میں تھا۔

ہندو مُسلمان دونوں کی نظر میں ایک خاص وقعت تھی۔ دونوں مذہب کے لوگ اس کو اپنا روحانی پیشوا جانتے تھے۔ گھنٹوں آ کر اس کی صحبت میں بیٹھتے اور پہروں عرفان کے رنگ میں ڈوبی ہوئی باتوں سے اس کی فائدہ اُٹھاتے۔ بہتیرے اس

سے دُعا کی درخواست کرتے اور اس کی ہمّت درویشانہ کو نہایت درجے اپنی سعادت کا موجب سمجھتے۔

میں نے میاں نظیرؔ کی نواسی سے ایک خاص ملاقات کی۔ اُنھوں نے مذہب کے سوال پر فرمایا کہ میاں نظیرؔ کا طریقہ امامیہ تھا۔ لیکن صُلحِ کُل کے آدمی تھے۔ کسی سے جھگڑا نہیں۔ ہندوؤں میں ہندو تھے اور مسلمانوں میں مسلمان تھے۔ تعزیہ داری ان ہی کے زمانے سے چلی آتی ہے۔ پچاس دن تک چہلّم تک ہوتی ہے۔ پوچھا کہ کنہیّا کا جنم۔ مہادیو کا بیاہ وغیرہ کیوں لکھا۔ کہا ہندوؤں کے ہاں نوکر تھے۔ کسی وقت میں ان لوگوں کی فرمائش ہوئی۔ تعصّب تو مزاج میں تھا ہی نہیں۔ موج آئی لکھ دیا۔

پوچھا نماز بھی پڑھتے تھے۔ کہا۔ ہاں پڑھتے تھے۔ پنج وقتہ۔ لیکن وہی اپنے طریقے پر۔ پوچھا عید کی نماز کہاں پڑھتے تھے۔ کہا اپنے گھر میں۔ سب عید ملنے کو آتے تھے۔ پوچھا حج و زیارت کربلا وغیرہ کو تشریف لے گئے تھے۔ کہا نہیں۔ ان دنوں ریل وغیرہ تو تھی نہیں۔ پوچھا کسی بُزرگ سے ارادت تھی۔ کہا۔ مُرید تو کسی کے نہ تھے لیکن ہاں فقراء کے ساتھ اکثر اُٹھتے بیٹھتے رہتے تھے۔ اور ان لوگوں کے ساتھ ان کو ایک خاص عقیدت بھی تھی۔ مکان کے پاس ہی ایک مسجد تھی۔ جو ابھی تک موجود ہے۔ اس میں غلام رسول ایک بُزرگ رہتے تھے۔ بہت بڑے مشائخ تھے۔ پیری مُریدی کرتے تھے۔ ان میں اُن میں بڑا ربط تھا۔ وہ بھی آتے تھے۔ یہ بھی ان کے ہاں جاتے تھے۔ انہی غلام رسول کو لوگ خواجۂ مُعظم بھی کہتے تھے۔ ان کے چار بیٹیاں تھیں۔ ایک میرن کو بیاہی تھیں۔ شاہ غلام رسول نے اپنے داماد میاں میرن ہی کو گدّی دی۔ ان کے ان کا نواسا نثار علی ہوا۔

مولوی وحید الہ آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے ایک بزرگ شاہ محمد اکبر صاحب ہیں۔ دانا پور میں ان کا سجادہ ہے۔ ابوالعُلائی طریقے میں ان کو فیض ہے چونکہ حضرت میر ابوالعُلا کا مزار متبرک[1] اکبر آباد میں ہے یہ وہاں ہر سال جاتے ہیں۔ اور عُرس کی مشاطگی سے شاہ عقیدت کو دُلہن بنا کر لے آتے ہیں۔ مُریدوں کی ان کے وہاں ایک

---

[1] عُرس نویں صفر کو ہوتا ہے۔ (ش)

بڑی جماعت ہے۔ ان کی عقیدت مندانہ مہمان نوازی کبھی کبھی ان کو چھ چھ مہینے بھی وہاں روک رکھتی ہے۔ غرض یوں ان کی زندگی کا بہت بڑا زمانہ آگرے میں گزرا ہے اور وہاں کے خانقاہی صوفیانہ تفصص پر اُن کو غالباً زیادہ عبور حاصل ہے۔ ایک دوست کی وساطت سے نظیر کے مذاقِ تصوّف کی نسبت انہی سے یہ حالات معلوم ہوئے۔

حضرت مولانا فخرالدّین جو دہلی کے اکابر مشائخ میں تھے اور اکثر شاہ زادے اور اُمرا ان کے مُرید تھے وہ ایک دفعہ اکبرآباد تشریف لائے اور حضرت سیّدنا میرابوالعلاۓ اکبرآبادی کے مزار مبارک پر چند ماہ مُعتکف رہے۔ اسی زمانے میں حضرت مُلّا (کتابوں میں میر لکھا ہے) محمّدی بدایونی المتخلص بہ بیدارؔ، جن کا مزار اکبرآباد کناری بازار دانت کے کٹرے میں واقع ہے، یہ نظیر کے بڑے دوست تھے۔ یہ اور نظیر دونوں حضرت سیّدنا میرابوالعلائے اکبرآبادی کے مزار مُبارک کے حاضر باش تھے۔ وہیں مولانا سے ملاقات ہوئی۔ اور ان کے حلقۂ استرشادؔ[1] میں آئے۔ اور وہیں سے مذاقِ تصوّف پیدا ہوا۔ میر محمّدی بیدار کاحال باطن یوں تحریر کرتے ہیں۔ اصل ان کی دہلی ہے۔ ذی علم آدمی تھے۔ عہد شباب کو سرائیں بسر کیا۔ جو شاہجہاں آباد سے تین کوس ہے۔ حضرت مولوی محمد فخرالدّین صاحب کے آگے سرِ عقیدت جھکایا اور ان کے انفاس متبرکہ سے فائدہ ظاہری و باطنی اُٹھایا۔ آغاز صبح پیری میں اکبرآباد تشریف لائے۔ کٹرۂ دندان فیل میں قیام کیا۔ دو دیوان کے مالک ہیں۔ اُردو میں غفر شعرا میسر درد سے ان کو فیض سخن حاصل تھا اور فارسی میں مرتضٰی اقلی بیگ فراق سے۔ جدِّ امجد راقم سے اُخوّت برتتے تھے۔

جب مولانا فخرالدین کا ذکر آ ہی گیا تو کچھ ان کے حالات اور کمالات بھی سُن لینے چاہئیں۔ داڑھی خشخشی رکھتے تھے۔ مسی بھی لگاتے تھے۔ پان کی گلوری بھی ہر وقت مُنہ میں دبی رہتی تھی۔ کپڑے بھی نفیس پہنتے تھے۔ معمول ان کا یہ تھا کہ ہر روز جامع مسجد نماز کو جاتے۔ ایک دن کسی شُہدے نے دیکھا کہ مولانا چھیلا بنے مسجد

---

[1] ارشاد لینے والا۔ (م)

جا رہے ہیں، یہ کمبخت تو غضب ہی ہوتے ہیں۔ کڑکڑک کر وہیں سے یوں آوازہ کسا کر اے اودھکار کہاں جاتا ہے۔ یہ کیوں تو نے شہزادوں کو مکر کے جال میں پھانس رکھا ہے اور کیوں اپنے ساتھ ان کی مٹی بھی پلید کرتا ہے۔ مولانا سُن کر مُسکرا دیے اور آدمی سے کہا کہ اس کو دو روپے دے دو۔ اب روز کا یہ معمول ہوا کہ شہدا ان پر آوازے کسے اور وہ اس کو دو روپیہ دِلوا دیا کریں۔ رفتہ رفتہ یہ خبر پھیلی تو لوگوں نے اس شہدے کو ڈرایا کہ بخت تو اتنے بڑے بزرگ کو یوں کہا کرتا ہے۔ خدا کے غضب سے نہیں ڈرتا۔ بچّا کسی دن بد دُعا کر دیں گے تو پھر کہیں ٹھکانا بھی نہ رہے گا۔ یہ سُن کر شہدا بھی جی میں ڈرا۔ دوسرے دن جو مولانا اِدھر سے گزرے تو اس نے کچھ کہا سُنا نہیں۔ جب حضرت مسجد سے لوٹ چلے تو شہدے نے کہا حضرت میرا معمول؟ آپ نے فرمایا اور میرا معمول؟ سُبحان اللہ کیا لوگ تھے اور کیا نفوس تھے!

نظیر کو اس میں شک نہیں کہ اگر وہ صوفیہ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ وہ چاہے کسی کا مُرید نہ دیا نہ ہو لیکن اس کا دل خوش عقیدگی کے نور سے روشن تھا۔ مشائخ صوفیہ اس کے کلام سے استنباط کرتے ہیں کہ وہ صاحب نسبت تھا۔ واقعیؔ جب تک کوئی بات دل میں نہ ہو، کلام اس قدر پُراثر ہو نہیں ہو سکتا۔ تصوّف کے مذاق میں جو مضمون لکھتا ہے ایسا گہرا رنگ اس کا ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے تو ہر معمولی دل پر اپنا رنگ جھکا دیتا ہے[1]۔

مولوی عبدالعلی صاحب جائس کے رہنے والے جو کبھی پٹنے کے نارمل اسکول میں مدرس بھی تھے۔ انھوں نے ان کے کمال کی نسبت یہ حکایت بیان کی کہ کسی دن میاں نظیر بازار میں چلے جا رہے تھے۔ کسی طرف سے سرکاری پیادہ آیا۔ ان کو مبتذل حال سمجھ کر پکڑا اور اپنی گٹھری ان کے سر پر رکھی اور کہا چل۔ انھوں نے دم نہ مارا۔ چُپکے اُٹھائی اور آگے آگے چلے۔ پیادہ اب جو نظر کرتا ہے تو عجیب تماشہ اس کے پیشِ نظر ہے۔ گٹھری سر سے بالشت بھر اُونچی ہے۔ نہ زمین پر گرتی ہے نہ آسمان پر اُڑتی ہے میاں نظیر کے ساتھ معلّق ہوا میں جا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر پیادے کے تو ہوش اُڑے۔

---

[1] ہیں یار بڑے جو اہلِ دل اکثر کہتے ہیں   چھوٹا سا اک نظیر بھی ہے خاکِ پائے دِل (ش)

قدموں پر گر پڑا اور بہت معذرت کی۔

دوسری حکایت اتنی عجیب تو نہیں مگر صحیح اور جوہرِ طبع دکھانے میں زیادہ بلیغ ہے۔ خود ان کی نواسی نے مجھ سے بیان کیا کہ نانا جان روزانہ تاج گنج سے آگرے جاتے تھے۔ گھوڑے کی سواری ہوتی تھی۔ ایاز خدمت گار ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ رستے میں تو کہیں گھوڑا کھڑا ہو جاتا تو نہ کوڑا مارتے، نہ ایڑ کرتے، نہ لگام کا جھٹکا دیتے۔ مرضی پر چھوڑ دیتے۔ خود چلا تو چلا نہیں میاں ایاز آئے اور باگ ڈور پکڑ کر بڑھا دیتے۔

میں نے پوچھا کہ اس اتنی احتیاط کا کیا سبب تھا۔ فرمایا، اس کے متعلق کسی زمانے میں ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ اسی طرح چلتے چلتے ان کا گھوڑا اڑ گیا۔ کوڑا جو مارتے ہیں تو پیچھے آ رہا تھا کوئی راہ گیر، اس کے لگا۔ یہ فوراً گھوڑے پر سے اتر پڑے اور قدموں پر گر پڑے۔ بہت معذرت کی۔ غضب تو یہ اصرار تھا کہ کوڑا حاضر ہے۔ تو بھی مجھے کوڑا مار لے۔ مجھ سے بے شک تقصیر ہوئی۔ جب تک تو کوڑا نہ مارے گا میں کل نہیں پانے کا اور تیری جان نہیں چھوڑنے کا۔ یہ ادا دیکھ کر کسی کے دل میں غصّہ کب رہ سکتا ہے۔ مارنا تو کجا مگر اصرار جب حد سے بڑھا تو کچھ یوں ہی رسم اس نے ادا کر دی۔ اسی دن سے انھوں نے ہاتھ میں کوڑا رکھنے ہی سے توبہ کی۔

مرزا نوازش علی بیگ کہتے تھے کہ خلیفہ گلزار علی بھی میاں نظیر کی ولایت کے قائل تھے وہ کہتے تھے کہ جب تک ابّا جان پر فالج نہیں گرا تھا۔ میں نہایت بدشوقی کے عالم میں پڑھتا رہا۔ اکثر پڑھنے سے جان چُراتا رہا۔ ابّا نے مجھ کو اپنے ساتھ لے لیا ہے۔ جا رہا ہوں۔ چلتے چلتے کلیجہ تھام کر یکا یک چیخ اُٹھا۔ ابّا نے پوچھا خیر ہے۔ کہا پیٹ میں شدّت کا درد ہے۔ چھریاں لگ رہی ہیں۔ وہیں سے واپس ہو گیا۔ یہ معاملہ ایک دو دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ ہوا اس طرح کر اور سینکڑوں حیلے ایجاد ہوا کرتے تھے لیکن جب ان پر فالج کا مادہ آ کر پڑا، تین روز تک بے ہوش رہے چوتھے روز ان کو ہوش آیا۔ تو انھوں نے پوچھا کوئی میری جگہ پڑھانے بھی گیا۔ میں نے کہا آپ کے سوا یہاں پڑھانے کی قابلیت کس کو ہے۔ میں نے ابھی گلستاں بھی تمام نہیں کی — وہ لوگ ظفر ابوالفضل پڑھتے ہیں۔ کہا جاؤ بھی تو سہی۔ ارشاد سے ان کے گیا۔ اور ان کی دُعا سے کچھ ایسا باہرہ کھُلا کہ پھر کوئی کتاب مشکل ہی معلوم نہ دی۔

حقیقتہً یہ بھی ان کا ایک تصرّف تھا۔

نظیر کا مذاقِ موسیقی

نظیر کے ہر فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا گُن رسیا تھا۔ یوں تو شعراء کے لیے کچھ نہ کچھ مذاقِ موسیقی کا ہونا ضروری ہے لیکن ہم نظیر میں وہ خاص قدرتی مادّہ پاتے ہیں جو اچھے موسیقی دانوں کے حصّے میں آتا ہے۔ وہ آوازوں کی رُتبہ شناسی کا بڑا ماہر پروفیسر ہے۔ وہ اکثر اپنے کلام میں بعض خاص موقعوں پر بعض خاص اثر پیدا کرنے کی ضرورت سے الفاظ کو اس انتظام سے ترکیب دیتا ہے کہ معانی اور صورتِ عبارت میں ساز اور گویّے کا سا دلچسپ اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ لڑائی یا زور آزمائی یا اسی قسم کے اور مضامینِ مردانہ جب وہ بیان کرتا ہے اکثر ٹے اور ڑے یا اسی قسم کے بعض خاص حروف کا اس سلیقے کے ساتھ اہتمام کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے واقعی چوٹیں چل رہی ہیں اور میدانِ معرکہ اپنی خاص آوازوں سے گونج اُٹھا ہے۔ خیبر کی لڑائی میں، سنگھاڑا۔ کڑاڑا۔ کو قافیے میں ڈال کر نظم میں ایک حربی شان پیدا کرتا ہے۔

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا   للکارتے ہی اُس نے ہمیں آن لتاڑا
گر ہم نے پچھاڑا اُسے، گر اس نے پچھاڑا   اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کُشتی کا اکھاڑا
گر ہم بھی نہ ہارے، نہ ہٹا ریچھ کا بچّا

جہاں گانے بجانے اور بزمِ نشاط کی دھوموں کا ذکر ہوتا ہے وہاں اُسی فطری موسیقی خیز سلیقے سے وہ ایسے ایسے الفاظ اکٹھے کرتا ہے اور اس ترکیب سے کہ صاف معلوم ہوتا ہے مجلس جمی ہوئی ہے، پکھاوج اور جوڑی[1] کی جوش انگیز آوازیں صاف آ رہی ہیں۔

جن شعروں میں الفاظ سے ساز کا کام لیا گیا ہے وہ بکثرت ہیں۔ مگر چند ممتاز مثالیں تشریح کے لیے ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

---

[1] جوڑی۔ وہ منجیر جو طبلے کے ساتھ بجائے جاتے ہیں۔

(ش)

کچھ طبلے کھنکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی
کچھ جھڑ بین بین ربابوں کی، کچھ سارنگی اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھمی[1] اور مُنہ چنگ بجی
کچھ گھنگرو کھٹکے جھم جھم جھم، کچھ گیت گت پر آہنگ بجی
ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

محبوب پری رُو پیاروں کی ہر جانب نوک جھوکی ہے
کچھ آن رنگیلی چلتی ہے، کچھ بان اُدھر سے روکی ہے
کچھ سُنیپن ترچھی سحر بھری، کچھ گھات لگاوٹ خوکی ہے
کچھ شور اہا ہا ہا ہا کا، کچھ دھوم اُہو ہو ہو کی ہے
یہ عیش، یہ خط، یہ کام، یہ ڈھب ہر آن جتایا ہولی نے

بحر بھی اس نظم کی ہولی کے مضامین کے لیے کس قدر موزوں ہے۔

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گل رو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی، کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے، کچھ عیش کے دم مُنہ چنگ بھرے
کچھ گھنگرو تال چھنکتے ہوں، جب دیکھ بہاریں ہولی کی

اُس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو
مُنہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو، ہر آن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو بے ہوشی ہو، بھڑوے کی مُنہ میں گالی ہو
بھڑوے بھی بھڑوا بکتے ہوں، جب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھویّوں کے لڑکے
ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں، کچھ گھٹ گھٹ کے کچھ بڑھ بڑھ کے
کچھ ناز جتاویں لڑ لڑ کے، کچھ ہولی گاویں اُڑ اُڑ کے
کچھ لچکے شوخ کمر پتلی، کچھ ہاتھ چلے، کچھ تن پھڑکے
کچھ کافر نین مٹکتے ہوں، جب دیکھ بہاریں ہولی کی

اسی طرح اور مقامات بھی ہیں جہاں لفظ باجے کا کام دیتے ہیں۔ چڑیوں کا اگر کہیں ذکر ہے تو معلوم ہوتا ہے ان کا ایک جھُنڈ پیشِ نظر ہے اور ان کے چہچے کی آوازیں پیہم آ رہی ہیں۔ اگر وحوش کا کہیں مذکور ہے وہی اپنا شور اور شور کے ساتھ سُنا رہے ہیں۔

یہ تعبیرِ صوت ایک خاص سلیقۂ موسیقی دکھاتی ہے جو بغیر اس کے کہ انسان میں فطرت کی طرف سے ودیعت ہو، یوں آدمی کو میسّر ہو نہیں سکتا۔

---

[1] بزم سرود خوباں میں گو مردنگیاں شاہن بجیں
ساتھ فقیر کی ڈھولک کے اب ڈھمڈھمیاں رنگین بجیں
مصحفی۔ (ش)

نظیر کی نواسی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں جب ناناجان کے پاس جاتی تھی تو وہ میرے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور مجھ کو دیکھ کر یہ گیت گانے لگتے تھے۔

موہن میرے آئے، للن میرے آئے، گجن میرے آئے

موجی جو ایک مشہور کلانوت تھا اس کو نظیر سے تلمذ تھا۔ اور اس کا بیٹا لہر بھی انہی کی شاگردی کا دم بھرتا تھا۔ موجی علاوہ اس کے کہ فنِ موسیقی میں بہت بڑی مہارت رکھتا تھا۔ گیت تصنیف بھی کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی شعر بھی موزوں کرتا تھا۔ کیا گیت اور کیا غزل دونوں کو میاں نظیر کی اصلاح بے نظیر بناتی تھی۔ موجی کے گیت یوں تو بہت مشہور ہیں مگر ایک گیت جو باعتبارِ مضمون بالکل نظیر کے صوفیانہ مذاق سے مالامال ہے اور یقیناً ان کی اصلاح نے اس کی وضاحت کی لے قائم کی ہے اس کا ذیل میں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس گیت کی دُھن زیلف کی ہے۔

آستائی، بڑھیا سوچ سوچ من میں پچھتائی، اپنا اب کا کیجے پر کھا بھیا پُرانا۔ چلتا نہیں پھیر پھیر ہوں۔ اَری[الف]، اترا، ڈگمگات پڑی، ہلنے لگی لاٹ مال، لرجت ہی گریا، تکل[1] بل پریو، چمرک[2] ٹوٹ دھمکرا بھیو، بکلی پنکھڑیا[3]، پنساری۔

ابھوگ۔ آوے گا آگاہی[4] والا۔ مانگے گا جمع جب۔ سوت نہ کپاس۔ نہیں گُذری کی آس۔ موجی کہیں اب عمر گنوائی یوں ہی اپنی ساری۔

نظم میں بھی اس مضمون کو دوسرے پہلو سے ادا کیا ہے۔

نوچی جو وفادار کوئی پاس رہی آ   تو روٹی رلی ورنہ لگی کاتنے چرخا[ب]
جب کبڑی کمر ہوگئی اور سر ہوا گالا   منہ سوکھ کے چمرخ ہوا اور تن ہوا تکلا
پھر روئی کو چرخے سے کما کھاتی ہے بڑھیا

---

[1] تکل ــــ تکلا (ش)

[2] چمرک ــــ چمرخ۔ وہ چمڑے یا مونج کی پتلی سی چیز جو چرخے کی لاٹھ اور دونوں گڑیاؤں میں رہتی ہے اور اس کے اندر تکلا پھرتا ہے۔ (ش)

[3] پنکھڑی چرخے کے چکر کا وہ ہر ایک حصّہ جو اس کے مندلے میں ٹھکا ہوا ہوتا ہے۔ (ش)

[4] آگاہی والا تحصیل دار، ملک الموت نکیرین۔ (ش)

(الف)۔ ہاری   (ب) چرخا

نظیر کی بہتیری غزلیں انہی میاں موتج کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ کیونکہ یہ خود اپنی طرف سے یا نظیر کے ارشاد کے مطابق ان کی دُھنیں قائم کرکے دلفریب طور سے گاتے تھے اور تمام شہر میں مشہور ہو جاتی تھیں۔ بہت سے دوہے بھی یہ کہا کرتے تھے۔ وہ بھی گانے کے مصرف میں آتے تھے۔ میاں ریاض ایک شخص ہیں۔ آگرے میں ان سے مجھے ایک دوست نے ملایا۔ ان کو گانے کا شوق ہے اور اچھا گاتے ہیں۔ مجھے بھی اپنے گانے سے محظوظ کیا۔ اور نظیر کا وہ ترکیب بند فارسی و ہندی سنایا۔ جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

مجھے اے دوست تیرا ہجر اب ایسا ستاتا ہے ۔۔۔ کہ دشمن بھی میرے احوال پر آنسو بہاتا ہے
یہ بے تابی، یہ بے خوابی، یہ بے چینی دکھاتا ہے ۔۔۔ نہ دل لگتا ہے گھر میں اور نہ صحرا مجھ کو بھاتا ہے
اگر کچھ منہ سے بولوں تو مزا الفت کا جاتا ہے ۔۔۔ وگر چپکا ہی رہتا ہوں، کلیجہ منہ کو آتا ہے
مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ۔۔۔ وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

کوک کروں تو جگ ہنسے اور چپکے لاگے گھاؤ
ایسو کٹھن سینہ کا کس بدھ کروں اوپاؤ

مانڈ کی دُھن میں انھوں نے گایا تھا۔ اُداسی کا سماں ایسا چھایا کہ دل لوگوں کے بے اختیار ہو گئے۔

ایک معزز دوست نے ڈھاکے کے مجھ سے کہا کہ اُس نے ایک رنڈی کو وہ غزل بھی گاتے سُنا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

خرامِ ناز سے اس شوخ نے دامن کو جب جھٹکا ۔۔۔ تو میری خاک نے کیا کیا ہوا کے ساتھ سر پٹکا
نہیں گھٹّا عبادت کا تیرے ماتھے پہ اے زاہد ۔۔۔ نشاں ہے یہ کسی معشوقِ بے پروا کی چوکھٹ کا

گا کر دُھن بھی بتائی۔ نہایت پیاری تھی۔

نظیر کی عُمر کا بہت بڑا حصّہ عیش و نشاط کی مجلسوں میں گزرا تھا۔ اس کی نظر سے سب ہی محفلیں گزری تھیں۔ جن میں عُمدہ سے عُمدہ رنڈیاں اور کلانوت موسیقی میں اپنا جوہر دکھاتے تھے۔ کوئی اُستاد گویا ایسا نہ تھا جس کو نظیر نے نہ سُنا ہو۔ رنڈیوں کے کوٹھوں پر بھی ان کی آمد و رفت جاری تھی اور وہاں یہ آتے جاتے، خواہ مخواہ مذاقِ موسیقی سے آشنا ہو گئے تھے۔ غرض ان کے دماغ میں موسیقی کے متعلق نہایت دلچسپ یادداشت پیدا ہو گئی تھی۔ جب کبھی کسی بزم میں عیش و نشاط کا وہ ذکر چھیڑتے

ہیں، ان کے دل ہیں مضامین قدرتی جوش و خروش کے ساتھ اُبلنے لگتے ہیں اور ناظرین کے لیے ایک اچھی خاصی لفظی بزم طرب قائم ہو جاتی ہے۔ جس سے نہایت دلکش تانیں سُنائی دیتی ہیں۔

جس شخص کو اس قدر گانے بجانے کی صحبتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا اور گویوں اور کلاونتوں سے سابقہ رہا ہو، وہ اگر معمولی آدمی بھی ہو تو بہت سی اصطلاحوں سے واقف ہو جاتا ہے، چہ جائے کہ ایک ایسا مستند شاعر جس کی ذہانت کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر بایں ہمہ مجھ کو کلیات بھر میں گنتی کے چند شعر ملے ہیں جن میں نظیر نے کوئی موسیقی کی اصطلاح درج کی ہے۔

اک پاؤ سیر آٹے کی دل میں لگا کے آس　　گوری کا وقت ہووے تو گاتا ہے وہ بھیاس
پھر راگ بسنتی کا ہوا آن کے کھٹکا　　دھونسے کی برابر وہ لگا باجنے مٹکا
جھنکار تال کی ہے اور طبلے کی کڑک ہے　　گونڈ[الف] اور ملار کے ساتھ آواز کی گمک ہے

موسیقی سے لذت اُٹھا اُٹھا کر جو بعض پُرلطف بند لکھے ہیں اُن میں سے بعض یہ ہیں۔

پھر آن کے عشرت کا مچا ڈھنگ زمیں پر　　اور عیش نے عرصہ ہے کیا تنگ زمیں پر
ہر دل کو خوشی کا ہوا آہنگ زمیں پر　　ہوتا ہے کہیں عیش کہیں رنگ زمیں پر
بجتے ہیں کہیں تال، کہیں رنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

گھنگرو کی پڑی آن کے پھر کان میں جھنکار　　سارنگی ہوئی بین طنبوروں کی مددگار
طبلوں کو ٹھیکے طبل پہ سازوں کے بجے تار　　راگوں کے کہیں غل کہیں ناچوں کے بندھے تار
ڈھولک کہیں جھنکارے ہے مردنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

تال، رنگ، گھنگرو، سارنگی، بین، طنبورے، طبلہ، ڈھولک، مردنگ سبھی پڑے بج رہے ہیں۔

الف　گوری ملار

گاگا کے پکاریں کہیں رنگوں کی چھڑک ہے   میناکی بھبک اور کہیں ساغر کی چھلک ہے
طبلوں کی صدائیں، کہیں تالوں کی جھنک ہے   تالی کی بہاریں کہیں ٹھلیا کی کھڑک ہے
بجتا ہے کہیں دف کہیں مُرچنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

چڑیوں کی موسیقی۔

کالی گھٹا ہے ہر دم برسیں ہیں مینہ کی دھاریں   اور جس میں اُڑ رہی ہیں بگلوں کی سو قطاریں
کوئل پپیہے کوکیں اور کُوک کر پکاریں   اور مور مست ہو کر جوں کو کلا جھنگاریں
آ یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشہ

وقتِ سحر کی رَدمیں کیا کیا ہُوں بُوں ہُوں ہُوں کرتی ہیں
ہُوں ہُوں ہُوں ہُوں کر کر ذکر کُن اور فیکوں کرتی ہیں
مُرغے بولے ککڑوں کوں کوں مُرغیاں کوں کوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب یاد ہیں اس کی بھتوں بھتوں کرتی ہیں

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چُوں چُوں چُوں چُوں کرتی ہیں
چُوں چُوں چُوں چُوں چُوں چُوں کیا سب بچوں بچوں کرتی ہیں
قُمری بولے حق سرہ[1] بُلبل بولے بسم اللہ   کبک ٹیٹری چاروں قل اور تیتر بھی سبحان اللہ
داوُر مور[2] پپیہے کوئل کوک رہے ہیں اللہ اللہ   فاختہ کُوکُو، تیہو ہُو ہُو، طوطے بولیں حق اللہ
سانجھ سویرے ۔۔۔الخ

ڈر کر جانوروں کے چیخنے چلّانے کی تصویر

سُن سُن وہ چیخیں[الف] اُن کی چڑیاں جو چُوں چُوں آئیں   کوّے پکارے غاں غاں، چیلیں بھی چل چلائیں
سارو، بٹیر، مینا، چمگادڑیں بھی آئیں   مُرغوں نے ککڑوں کوں کی، کل کلیاں پھڑ پھڑائیں
سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یاروں کل بلبلیں لڑائیں

---

[1] حق اللہ پاک ذات اللہ یہ جملہ اکثر طوطے کو یاد کراتے ہیں۔ (ش)

[2] داور۔ مینڈک، گیتوں میں یہ لفظ مور کے ساتھ اکثر آتا ہے۔ (ش)

(الف) چیں چیں۔ (ش)

چلاّئے مور سارس اور پھڑپھڑائے گھگّو　　گدا اور جغد دہاڑے[1] اور پھڑپھڑائے[(ب)] اُلّو
کتّے بھی بھونکے بھوں بھوں گیدڑ پکارے ہو ہو　　بکڑوے گدھے بھی رینگے[2] کر ڈینچو ڈینچو

سو سو طرح کی دھومیں اک دم میں کر دکھائیں
اس ڈھب سے ہم نے یارو کل بلبلیں اڑائیں

اسی طرح بہتیری مثالیں ہیں جن سے فصاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ نظیر کو مفہوم کو بہ اعتبار آواز الفاظ کے ساتھ مطابق کرنے کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ جہاں بھنگ کے گھٹنے کا ذکر کرتا ہے۔ ٹے اور ڑے وغیرہ ثقیل حرفوں کی کثرت سے ایک ایسی ترکیب پیدا کر دیتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے واقعی کونڈی اور سونٹا کھڑک رہا ہے اور یہ سلیقہ ایک فطری مادہ موسیقی کا اس کی ذات میں بتاتا ہے۔

---

[1] دہاڑنا۔ شیر کا گرجنا۔ چنگھاڑنا۔ غل مچانا۔ چلاّنا۔ شور کرنا۔ (ش)
[2] رینگنا۔ گدھے کا بولنا۔ ڈینچوں ڈینچوں کرنا۔ (ش)　　(الف) چیں چیں　(ش)
(ب) تر پھڑائے۔ (ش)

باب 4

نظیر کے شاگرد

نظیر کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک تو معلم کی دوسری شاعر کی۔ دونوں حیثیتوں سے ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ معلمی کی تو آخیر عمر تک انھوں نے نوکری ہی کی۔ شاعری میں گو کسی کے نوکر نہ تھے، لیکن کمال شاعری کا کچھ یہ ٹیکس سا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اپنی بہت ساری اوقات نومشقوں کی اصلاح و تربیت میں صرف کرے۔ اس ٹیکس کو نظیر نے بھی اپنی طبعی فیاضی سے بڑی سیر چشمی کے ساتھ ادا کیا تھا۔ گو اس زمانے میں آنے جانے کے سامان اس قدر کم ترقی بالا نشین نہ تھے لیکن اس پر بھی لوگ دور دور سے آتے تھے اور شرف تلمذ سے مشرف ہوتے تھے۔ شہر میں تو شاید بہت ہی کم طباع ہوں گے جو کھینچ کر اس کے حلقۂ شاگردی میں نہ آ گئے ہوں جن بزرگوں کو کھلی کھلی شاگردی بعض وجوہ سے خلاف شان معلوم ہوتی تھی وہ صحبت سراپائے تربیت سے بالتا یہ کسب فیض کرتے تھے۔ اتنے تو شاگرد، لیکن امتداد زمانہ کے سبب آغاز تلاش میں تین چار سے زیادہ نام مجھ کو معلوم نہ ہو سکے۔ ایک تو خود ان کے بیٹے خلیفہ گلزار علی اسیر دوسرے میاں مداری خمیر۔ اور دو ایک۔ ورنہ تو کسی طرح خیال ہوا نہیں کہ نظیر کے کل میں یہی تین چار شاگرد ہوں گے۔ ہوا تو یہ افسوس ہوا کہ اتنے بڑے شاعر کے ساتھ اہل زمانہ نے کتنی بڑی بدسلوکی کی ہے۔ وہ تو خدا حکیم میر قطب الدین باطن کا بھلا کرے جنھوں نے جوش غیرت میں آ کر گلشن بے خار کے جواب میں گلستان بے خزاں المعروف بہ نغمۂ عندلیب لکھی۔ اور پوری طرح نظیر کا حق

شاگردی ادا کیا۔ گلشن بے خار کے مؤلف نواب مصطفٰے خاں شیفتہ حکیم مومن خاں کے ارشدِ تلامذہ میں داخل تھے۔ ایک تو خود نوابی مزاج۔ اُوپر سے پڑی حکیم مومن خاں کی تعلیم جو دُنیا[1] میں سوا اپنے کسی کو مال موجود ہی نہ سمجھتے تھے۔ ذوقؔ کوئی چیز نہیں۔ شاہ نصیر کو کیا آتا ہے؟ فلاں مہمل گو ہے فلاں جھک مارتا ہے۔ غرض اسی قسم کی باتیں ان کی زبان پر رہتی تھیں۔ فارسی میں اپنے آپ کو ناصر علی کا ہم پلّہ جانتے تھے اُردو میں بیدلؔ تصور کرتے تھے۔ اتنے بڑے مغرور شاعر کی تعلیم ایک ذی استعداد طباع نواب کے دل پر کیا اثر پیدا کر سکتی ہے۔

اور اس پر پہنچی مرزا غالبؔ علیہ الرحمتہ کی شہ۔ بقول میرؔ ؎

سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

تذکرے کا نام تو رکھا گلشنِ بے خار مگر برعکس نہند نام زنگی کافور۔ لکھا نہایت پُرخار معدودے چند۔

(1) مرزا نوشہ غالبؔ

(2) صاحبہ مومن خاں کی آشنا

(3) مولوی محمد صدر الدین آزردہؔ

(4) نواب مصطفٰے خاں شیفتہؔ

(5) رنجو نواب مصطفٰے خاں کی آشنا تخلّص نزاکتؔ

(6) غلام علی خاں وحشتؔ

(7) مومن خاں کے سوا ہر ایک کے ساتھ تلخی۔ ہر ایک کے ساتھ چھیڑ۔ اس عام کاوش میں میاں نظیرؔ کی بھی شامت آگئی۔ دہلی سے آگرہ اس قدر قریب۔ نظیرؔ کی استادی اس قدر مشہور لیکن وہاں تو کاوش نے کان میں منوں روئی بھر رکھی تھی۔ کوئی نظیرؔ کا حال سُناتا تو کیوں کر سُناتا۔ اور وہ سُنتے تو کیوں کر سُنتے۔ نظیرؔ کے حالات اس بے رُخی سے لکھے ہیں جس کا کوئی پایاں نہیں گویا وہ ایک محض گمنام شاعر تھا اور اس کے شاگردوں کو بھی اچھی طرح یاد نہیں کیا۔

شیفتہؔ کا تذکرہ جب آگرے میں پہنچا تو ان دنوں خلیفہ گلزار علی کی شاعری کی جوانی

---

[1] حکیم مومن خاں کے متعلق شہبازؔ کے یہ تاثرات محلِ نظر ہیں۔ (م)

تھی۔ شاگردوں کا ایک جمِ غفیر ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔ دعوے کے ہاتھ ہر وقت مونچھوں پر تاؤ پھیرا کرتے تھے۔ تذکرہ کو دیکھ کر آگ ہو گئے۔ حکیم میر قطب الدین باطنؔ ان کے والد کے ارشدِ تلامذہ میں تھے اور معقول استعداد رکھتے تھے۔ گو عمر نے اُن کی آگ کو کسی قدر افسردہ کر رکھا تھا لیکن خلیفہ صاحب کی زبان آوری نے پنکھا جھل دیا۔ آگ بھڑکی اور غضب بھڑکی۔ اب گلستانِ بے خزاں میں یہ جو گیندے یا ہزارے ہیں غصّہ کے انگارے اور غضب کے شرارے ہیں۔ گلشن بے خار کی شیدا بلبلیں چیخ اٹھیں کہ شیفتہ کے گلشن میں باطن کی آتش بیانی سے پھول پڑا۔ آگ لگی۔ انشار کہتے ہیں ؎

گلشن میں مگر پھول پڑا اس گل رُو سے	کیوں ورنہ چلی آتی ہے یوں بادِ سحر گرم

جب گلشن بے خار چھپ کر شایع ہوئی تو اس میں علی العموم یہ بات دیکھی گئی کہ نظیرؔ اور اس کے دوستوں اور شاگردوں کو نہایت بُری طرح یاد کیا گیا ہے۔ نظیرؔ کے شاگردوں میں اس کا چرچا ہوا۔ نظیرؔ اس زمانے سے بہت پیشتر مر چکے تھے۔ دلوں میں ایک ولی کی جگہ حاصل ہو چکی تھی۔ شیفتہؔ کی اس مرحوم کے ساتھ گستاخی اس کے شاگردوں اور معتقدوں کو ناگوار ہوئی اور آخر باطنؔ کو لوگوں نے گھیرا اور ۱۲۶۱ھ میں ان سے یہ تذکرہ لکھوایا۔

ہر چند یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے تذکرہ نویسی کا حق اچھی طرح ادا کیا ہے اور شعراء کے حالات تحقیق و تلاش کے ساتھ کچھ زیادہ لکھے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ شیفتہ کے علی الرغم جن جن کو اُنھوں نے بُرا لکھا ہے۔ چُن چُن کر اُنہی کو انھوں نے خوب سراہا ہے۔ خصوصاً اپنے استاد اور اپنے استاد کے جرگے کے لوگوں کو بہت کچھ ظلمت گمنامی و مصائب سے نکالا ہے۔ جس قدر بلا استحقاق و با استحقاق ہر ایک کی تعریف کی ہے اسی قدر آزادی کے ساتھ شیفتہؔ، آزردہؔ، مومنؔ، غالبؔ وغیرہ کی مذمت بھی کی ہے۔ باطنؔ کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چند شاعروں کو وہ بہت مانتے تھے۔ سوزؔ جن کو طور الشعراء کہتے ہیں، دردؔ جن کو خضر الشعراء کہتے ہیں، میرؔ جن کو مرشد الشعراء کہتے ہیں، مرزاؔ جن کو مسجود الشعراء کہتے ہیں اور نظیرؔ جن کو ہادی الشعراء کہتے ہیں، ان شعراء کے ماننے کا غالباً زیادہ سبب یہ ہے کہ یہ ان کو فقط شاعر ہی نہیں بلکہ اہل دل اور صاحب باطن اور مظہر کشف و کرامات بھی جانتے تھے۔ ولیؔ کو والد الشعراء

کا بزرگ خطاب دیا ہے۔

عبارتِ گلشن بے خزاں کی اُردو ہے۔ اُردو اس کی کچھ نورتن میجو، وضع پر ہے۔ وہی التزام ضلع مثلاً کہیں جولاہوں کا ضلع ہے کہیں صرف کا کہیں نحو کا کہیں فتوی فرائض کا کہیں نجوم کا ـــــ رعایت لفظی سے اکثر شاعروں کے حالات کو چمکایا ہے۔ دیباچہ بھی رعایت لفظی کا ملکھ پات ہے ـــ غزل، مخمس، ترکیب بند، رباعی کے گل بوٹے استعارے اور تشبیہہ کے نور سے چمک رہے ہیں۔ اکثر جگہ عبارت اُکھڑی اُکھڑی سی ہے اور جا بجا التزام قافیہ کے سبب طرزِ بیان مضحک ہوگئی ہے۔ مثلاً قاسم کے حال میں لکھتے ہیں۔ قاسم ساکن بریلی ان کی تقسیم دیکھیے کہ بانٹ میں مجھ کو یہی ملی ایک بیت اکیلی۔ لیکن جہاں وہ روانی میں سیدھی سادی عبارت لکھ گئے ہیں بری نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص کو زبان پر قدرت ہے۔ اگر یہ شخص قافیہ پیمائی اور ضلع جگت کا بندہ نہ ہوگیا ہوتا تو تذکرہ بہت خاصہ رہتا۔

غالب اور آزردہ اور مومن خاں کی خوب خاک اڑائی ہے۔ آزردہ کے ذکر میں حرکت کی راکے سکون پر بہت اُلجھے ہیں اور کسی قدر اپنی کم نظری کا ثبوت دیا ہے اور اس بات کو بھول گئے کہ خود ان کے استاد کے کلام میں اس قسم کا سکون کس قدر ہے۔ مومن خاں کا ذکر ایک صفحہ تک جولاہوں کے لوازمات بافندگی کے ضلع میں ہے اور نہایت مضحک ہے۔ اگر کہیں ضلع خوبی کے ساتھ چمکا ہے تو مومن خاں ہی کے تذکرے ہیں۔ اس خاص ضلع کی سفارش غالباً مومن خاں کے نام نے کی ہوگی۔ غالب کے بھی لتے لیے ہیں خصوصاً ان کی شراب خوری، قمار بازی، غرور، اور شخصیت کا خوب خاکہ اڑایا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ لکھتے ہیں غالب جن دنوں اکبرآباد میں ـــــ تھے بادی الشعرا یعنی میاں نظیر سے استفادہ کرتے تھے۔ باطن کی عبارت اس مقام پر بلفظ یوں ہے۔

"غالب و اسد تخلص۔ اسداللہ خاں نام۔ ملقب بہ مرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں۔ کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ از نبائر غلام حسین خاں مکیدان۔ قبل اس سے بعد دہلی (اکبرآباد) میں ان کی سکونت کا مکان۔ استادانِ

باشعور شاں خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی الشعرا، جو بے نظیرِ روزگار تھے جن سے تعلیم پائی۔ ایامِ صبا سے یہ برکتِ انفاس متبرکہ ان اُستادوں کے بہ مرتبۂ علم پہنچے سب ان کی فکرِ رسانے یہ صورت دکھائی۔ کیوں نہ خوش گو ہوں۔۔۔ جن کے ایسے استاد ہوں۔ چونکہ وہ استاد مر گئے۔ یہ بعد دہلی سے اُدھر گئے اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں۔"

چونکہ بے خزاں کے سوا میں نے کہیں اور نہ دیکھا تھا کہ غالب میاں نظیر کے شاگرد تھے۔ مگر ہم وطنی اور میاں نظیر کا ایک مشہور ملائے مکتبی ہونا یہ دو باتیں ایسی تھیں جو باطن کے بیان کو کسی قدر قرینۂ قیاس دکھاتی تھیں۔ میں نے اس کی مرزا غالب کے شاگردوں سے تحقیق کرنی چاہی ــــ چنانچہ سب سے پہلے ایک نیاز نامہ مولوی خواجہ الطاف حسین حالی کو لکھا جو مرزا کے سرِ برآوردہ شاگردوں میں ہیں ان کے ہاں سے یہ جواب آیا۔

"تذکرۂ گلستانِ بے خزاں میں نے خود نہیں دیکھا مگر سُنا ہے کہ اس میں شیفتہ، غالب اور دیگر شعرائے دہلی کا خوب خاکہ اُڑایا ہے اس کی یہ وجہ سُنی گئی ہے کہ نواب مصطفٰی خاں مرحوم شیفتہ تخلص نے اپنے تذکرہ گلشنِ بے خار میں میاں نظیر کا صرف ایک شعر لکھا ہے اور ان کے ترجمے میں بھی ایک آدھ لفظ ایسا لکھ دیا ہے جو میاں نظیر کی اولاد یا معتقدین کو شاق گزرتا ہے اسی بنا پر صاحبِ گلستان بے خزاں نے شعرائے دہلی کی خوب خبر لی ہے۔ غالباً مرزا غالب کو جو اکبر آبادی مولد ہیں اور ان کی طرف میاں نظیر کے تلمذ کی نسبت اس وجہ سے کہ دونوں اکبر آبادی اور دونوں معاصر یکدیگر ہیں، قرینِ قیاس بھی ہے، ان کا شاگرد لکھ دیا ہو۔ مگر اس کا منشا وہی رنجش و ناخوشی اور شعرائے دہلی پر میاں نظیر کو ترجیح دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر بالفرض بچپن میں مرزا کو ایسا اتفاق ہوا ہو تو کچھ تعجب بھی نہیں۔ اس سے نظیر کی عزت زیادہ ہوتی ہے اور مرزا کی عزت کم نہیں ہوتی۔"

گو حالی کو شاگردی کا اقرار کرتے ہوئے کسی قدر تامل نظر آتا ہے مگر صاف انکار بھی نہیں کیا۔ اس سے تو بحث نہیں کہ شاگردی آیا اُستاد کے لیے موجب عزت ہے یا شاگرد کے لیے ــــ اگر واقعہ میں غالب نظیر کے شاگرد تھے تو اس

قدر پیچ وتاب کی ضرورت نہیں ـــــ شاگردی بھی ہزار طرح کی ہوتی ہے۔ ایک اُستاد وہ بھی ہوتے ہیں جو ابجد اور دوسری ابتدائی کتابیں پڑھاتے ہیں اور ایک وہ جو سُلّم صدرا شمس بازغہ کا درس دیتے ہیں، طفرہ جس طرح اور امور میں محال ہے، تعلیم میں بھی ہے۔ غالبؔ کو جو کمال حاصل تھا وہ دفعتاً تو ہو گیا تھا نہیں ـــــ تیرہ ویں صدی کے بڑے اذکیا میں عبدالرّحیم دہری ہو گزرا ہے۔ لوگ روایت کرتے ہیں کہ اس نے انگریزی بغیر مدد اُستاد حاصل کی۔ لیکن ابجد میں وہ بھی کسی کا شاگرد تھا۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ غالبؔ نے ابجد بھی کسی سے نہ پڑھی ہو۔ ابتدائی کتابیں اگر نظیرؔ سے انھوں نے پڑھی ہوں تو کون سی قباحت ہے اور اس میں غالبؔ کی کون سی شان گھٹی جاتی ہے۔

حکیم غلام رضا خاں دہلوی جن سے مجھ کو فنِ طب میں تلمذ حاصل ہے یہ گویا غالبؔ کے متبنّیٰ ہیں اُردوئے معلّٰی کے دونوں حصّے انہی کے نام ہبہ ہیں۔ چونکہ یہ بھی مرزا غالبؔ کے حالات سے بہت واقف ہیں میں نے ان کو بھی اس مسئلہ تلمذ کے باب میں لکھا ان کے ہاں سے یہ مضمون لکھا ہوا آیا۔

بابت مرزا غالبؔ و نظیرؔ کے جو دریافت فرمایا ہے اس کی مثل، سبیت نہیں۔ صحیح امر تو یہ ہے کہ مرزا نے نہ تو فارسی کلام کسی کو دکھایا نہ اُردو ـــــ یہ جو مرزا صاحب ہرمزد عبدالصمد کو اپنے اُستاد لکھتے ہیں اس شخص کا وجود ذہن میں تھا خارج میں نہ تھا ـــ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب دہلی میں آئے پھر یہیں رہے۔ اس زمانے میں دہلی میں شاہ نصیرؔ کا بہت شہرہ تھا۔ بلکہ مرزا صاحب کے خسر الٰہی بخش خاں معروفؔ بھی انہی کے شاگرد تھے۔ مرزا صاحب نے اپنا "کلام" نصیرؔ تک کو خود دکھایا نہیں مجھے جو اصلی حقیقت اس معاملے میں معلوم تھی حوالۂ قلم ہوئی۔

یہ خط پا کر میں نے ان کو یہ مضمون لکھا کہ آپ لکھتے ہیں تو مجھ کو یقین ہے لیکن میرے پاس خواجہ حالیؔ کا ایک خط آیا ہے اس میں تو وہ کچھ اقرار سا کرتے ہیں۔ علاوہ بریں مخدومی مولوی سید محمود صاحب آزادؔ جہانگیر نگری نے یہ روایت بیان کی کہ جو انھوں نے غالباً مولوی عبدالغفور خان نساخؔ سے سُنی کہ مشہور ہے غالبؔ جن دنوں اکبرآباد میں تھے۔ وہاں دو اُستاد تھے، میاں نظیرؔ اور میرؔ۔ مرزا نے پہلے دو چار غزلیں میاں نظیرؔ کو دکھائیں لیکن اتنے ہی میں اُن کی اصلاح سے سیر ہو گئے۔ تب ڈرتے ڈرتے ایک

غزل میر صاحب کی خدمت میں بھیجی اور نہایت ادب سے اصلاح کی درخواست کی۔ وہاں سے اصلاح کی دولت تو حاصل نہیں ہوئی لیکن میر نے غزل دیکھ کر جو رائے ظاہر کی اس کو غالب فخر کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ میر صاحب نے فرمایا کریا تو یہ شخص بہت ہی بڑا شاعر ہوگا یا بالکل مہمل گو ہوگا۔

اس کے جواب میں جو خط آیا اس کا مضمون یہ ہے۔

معاملۂ غالب و نظیر۔ اس کی اصل یہ ہے کہ غالب نے کوئی غزل نظیر کو نہیں دکھائی۔ مولوی عبدالغفور مرحوم کا وہ قول کہ میر تقی کو مرزا صاحب نے غزل بھیجی تھی اور میر نے یہ جواب دیا، صحیح ہے۔ مگر نظیر کی یہ اصلاح دینا بالکل غلط ہے۔ نہ مجھے یہ معلوم ہوا اور نہ منشی ہیرا سنگھ جو میرے دوست تھے اور ہر وقت مرزا صاحب مرحوم کے ہاں نشست رکھتے۔ ان سے میں نے سنا اور نہ کسی اور ارباب جلسۂ مرزا صاحب سے یہ سنا۔ مولوی حالی تو گاہ گاہ مرزا صاحب کے ہاں آیا کرتے تھے۔ ان کی وہاں نشست کچھ زیادہ نہ تھی۔ رہا تذکرۂ حکیم قطب الدین باطن میں اس کا لکھنا اس کی اصل آپ کو شاید معلوم نہیں۔ لہٰذا اس کی توضیح کرتا ہوں۔ چونکہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے تذکرۂ گلشنِ بے خار میں نظیر کی نسبت الفاظ رکیک لکھ دیے ہیں لہٰذا اس کے کسی شاگرد کو ناگوار ہوا۔ اس نے تذکرہ دوسرا لکھا۔ اس میں پوری پوری عداوت کو صرف کیا۔ جن شعراء کی شیفتہ نے تعریف میں مبالغہ کیا تھا، خواہ بوجہ دوستی یا بہ وجہِ اعتقاد ان کی باطن نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہجو کی۔ چونکہ انھیں ممدوحین شیفتہ میں غالب بھی تھے اور ان کی پیدائش آگرہ کی تھی اس لیے ان کی نسبت یہ زیادہ اتہام لگایا کہ وہ نظیر و معظم کے شاگرد ہیں۔ ورنہ اس کی مطلق اصلیت نہیں۔

ان مضامین کے بعد اس کی تجویز مشکل ہے کہ غالب کو نظیر سے تلمذ حاصل تھا یا نہیں۔ تلمذ کے خلاف میں دو شاہد ہیں۔ حکیم غلام رضا خاں اور خواجہ الطاف حسین حالی۔ اور موافقت میں دو حکیم میر قطب الدین باطن اور مولوی سید محمود صاحب آزاد یا مولوی عبدالغفور خان نساخ۔ خواجہ الطاف حالی تو کوئی بات یقینی نہیں کہتے۔ قیاس سے کام لیتے ہیں۔ اور قیاس شہادت میں معتبر نہیں۔ حکیم غلام رضا خاں نظیر کے اصلاح دینے کو بالکل غلط بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں کہتے کہ کسی موقعہ پر غالب نے

اس مضمون سے صراحتاً انکار کیا ہو۔ پس، ان کی باتیں بھی قیاسی ہیں۔ ہرمزاور عبدالصمد کے وجود فرضی کی نسبت جو انھوں نے ایک مضمون لکھا ہے اگر صحیح ہے تو مرزا کا خاص عنوانِ طبیعت اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے دل میں بڑی مشیخت سمائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی عظمت شاعرانہ کے مناسب حالت خلاف واقعہ ایک فرضی اُستاد تراشا تو اپنی شان کے خلاف کسی واقعی اُستاد کے تلمذ سے انکار کرتے ان کو کتنی دیر لگتی۔ اگر اس نے اپنی کسر شان کے لحاظ سے نظیر کی شاگردی سے قصداً سکوت کیا ہو تو اس کی طبیعت سے کوئی بعید نہیں۔ باطن کے قول کو یہ کہہ کر ٹال دینا کہ اس نے محض عداوت سے یہ مضمونِ تلمذ دل سے اختراع کیا ہے، کچھ بہت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے قول کی تائید مولوی سید محمود صاحب آزاد کی روایت سے آزادانہ طور پر نکلتی ہے۔ باطن کے بیان میں لفظ تعلیم عام ہے۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تعلیم رسمی یا تعلیم سخن ـــــ روایت آزاد اس کی شرح تعلیم سخن کے ساتھ کرتی ہے۔

میری خاص رائے اس بارے میں یہ ہے کہ غالب کا زمانہ قیام اکبرآباد ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا۔ اس کی زیادہ اوقات رسمی تعلیم کے حاصل میں بسر ہوتی تھی۔ خلیفہ معظم اور میاں نظیر ان دنوں سربرآوردہ اور ممتاز ملاؤں میں تھے۔ غالب کی تعلیم کو عرش پر سے فرشتے تو آسکتے نہ تھے۔ ان ہی دونوں کی طرف اُسے رجوع کرنی پڑتی۔ مدت تک ان دونوں حضرات سے تعلیم پائی۔ آدمی تھا طباع اور ذہین۔ شاعر اُستاد کی صحبت نے قدرتی طور پر اس میں شعر و سخن کا ذوق پیدا کیا طبیعت میں زور بھرے ہوئے تھے، جب اُڑتا تھا اُونچا اُڑتا تھا اور جب ڈوبتا تھا تہہ ہی تک پہنچنے کا قصد کرتا تھا۔

نومشقی اور اس پر یہ گاوزوریاں، ٹھوکریں کیوں کر نہ لگتیں ـــــ لڑکا اورے دل کا مال اُٹھانے کی فکر مُنہ کی کیوں کر نہ کھاتا۔ لوگوں کے اعتراض ہونے لگے تو اُستاد کی تلاش ہوئی ـــــ دو چار غزلیں مکتب کے مکتب ہی میں نظیر کو دکھائیں۔ لڑکے کی گاوزوریاں دیکھ کر ہنسی تو ان کو آئی مگر دل شکنی ان کا شعار نہ تھا۔ داد دے کر جی بھی بڑھایا اور اصلاح سے چُپکے چُپکے نشیب و فراز بھی بتایا۔ غالب کا زور یہ کہ اُردو کو بیدل کی فارسی بنادیں ـــــ نظیر کا طور یہ کہ بیدل کو سعدی بنادیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ سلسلہ اصلاح منقطع۔ باطن کے فحوائے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسد کا خطاب بھی نظیر ہی کے ہاں سے اس کو ملا۔

نظیرؔ کے بعد غالبؔ کی نظر میرؔ پر پڑی لیکن ان میں بد دماغی وہ تھی کہ وہاں جاتے ہوئے بڑے بڑے تھرّاتے تھے۔ غالبؔ تو بے چارہ لڑکا ہی تھا، جانے کی تو ہمت نہ ہوئی کسی طرح غزل وہاں تک پہنچا دی۔ ہر چند وہاں سے کسی قدر سخت اور دل شکن جواب ملا۔ لیکن اعتقاد میں فرق نہ آیا چنانچہ اپنی ایک غزل کے مطلع میں اس واقعے کے بہت دنوں بعد کہا:۔

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ　　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

ذیل میں نظیرؔ کے شاگردوں کی فہرست درج ہے:۔

خلیفہ گلزار علی اسیرؔ، حکیم میر قطب الدین باطنؔ، مرزا اسد اللہ غالبؔ، مہاراجہ بلونت سنگھ، راجہ لال بدھ سین صافیؔ، شیخ مداری ضمیرؔ، حکیم میر محمدی ظاہرؔ، شیخ بنی بخش عاشقؔ، منشی حسین علی خاں تحوؔ، بیدار بخش لہرؔ، شیخ حسین بخشی ــــــ

خلیفہ گلزار علی اسیرؔ میاں نظیرؔ کے بیٹے تھے۔ 1216ھ میں پیدا ہوئے۔ 1295ھ میں کوئی نواسی برس زندہ رہ کر وفات پائی۔ ان کے شاگرد غلام محمد خاں رہاؔ نے ان کی تاریخ لکھی۔ قطعۂ تاریخ لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ تاریخ کا اخیر مصرعہ یہ ہے۔

گفت اسیر دامِ ہستی شُد رہا

مادّے سے چھ کا تخرجہ ہے:۔

مرزا نوازش علی بیگ کی زبانی یہ روایت ہے کہ خلیفہ گلزار علی کاشی والے کے ہاں نوکر تھے۔ کاشی والا مہاراجہ بلونت سنگھ کو کہتے تھے۔ یہ کاشی والا اس لیے کہلاتا تھا کہ اس کا باپ جیت سنگھ اصل میں بنارس کا راجہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز کے ظلم سے بھاگ کر آگرے میں پناہ لی تھی۔ کاشی والے نے چاہا کہ یہ اس کو کوئی غزل مشاعرے کے لیے کہہ دیں۔ انھوں نے کہا میں اس لیے نوکر نہیں کہ اپنی غزل تمھیں بخشا کروں۔ تم خود کچھ کہو جہاں کہیں خامی یا نشیب و فراز ہوگا دُرست کر دوں گا۔ چونکہ استعداد ان میں چنداں نہ تھی اور شعر گوئی کا شوق بھی تھا۔ ناچار مرزا حاتم علی مہرؔ (شاگرد ناسخ) کو اپنا استاد بنایا اور ان کا جو مقصد تھا ان کی استادی سے پورا پورا حاصل ہوا۔ پھر بھی جب مشاعرہ ہوتا خلیفہ گلزار علی کو بھی بُلاتے چونکہ قدیم استاد تھے، خلیفہ گلزار علی داہنی طرف بیٹھتے اور مرزا حاتم علی مہرؔ بائیں طرف دونوں صاحبوں کے آگے چاندی کا حُقّہ لگایا جاتا۔ خلیفہ صاحب

بھنگ اور افیم دونوں سے ذوق رکھتے تھے۔ ان کو یہ چھوٹی مہنال کا حقہ کیا بھلا معلوم دے۔ ساقن جو اور حضارؓ کے حقہ پلانے کو مقرر تھی اس کو بلا لیتے اور اسی کے گرما گرم دھولی دھار حقہ سے اپنی خواہش کی آگ کو بجھاتے۔ پہلے پہل جب یہ حرکت ان سے ظہور میں آئی تو میرزا نے کنایتہً کہا حضرت کیا خوب اب تو آپ کی طبیعت کچھ اور ہی طرف مائل ہے۔ خلیفہ صاحب نے چھوٹتے ہی یہ شعر پڑھا ؎

دل میں الفت ہے جو اک سانولی متوالی کی
گو مسلمان ہوں یہ بول اٹھتا ہوں جے کالی کی

میرزا نے اس پر دو مطلع پڑھے۔ خلیفہ جی نے بھی ان کے جواب میں ویسے ہی برجستہ دو مطلع فی البدیہہ ارشاد کیے ــــ تب تو مرزا مان گئے کہ حضرت واقعی آپ اُستاد ہیں۔

مشاعرہ جس کا اس حکایت میں مذکور ہے 1245 ہجری میں قائم ہوا تھا۔ چونکہ راجہ توصلہ مند تھا اور فراغت نے بے فکری کی بساط بچھا رکھی تھی، مشاعرہ تقریباً ربع صدی تک برسوں ایک طور سے قائم رہا۔ بڑے بڑے نامی شعراء اپنے جوہر طبع دکھانے وہاں تشریف لاتے تھے۔ اور فرش سے عرش تک اپنے کلام کا غلغلہ بلند کرتے تھے۔ جو اُستاد ہوتے تھے ان کی راجہ کی طرف سے کچھ نقدی قدر دانی بھی ہوتی تھی۔

ایک مولوی گلزار علی آگرے میں وہ بھی تھے جو سینٹ جمیس کالج میں نوکر تھے۔ ان کو اس کالج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نظیر نے جب قضا کی تو ان کی خلافت ان کو ملی۔ کاشی والے راجہ اور راتی تھان والوں کے پڑھانے کو مقرر ہوتے ستر روپے ماہوار آتے تھے۔ گوالیار میں بھی خلیفہ جی کے دو گھوڑے تھے۔ بلیس ان کے آتے تھے۔ فی گھوڑا بائیس روپے مقرر تھا۔ جس میں سے بارہ وہیں کٹ جاتے تھے۔

خلیفہ گلزار علی صاحب کے دو دیوان ہیں۔ ایک تو اکبر آباد ہی میں چھپ بھی گیا ہے۔ دوسرا قلمی غیر مرتب یوں ہی پڑا ہوا ہے ــــ مسودے کے اجزا میرزا نوازش علی نے مجھ کو دکھاتے۔ گل چین انتخاب نے ان کے گلزار سے یہ پھول چنے ہیں۔

ثبوت ہے اپنے اجلے پن کا صفائی دست تیغ زن کا
نہ عضو مٹی ہوا بدن کا، نہ تار میلا ہوا کفن کا

یہ کیا کہ بچنا خار سے اور گل کو دیکھنا
جب صلح گل سے ٹھہری تو پھر گل کو دیکھنا

کیا سیدھی سی زلفوں کے لکھوں شعر اسیر اب
اٹکے ہے کہیں دل نہ الجھتی ہے کہیں شیع

ساقی کا کیا میٹھا ہے
کڑوا پیالہ پیجئے کیوں

یا علی بخت سیہ میرے کو روشن کردو
تم کو شمع حرم لم یزلی کہتے ہیں

دنیا میں انساں کی اور آنسو کی قدر برابر ہے
خاک میں ملتے جاتے ہیں آنکھوں سے گرتے جاتے ہیں

عجب کچھ تفرقے سے شہر آب و گل میں پھرتا ہوں
مجھے ڈھونڈے ہے دل میں جستجو تے دل میں پھرتا ہوں

شمع ساں بزم میں مارے ہوتے تن من میں ہوں
جب کوئی آگ لگادے مجھے روشن میں ہوں

داغ تو دل میں ہوا ہے چہرۂ کہن چھوٹا سا
ہے بڑا لطف جو گھر میں ہوں چمن چھوٹا سا

مجھے رعشہ تو ہے چنچل مصور سے کہے کیوں کر
مری تصویر پیری میں تیری تصویر طفلی میں

تو ارکھا جو اشکوں نے عصائے بغلی کو
شاخوں میں جریدوں کی لگے بیہ لحد میں

افسردہ دل جو ہووے تو شعور فغاں نہ ہو
مٹی کو لاکھ طرح جلائیں دھواں نہ ہو

آنکھوں میں اس کو رکھئے کہ دامن میں پالیئے
طفل سرشک لاکھ برس میں جواں نہ ہو

یک گز دو فاختہ کی یہ پھبتی کہی اسیر
تھی سرو پر جو فاختہ، بالا گئے فاختہ

خار پیا سا ایک چھوڑیں گے نہ تن میں آبلے
ہیں پکھالیں پانی کی دیوانہ پن میں آبلے

اشک یاں چشم میں غم دل میں ہے جاں ہاتھ میں ہے
اپنے قاتل کی بہار اور خزاں ہاتھ میں ہے

غصہ بھی آئے تو بے جا نہ سخن سرزد ہو
جس کے کہنے میں ہے گویا وہ زباں ہاتھ میں ہے

کس نیند چڑھا پھرتا ہے ہشیار ہو غافل ۔۔۔ جو پہلا کرائے کا ہے یہ گھر کا نہیں ہے
مال رہ جاتے کسی پاس دولت رہ جائے ۔۔۔ یہ بڑی چیز ہے دنیا میں جو عزت رہ جاتے
تن میں ہوا جو ہے کوئی دم کی بندھی ہوئی ۔۔۔ گھڑی یہ غافلوں ہے بھرم کی بندھی ہوئی
توشہ مسافرانِ عدم کو ضرور ہے ۔۔۔ تکیا رہے کیجے پہ غم کی بندھی ہوئی

حکیم میر محمدی ظاہر صاحب تذکرہ کے والد تھے اور حضرت میر ضیاء الدین سے پوری سے ان کو بیعت حاصل تھی جو خلیفۂ خاص مولانا محمد فخر الدین کے تھے۔ اصل میں ان کے اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ غریب سرا میں رہتے تھے جو شاہ جہاں آباد سے تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ محاربات شاہ گردی میں ان کے دادا حکیم میر واجد علی جو مولانا کے عمائد خلفا میں تھے، پریشان ہو کر اکبر آباد آئے اور تاج گنج میں عمر خاں کے کٹڑے میں ممتاز محل کے روضے کے زیر دیوار قیام پذیر ہوتے۔ طبابت سے اوقات بسری کرتے تھے۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش خان مرحوم جو نواب مرزا الٰہی بخش خان مرحوم کے بڑے بھائی اور عارف خان برادرِ شرف الدولہ قاسم جان کے بڑے بیٹے تھے، وہ ان کی خدمت سے سعادت اور توقیر حاصل کرتے تھے۔

ظاہر نے میاں نظیر سے فیضِ سخن حاصل کیا اور اپنے تئیں ست اگر دوا ، کے زمرے میں داخل کیا ۶ رصفر ۱۲۵۹ھ اور چہار شنبہ کو پہر رات گئے ہوئے سفرِ آخرت کیا۔ ایک مختصر دیوان ان کا ہے۔

حمد میں لکھتا ہوں میں نام اس خالق غفار کا ۔۔۔ نعت میں دم مارتا ہوں احمد مختار کا
خیال اس زلف کا دل سے مرے اصلا نہیں جاتا ۔۔۔ بہت اپنی سی کی پر آہ یہ سودا نہیں جاتا
نہ بھاتی تھی جس شخص بن دل کو سیر ۔۔۔ سو آیا ہے اے لو وہ یادش بخیر
چشم اور لب لعل اس کے ظاہر ۔۔۔ بولے کہ جو دل کو پائیں گے ہم
آنکھوں نے کہا کریں گے ہم قتل ۔۔۔ لب بولے کہ پھر جلائیں گے ہم
غبارِ خاک راہِ دلبر چالاک آنکھوں میں ۔۔۔ سمجھ کحل البصر گر ہم نہ دیں تو خاک آنکھوں میں
گو خلد بریں کی تو صبا اور ہی کچھ ہے ۔۔۔ پر یار کے کوچے کی ہوا اور ہی کچھ ہے

حکیم میر محمدی ظاہر کے بیٹے حکیم میر قطب الدین باطن جنھوں نے تذکرۂ گلستان بے خزاں جمع کیا اپنے آپ کو پابند سلسلۂ شاگردی میاں نظیر لکھا ہے لیکن شاید

انہوں نے میاں نظیرؔ کا بہت زمانہ نہیں پایا اس لیے انہوں نے بعد میں خلیفہ گلزار علی سے بھی استفادۂ سخن کیا۔

اپنے حالات میں اپنی شاگردی کو ان لفظوں میں لکھا ہے۔

پابند سلسلۂ شاگردی میاں نظیرؔ صاحب اور خواہانِ فیضِ صحبت بدل وجان۔ ان کی تعلیم لے استفادے سے حرف شناسِ سخن ہو جائے گا۔ گل سخن اس کا رنگین طرازِ چمن ہو جائے گا۔ اور اسیرؔ کے حالات میں یوں :۔

درختِ سخن راقم آثم کا فیضِ شگفتگی نکہاتِ تلطفِ ہادی شعرا حضرت نظیرؔ سے بارور ہوا۔ گل مرادِ احقر کا نسیم التفاف ان کی سے شاخ مضارع بر برنگِ بوقلموں ثمر بر لایا۔ نخلِ ابیاتِ ناقصہ اپنا دستِ صنعتِ باغبانِ طبع ان کے سے پیوند[الف] ہوا اور ہر نظارگی باغِ سخن نے ان کے سلسلۂ کلام میں سراسر دل شوریدہ کو پابند کیا۔

ذو بحرین

واسطے سہرے کے مرے پتھر بنا — واسطے پتھر کے سہرا سر بنا
شرمِ گنہ پہ دھیان گیا جب خیال کا — دریا بہا دیا عرق انفعال کا
کیا اعتمادِ خواب کا کیوں ہوگئی یہ محو — بچہ نہ کچھ زلیخا تھی یوسف جواں نہ تھا
وہ ظرف ہے خم وحدت کو میں چڑھا جاتا — تیرا جمال جو اس جام میں سما جاتا
قفس میں آتی چمن کی مجھے جو یاد کبھی — وہ نالہ کرتا کہ صیاد بلبلا جاتا
گنہ سے توبہ کرائے دل سمجھتا ہے نہیں الّا — حمیما اور غساقا جزاء اور وفاقا کیا
چاند پہ شیشۂ شیشے یہ پنجہ پنجہ میں قطرہ زیب فزا — تکیہ پہ زانو زانو پہ ہاتھ اور ہاتھ میں دانا سُمرن کا
ترے در سے خالقِ انس وجاں جو ملے تو ہوں میں بلا طلب — نہ چلے یہ پائے ہوس طلب نہ بڑھے یہ دستِ دُعا طلب
طرح طرح کے دکھاتا ہے اب زمانہ رُوپ — بدل رہا ہے یہ بہروپیا بھی کیا کیا رُوپ
حضرتِ یعقوب کی خدمت میں یوسف کو بگاڑ — سانا رو ہن بن گئے ہیں گرگ پیراہن سمیت
یہ دیر کے رستے سے وہ کعبہ کی گیا راہ — ان برہمن و شیخ میں اک راہ کا تھا پیچ

[الف] ف نے پیوند کیا۔

روش پہ قمری و بلبل میں بحث ڈلوا کر — یہ لال بن کے لڑاتا ہے پتیاں صیاد
ذقن کو دل گیا ہر گز نہ رکھا کان بیچ بیچ پر — گرا اندھے کنویں میں خضر اک بوسے کے لالچ پر
تمھارا حسن ہر عالم میں اک دورِ قیامت ہے — ہوا تنے تھے تو فتنے تھے ہوئے آفت جواں ہو کر
آنکھوں، رونا مچلنا بس کلید قفل مطلب ہے — زباں بوڑھوں کی کھلواتے ہیں بچے بے زباں ہو کر
نسیم حالِ خزاں کا جو سن گئی ہوگی — وہ باؤنی سی تو ہے تنکے چن گئی ہوگی
عروسِ گور سے ہونے کو ہم کنار آتے — اکیلے چار پیادوں پہ ہم سوار آتے
طلب بھی بوسے کی دشنام کا سوال بھی ہے — جواب دے ارے ممسک تو کچھ دوال بھی ہے
خیال آیا جو باطن کو وفورِ عشق کا اپنے — تو یکسر شرم کا پانی پلیوں سر سے بڑھا پانی
گذشت از سر چو آب غم چہ یک دست و چہ یک نیزہ — بلا نے جان ہوا جب سر سے اونچا ہو گیا پانی
راحتِ ہستی موہوم ہوا خواب عدم — نیند آئی مجھے یٰسین کے افسانے سے
جو ایک اشک بھی آمیری چشم تر سے پھرے — تو پانی اتنا ہو اونچا کہ عرش پہ سے پھرے
پائنتی سے بھی چلے بیچ کے سرہانے والے — کاندھی دے جاتے ہیں نعشے کے اٹھانے والے
خیالِ کاکلِ پیچاں میں چرخ کج رو کے — دھوئیں اڑا دیتے ہوں گے جو آہ کی ہو گی
عقل کل طفل دبستاں ہے وہ کیا سمجھے گا — جو کچھ اس خاک کے پتلے میں بھی حکمت ہو گی
نہ پوچھو کچھ ہماری کس طرح اوقات کٹتی ہے — غضب میں دن گزرتا ہے قیامت رات کٹتی ہے
خدا کی حمد ہے وصفِ بتاں ہے — بس اک دو کام کو منہ میں زباں ہے
ہزاروں رنگ سے کرتے ہیں نغمہ — ہمارے منہ میں بلبل کی زباں ہے
بڑی دقت سے گزرا رستم دل — ترا کوچہ بھی راہِ ہفت خواں ہے
بنایا تو نے حکمت سے اسے موتی اُسے انساں — گہر اور آدمی دونوں کی اصل اک بوند پانی ہے

محو تخلص منشی حسین علی خاں مولد و منشاء اکبرآباد۔ اصل کشمیر۔ برادر حقیقی قاضی واجد علی خاں۔ توقیر کے آدمی تھے۔ سرکار انگریزی میں جلیل القدر عہدے پر سرفراز تھے۔ باطن کے والد سے از بس یک جہتی تھی۔ عرصہ دراز تک بہ سرکارِ مہاراجہ گوالیار مختار رہے۔ 1250ھ میں قضا کی۔ آدمی خوش فکر ہیں۔ ہادیِ شعرا مرحوم کی صلاحِ سخن کے ذکر ہیں۔

آج آیا مجھے اس رشک قمر کا پرزہ — میں بھی بھیجوں گا جواب اپنے جگر کا پرزہ

ترا تیرِ نگہ ظالم سپر سورج کی چھاتی ہے   مجھے خورشید کے احوال پر اب مہر آتی ہے

انشا نظیر کا تتبع ہے

میں نے جب شروع شروع کلیاتِ نظیر دیکھنا شروع کیا اور ان اشعار پر پہنچا تو چھوٹتے ہی خیال میں آیا کہ یہ طرز انشا کی ہے۔

کہا جو تم نے کہ منکا ڈھلا تو آؤں گا   ہے بات کچھ نہ کچھ اس میں بھی مکر وفن کی سی
وگر نہ سچ ہے تو اے جان اتنی مدت میں   یہی بس ایک کہی تم نے میرے من کی سی
وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے   یہ آتے دیکھتے داڑھی لگا کے سن کی سی

غور کر کے دیکھا تو پہلی غزل کلیات کی بھی انشاء ہی کی طرز میں نظر آئی۔

سحر اس جھمک سے آیا نظر اِک نگارِ رعنا   کہ خور اس حُسنِ رخ کو لگا تکنے ذرہ آسا

پھر ان کی غزلوں پہ بھی یہی خیال بڑے زور سے پیدا ہوا تھا جن کے مطلع کے اشعار یہ ہیں :۔

کہتے ہیں یاں کہ مجھ سا کوئی مہر حسین نہیں   پیارے جو ہم سے پوچھو تو یاں کیا کہیں نہیں
زاہد و روضۂ رضواں سے کہو عشق اللہ   عاشقو کوچۂ جاناں سے کہو عشق اللہ
ہے شوخ ہر گھڑی نہ ہوس آشنا کو چھیڑ   ایسا ہی چھیڑنا ہے تو اہل وفا کو چھیڑ

چنانچہ حاشیے پر بطور نوٹ کے لکھ بھی دیا تھا کہ ان اشعار سے طرز انشاء جھلکتی ہے۔ لیکن اس وقت تک اچھی طرح یہ امر متحقق نہ تھا کہ نظیر کا زمانہ کیا ہے؟ آیا انشاء سے متقدم یا متاخر۔ تحقیق سے اب ظاہر ہو گیا ہے کہ نظیر گو باعتبار موت کسی قدر متاخر ہے مگر باعتبار ولادت وسنین عمر یقیناً انشاء سے متقدم۔ بس خاصی طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس طرزِ خاص میں انشاء نظیر کا پیرو ہے۔ جب انشاء کا دیوان دیکھا گیا تو اُس میں کئی غزلیں نظیر کی طرح میں پائی گئیں۔ نظیر کا مطلع ہے۔

عشق کا دور کرے دل سے جو دھڑکا تعویذ   اس دھڑا کے کا کوئی ہم نے نہ دیکھا تعویذ

انشاء کہتے ہیں۔

لکھ دو آخون جی صاحب کوئی ایسا تعویذ   کہ مرے منہ سے لگے اُس کے گلے کا تعویذ

دل دھڑکنا ترے عاشق کا نہ جاوے ہرگز — گرچہ سو لاکھ طرح لکھ دے مسیحا تعویذ

نظیر کا مطلع ہے:۔

دیکھ عقدِ ثریا ہمیں انگور کی سوجھی — کیوں بادہ کشو ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی

انشاء فرماتے ہیں۔

پھبتی ترے مکھڑے پہ مجھے حور کی سوجھی — لا ہاتھ اِدھر دے کر بڑی دُور کی سوجھی

اس طرح میں جرأت کی بھی غزل ہے۔ نقل مشہور ہے کہ جرأت نے انشاء کے سامنے اپنا ایک شعر پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی کہ انشاء نے چھوٹتے ہی کہا۔ اندھے کو اندھیرے میں بڑی دُور کی سوجھی۔ اس پر جرأت مارنے کو اٹھے۔ نظیر کا مطلع ہے:۔

دیکھ کر کرتی گلے میں سبز دھانی آپ کی — دھان کے بھی کھیت نے اب آن مانی آپ کی

انشاء کا مطلع ہے:۔

بندگی ہم نے تو جی سے اپنے ٹھانی آپ کی — بندہ پرور خیر آگے قدر دانی آپ کی
اپنی آنکھوں میں تراوٹ آگئی یک بارگی — دیکھ کر یہ لہلہی پوشاک دھانی آپ کی

چھیڑ کی طرح میں انشاء کی غزل یوں شروع ہوتی ہے۔

اے دل سمجھ کے اُس کی تو زلفِ رسا کو چھیڑ — کمبخت کیا کرے ہے نہ کافر بلا کو چھیڑ

نظیر زلف کے مضمون کو یوں لہراتے ہیں:۔

بھیرے گا جب تو پیش نہ جاوے گا کچھ فسوں — اے دل نہ اس کی افعی زلف دوتا کو چھیڑ

آزار بند والی طرح میں بھی دونوں کا کلام ہے:۔

جاڑا لگے ہے کھینچ لے مجھ کو لحاف میں — پاجامہ تنگ ہے بہ طرف ہٹ، اولا ازار بند

فقط یہی نہیں کہ اتفاق سے یہ چند طرحیں دونوں کے دیوان میں واقع ہوتی ہیں نہیں بہت سی باتیں دونوں شعراء کے کلام میں یکساں اور متحد ہیں۔ بعض سخت قافیوں پر دونوں طبیعت آزمائی کرتے ہیں۔ اور اس قسم کے قافیوں سے دونوں کو ایک قسم کا عشق معلوم ہوتا ہے۔ کلام میں چوچلے کو دونوں شعراء شریک کرتے ہیں۔ دونوں شعراء آزادوں کے لہجے میں اکثر خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ ظرافت کے مضامین

دونوں کے کلام میں بڑے زور سے دخل پاتے ہیں۔ شاعر کو اکثر دونوں کے کلام میں ایک بہروپیے کا کیریکٹر دیا گیا ہے۔ عبارتِ عربی اقتباساً دونوں اپنے کلام میں ایک لطیف پیرائے میں داخل کرتے ہیں۔

انشاؔ:۔

اے عشق جلوہ گر ہے خود تجھ میں ذاتِ مولا   واَلسّابحات سبحا فالسّا بقات سبقا
سبزا اگر چڑھانا منظور صبح دم ہو   تو لیجیے برگ کوئی وَالنّاشطات نشطا

ہندوستانی تیوہاروں اور تقریبوں کو شاعرانہ رنگ آمیزیوں سے لطف اٹھا اٹھا کر دونوں بیان کرتے ہیں۔ ہنود کے الفاظ و اصطلاحات بھی دونوں کے کلام میں پاتے جاتے ہیں۔ مختلف زبانوں اور لہجوں سے دونوں کام لیتے ہیں۔ صوفیانہ مذاق کو دونوں دخل دیتے ہیں۔ چونکہ ذہین مقلّد اکثر اپنے امام پر سبقت لے جاتا ہے۔ اس لیے ان امور میں سے بعض میں انشاؔ نے کسی قدر نظیرؔ پر فضیلت حاصل کی ہے۔ مثلاً اس کے کلام میں عربی کی عبارتیں اقتباساً نظیرؔ سے زیادہ برجستہ طور پر واقع ہوتی ہیں ــــ یا آزادوں کے لہجوں کو وہ ایک خاص لطافت سے ادا کرتا ہے۔ یا مختلف محاورات اس کے یہاں زیادہ شوخی کے ساتھ ہیں لیکن دیکھنے والے پر صاف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ کسی کا مقلّد ہے۔ نظیرؔ سے پہلے غزلوں اور اشعار میں اس قسم کے خیالات کسی نے ظاہر نہیں کیے تھے۔ اِس طرز کا نظیرؔ امام ہے۔ اس نے احاطۂ شاعری کو وسعت دی۔ انشاؔ نے اس طرزِ جدید کی تقلید کی اور عمدہ طرز پر تتبّع کر کے بعض باتوں میں کچھ اس کو ترقی دی۔ بعض کلام دونوں شاعر کے ایسے ہم رنگ ہیں کہ مجھ کو اکثر ایک دوسرے کے کلام کا دھوکا ہوا ہے مثلاً وہ غزل

نظر پڑا اک بتِ پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا

انشاؔ کہتے ہیں۔

آئی تھی ایک حور مجھے دیکھ ہٹ گئی   دانتوں کے نیچے داب زباں چٹ پلٹ گئی
آہٹ کو میری تاڑ کے چوکھٹ سے جھٹ اچک   جھٹ پٹ وہ ہٹ کواڑ کے پٹ سے چمٹ گئی

اس پر صاف نظیرؔ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔

انشاؔ کہتے ہیں :-

ہیں روپ بدل اور ہی چپکے سے جو پہنچ بیٹھے تھے جہاں وہ
سُن کہنے لگے میرے دبے پاؤں کی آہٹ ہے ایک تونٹ کھٹ

اس پر بھی نظیرؔ کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔
تین غــزلیں جو ذیل کے مطلعوں سے شروع ہوتی ہیں وہ بھی طرزِ نظیرؔ میں ہیں :-

کو صولتِ اسکندر و کو حشمتِ دارا اے صاحبِ فطرت
پڑھ فاعتبروا یا اولی الابصار کا آیا تا ہو تجھے عبرت

ہے نام خدا وا چھڑے کچھ زور تماشہ یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب قہر پھبن اور جھمکڑا اللہ کی قدرت

لینے جو بلائیں لگے ہم آپ کی چٹ چٹ تو بول اُٹھے اجھٹ
چل جا اپے رے واوز برر و ہو پرے ہٹ ہے سب یہ بناوٹ

انشاؔ کو مّتبع ماننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زبان انشاؔ کی کسی قدر نظیرؔ سے شستہ اور تہذیب یافتہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک زینہ وہ نظیرؔ سے نیچے ہے۔ نظیرؔ کے ہاں وہ عیوب جو میرؔ اور سوداؔ کے کلام میں متعلق لُغت یا عروض کے ہیں، بعینہٖ ہیں۔ انشاؔ کے یہاں وہ عیوب نہیں ہیں۔ انشاؔ نے کسی قدر زبان کی اصلاح شروع کر دی ہے۔ وہ الفاظ کی صحت کی رعایت بہت کرتا ہے غلطی بسکون لام اس کے نزدیک بڑی رکیک غلطی ہے۔ گو موٹے موٹے رکیک ہندی الفاظ کو آزادی کے ساتھ داخل کلام کرتا ہے۔ لیکن فارسی اور عربی لُغات کی تحت شعراء فارس کے معیارِ صحت کے مطابق کرتا ہے۔

متاخرین اگر بعض خاص امور کی تہذیب کریں تو متقدمین کے کلام کو ان متاخرین کے نصاب سے ناپ کر خراب اور کم رتبہ نہیں کر سکتے لیکن بعض خاص قسم کی غلطی خیالی سے لوگ بعض متقدمین پر غلط الزام لگاتے ہیں۔ نظیرؔ ان ہی بے جا الزام یابوں میں ہے۔ انشاؔ کے قوانین اصلاح و تہذیب کا نظیرؔ کیوں کر پابند ہو سکتا تھا۔

نظیرؔ اور انشاؔ کی ظرافت میں فرق کیا ہے۔

ظرافت دونوں کے کلام میں ہے۔ لیکن نظیر کی ظرافت اس وضع کی ہے۔ جیسے کوئی رئیس کسی سے مزاح کرے اور انشاء کی ظرافت کا ڈھنگ وہ ہے کے جو مصاحبوں اور بعض ارباب نشاط کا ہوتا ہے وہ جس کو چھیڑتا ہے اس کی نسبت فقط زبان سے کام نہیں لیتا بلکہ ہاتھ پاؤں سے بھی بعض حرکات ان کی تضحیک کی کرتا جاتا ہے اس کو منہ چڑا دینے میں کوئی باک نہیں۔ اس کو تضحیک میں ڈالے ہوئے شخص کی ناراضی و خوشنودی کا کچھ خیال نہیں۔ وہ چاہے بیزار ہو کر خودکشی کیوں نہ کرلے مگر اس کو چھیڑے جانا۔ اُس کو مقصود ہے۔ صرف اپنے مُربّی کو خوش کرنا۔ نظیر کا کوئی مُربّی نہیں ہے۔ وہ اپنے کلام ظرافت التیام میں مُصاحبت نہیں خرچ کرتا۔ وہ چٹکی لیتا ہے مگر اس کے دل میں ہمدردی بھی جوش مار رہی ہے، جیسے بعض رُوَسا کہ بعض تفریح طلب لوگوں سے تفریح کرتے ہیں۔ چپت مارتے ہیں۔ ناک میں بتّی کر دیتے ہیں ـــ منہ میں کالک لگا دیتے ہیں ـــ جوتے کا ہار گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اخیر میں کچھ دے بھی نکلتے ہیں ـــ غرض نظیر کی ظرافت خود مختار اور آزاد ہے اور آزادی کی تمام فضیلتوں سے مالا مال اور انشاء کی ظرافت بھانڈوں اور مصاحبوں کی ظرافت کی طرح پابند ـــ نظیر کی ظرافت کا مقصودِ اعظم نوعِ انسانی کی اصلاح اور انشاء کی ظرافت کا مقصود فقط چند لوگوں کو ہنسا دینا اور بس۔

نظیر کی تشبیہ برن سے

میرے ایک نہایت ہی قابل اور خوش طبع دوست نے اثنائے گفتگو میں نظیر کو برن سے تشبیہ دی۔ میں جب اُن سے مل کر گھر آیا تو اوقاتِ فرصت میں اس تشبیہ کے نکات پر وقتاً فوقتاً غور کرتا رہا۔ اس اعتبار سے کہ برن بہت ہی کم عُمری میں مر گیا، کوئی مشابہت نہیں۔ اس اعتبار سے کہ وہ بہت شراب پیتا تھا، کوئی مناسبت نہیں۔ اس اعتبار سے کہ وہ ارادے کا مستقل اور عادت پر قابو رکھنے والا نہ تھا، کوئی مماثلت نہیں۔ مناسبت کی وجہیں شاید یہ ہوں کہ اولاً تو دونوں کا زمانہ ایک ہے گو برن پہلے مر گیا[1]

---

[1] 21 جولائی 1796 برن کی وفات کی تاریخ ہے اور 29 جنوری 1759 تاریخ ولادت۔ (ش)

جن دنوں برن کی شاعری ممالکِ فرنگ میں اپنے خاص رنگ میں دلوں کو رنگ رہی تھی، نظیر کی شاعری وہی رنگ یہاں ہندوستان میں جھمکا رہی تھی۔ برن نے اپنے ملک کی خاص زبان اختیار کی تھی، نظیر کو اس خصوص میں اس کی پوری نظیر تو پیش نہیں کر سکتا مگر اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں کہ اُس نے بھی زبان کو بہت کچھ آزادی دی۔ شعرا عوام کے بازاری محاورات اور روزمرّہ استعمال کرتے ڈرتے ہیں۔ اُس نے نہ فقط بازاری محاورات استعمال کیے بلکہ ان محاورات کے جادو سے ایک بولتا چالتا اچھا خاصا بازار بسا دیا۔ اس کو کسی لفظ کے استعمال میں عذر نہیں اور ہو بھی تو کیوں ہو۔ وہ شاعری نہیں کرتا بلکہ خیالی طور پر خاص خاص روپ بھرتا ہے۔ جس طرح برن نے زبان انگریزی کو خاص خاص الفاظ اور خاص خاص محاورات دیئے ہیں، اُسی طرح نظیر نے زبان اُردو کو دیئے ہیں۔ الفاظ و لُغات کی کثرت جدّتِ استعمال کے ساتھ اس کے کلام میں اس قدر ہے کہ اس خصوص میں حالی نے اس کو میر انیس پر ترجیح دی ہے میرے خیال میں بعض فرہنگ نویسوں کے لیے یہ ایک عمدہ منصوبہ ہے کہ وہ صرف نظیر کے لُغات لے اور مترادف الفاظ اور ہم معنی محاورات کا التزام کر کے اُردو کی ایک جامع فرہنگ طیار کرے۔ جس طرح میرے ایک نہایت بلند خیال کامل العلوم دوست نے مقاماتِ حریری کے متعلق التزام کیا تھا۔ میں جانتا ہوں زبان اُردو میں کسی شاعر کا کلیاّت ایسا نہیں ہے جس میں اس قدر مختلف صیغوں کے الفاظ اس کثرت سے پائے جاتے ہوں۔ سینکڑوں الفاظ ایسے ہیں جن کا پہلے پہل اس کے ہاں استعمال ہوا ہے۔ اور اگر پہلے پہل استعمال نہیں ہوا تو یہ تو یقیناً ہے کہ اس خوبی اور اس پہلو سے پہلے ہی پہل ہوا ہے۔

مختلف مضامین کے اعتبار سے بھی برن اور نظیر مماثل ہیں ہے۔ برن کے ہاں بھی اسی طرح ہر طبقے اور ہر درجے کے خیالات ہیں جس طرح نظیر کے ہاں۔ مضمون چاہے کتنا ہی پست کیوں نہ ہو مگر شاعرانہ نقاشی کے لیے دونوں کے موقلم یکساں طور پر تلے ہوتے ہیں۔ برن سہمے ہوتے زندہ چوہے کو ہمدردی بڑھانے کے لیے پیش کرتے ہیں تو نظیر مردہ پرندوں کی ایک مظلوم جماعت کو خوان میں لگا کر لاتے ہیں اور ہنستے ہنستے رلا دیتے ہیں۔ برن کتے کی دوڑ بھاگ دکھاتے ہیں تو نظیر اُچھلتا کودتا ہرن سامنے لاتے ہیں۔ برن کے فوجی مذاق کی نظموں کے مقابل میں نظیر کا جنگ نامۂ خیبر اور

اسی وضع کی اور نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ برن کے اگر سونگ ہیں تو نظیر کے بھی گیت ہیں، جو موج اور لہر کے گلے سے ادا ہو رہے ہیں۔ برن کے جام میں اگر بادۂ ارغوانی (اسکاچ ڈرنک) ہے تو نظیر نے بھی ادھر سبزی چھانی ہے۔ برن کا ونٹر ہے تو نظیر کا جاڑا ــــ برن کی صفاتی کے ساتھ مڑنے والی ڈیون ہے تو نظیر کی مینڈھا بھنورا اُچھالن چکر سمیٹ مالا والی جمنا ــــ برن کو اگر مضامین ایڈیسن کا وظیفہ ہے تو نظیر کو مقالات سعدی کا ــــ برن کو رسمی پادریوں سے انحراف ہے تو نظیر معمولی عاملوں اور عالموں کو بہکا اور بھٹکا ہوا جانتا ہے ؎

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب ــــ دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

کسی قدر شوخیٔ طبیعت میں بھی دونوں کو شرکت ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمدردی دونوں کی گہری ہے۔ یہ گہری ہمدردی کا اثر ہے کہ نظیر اور برن دونوں کا کلام ہر گھر میں پڑھا جاتا ہے اور ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اونچے محلوں میں بھی یہ راگ اُسی طرح بلند ہے جس طرح ذلیل جھونپڑوں میں۔ مسجد اور گرجوں میں بھی یہ آواز اسی طرح گونجتی ہے۔ جس طرح مندر اور میکدوں میں۔ بڑے بازاروں میں بھی اس سودے کا اسی طرح رواج ہے جس طرح چھوٹی دکانوں میں ــــ شاعری پہلے بہت بلندی پر تھی، جو لوگ سوسائٹی کی پستی میں تھے ان کا ہاتھ اس تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ وہ دور ہی سے درشن کر کے چلے جاتے تھے۔ برن اور نظیر دونوں کی کوشش سے وہ اپنا سنگھاسن چھوڑ کر جھروکے سے نیچے آئی۔ اور اکبر اور شاہ جہاں نہیں بلکہ ہماری ملکۂ معظمہ کوئین وکٹوریا کی طرح اخلاق کے ساتھ ہر سولجر اور سیلر اور ہر سپاہی اور خلاصی سے باتیں کرنے لگی۔ ہر ایک شخص کا حال پوچھا اور ایک کے ساتھ اس کے مناسب حالت سلوک کیا۔ جو روتے تھے ان کے آنسو پونچھ دیئے جو اداس تھے ان کی باچھیں کھلا دیں۔ جو مسکراتے تھے اُن سے قہقہے سنوا دیئے۔ غرض ایک آن کی آن میں سارے مجمع میں ہنسی خوشی پھیل گئی۔ اب وہ جھروکۂ درشن پر بھی جا کر کیوں نہ بیٹھے۔ یہ خوشی جوں کی توں پھیلی رہے گی۔ جس طرح برن کی نسبت کہا گیا ہے، عام انسانی قلب کی گہرائی میں اس کی قوت رہ کر زور دکھاتی ہے۔ اُسی قوت اور اُتنی ہی سچائی کے ساتھ نظیر کے حق میں بھی کہا جا سکتا ہے ــــ برن کی ہمدردی پہلے گھر اور کنبے میں ظاہر ہوتی پھر رفتہ رفتہ عالمگیر

خاص شیخ سے فیض لے رہا ہے۔ اس کی کیفیت پھیل رہی ہے اور مستفیضوں کو اپنے رنگ میں رنگ رہی ہے۔

غور کرکے دیکھئے تو نظیر اور سعدی میں علاوہ مناسبت فطری کے اور بھی بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ گو نظیر نے سعدی کی طرح مختلف دیار کی سیر نہیں کی، مگر بالکل گھر میں بھی بیٹھا نہیں رہا۔ دہلی سے آگرے آنا تو ایک امر اضطراری تھا، مگر وہ تھوڑا گیا اکثر فرخ آباد جاتا تھا۔ بعض الفاظ سے اس کے حیدرآباد کی بو بھی پائی جاتی ہے۔ اس نے سعدی ہی کی طرح عمر بھی بہت پائی ہے۔ گو سعدی کی طرح سو سے تو متجاوز نہیں ہوا مگر عشرۂ ثمانین سے قریب ربع صدی آگے نکل گیا تھا۔ سعدی جس طرح شیراز میں اپنی ظرافتوں سے نقل محفل ہیں، یہ آگرے میں ہے۔ جس طرح ان کی خوش طبعی نے سیکڑوں لطائف ایران میں پھیلاتے ہیں، اُس کی زندہ دلی نے ہندوستان میں۔ ایک بڑی سلطنتِ اسلامی کا چراغ ان کے وقت میں بھی گل ہوا، اس کے وقت میں بھی۔ بڑے بڑے انقلاباتِ تمدنی سے جس طرح ان کو عبرت کا موقع ہاتھ آیا تھا، اُسی طرح اس کو بھی۔ اُنھوں نے سلطنت عباسیہ کی تباہی کا مرثیہ لکھا ہے، تو اُس نے بھی شہر آشوب کے پردے میں سلاطین مغولیہ کی بربادی پر اشکِ حسرت بہاتے ہیں۔ وہ جس طرح کمالِ فارسی کے ساتھ اعلا درجے کے ادیب عربی مانے جاتے ہیں، یہ کمالِ اُردو کے ساتھ اعلا درجے کا ماہر ہندی خیال کیا جاتا ہے۔ نصیحت اور ظرافت جس طرح ان کے کلام میں شیر و شکر ہے، اسی طرح اس کے کلام میں۔ وہ قطعہ جو مشہور ہے۔

در شعر سہ تن پیمبرانند   ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

اس میں سعدی کو صرف غزل کا اُستاد مانا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ہند میں دو شخص سعدی قرار دیے جا سکتے ہیں، متقدمین میں امیر حسن سنجری معاصر حضرت امیر خسرو دہلوی اور متاخرین میں میر تقی۔

نظیر کو سعدی کہلانے کا صرف اسی قدر استحقاق ہے کہ اس کے اکثر اشعار پر میر کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہے۔ چونکہ وہ میر کا معاصر بھی تھا اور آگرے کے تعلق سے ہم وطن بھی، لہذا اس قسم کا تشابہ کوئی امر مستبعد بھی نہیں ہے۔ مبصر جانتے ہیں کہ نظیر کی

سلجھی ہوئی باضابطہ غزلوں کی تشبیہ سوا میرؔ کے اور کسی کے کلام سے ہو نہیں سکتی ــــ وہ سچے عاشقانہ خیالات ایک خاص دور کے ساتھ سیدھے سادے بولوں میں ادا کر دیتا ہے جس سے سامع بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ یہی حال سعدؔی کا ہے۔ اور یہی حال میرؔ کا۔ تصوف کی چاشنی بھی ایک خاص کیفیت کے ساتھ تینوں استادوں کے کلام میں شریک ہے۔

لیکن حقیقت میں نظیرؔ ہندوستان کا سعدؔی نہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ غزلوں میں شیخ کا مقلد ہے بلکہ اس لحاظ سے کہ وہ اس کے نصائح کے سرچشمے سے سیراب ہوا ہے اور کچھ اسی طرح کے سرچشمے سے سیراب بھی کرتا ہے۔ اُردو کے شعرا میں سعدؔی دکنی سے لے کر حالیؔ پانی پتی تک کوئی شاعر ایسا نہیں گزرا جس کا کلام نظیرؔ کی طرح نصائح کا مقبول اور پُرتاثیر اور بیش بہا ذخیرہ ہو۔ متقدمین میں خاص نصیحت کو تو اولاً کسی نے لیا ہی نہیں اور جس نے لیا بھی تو اس بے دلی سے کہ اس کی نصیحت کا رنگ نہ جما۔ غزلوں کو دیکھئے تو اُس میں عشق، مثنویوں کو دیکھئے تو اُس میں عشق قصائد میں کچھ نقش ہے۔ تشبیب سے کچھ اشعار پند و نصیحت شاید نکل سکیں۔ مگر وہ شخص پند و نصیحت کیا کرے گا جس کو آگے چل کر شدت سے خوش آمد کرنی ہے۔ وہ زیادہ تر بہار پر لٹو ہے۔ تاکہ ہتھیلی پر سرسوں جما کر خوش آمد کے سبز باغ دکھانے کا پُر بہار موقع ملے۔ مسدس کے جہاتِ ستہ بھی اسی آفتِ عشق سے گھرے ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کے مرثیہ گویوں نے البتہ کچھ اس روش میں عقیدت کے ہاتھوں سے نصیحت و پند کے پھول لگاتے ہیں، مگر غم و ہم کی سموم وہاں اس شدت سے چلی ہے کہ پھولوں سے آئی ہوئی شگفتگی رخصت ہو گئی ہے۔ اکثر کیاریوں پر طوفانِ گریہ نے پانی پھیر دیا ہے ــ جہاں گرم ہوا کا جھونکا نرم ہے وہاں لفاظی کے خس و خاشاک اس قدر پھیلے ہیں کہ پھول نظر نہیں آتے۔ گل چیں کانٹوں کے ڈر سے دامن سمیٹے الگ بیٹھے ہیں۔

اُردو کے شعرا میں نظیرؔ ہی ایک شاعر ہے جس نے خاص نصیحت پر اپنی نظر جمائی ہے۔ اس کے نصائح بلند پرواز ی کے پر لگا کر نہیں اُڑتے بلکہ تجربے کی گہرائی سے ابلتے ہیں اور خوش نما طرز پر ابلتے ہیں۔ اس کے لفظوں میں قطراتِ باراں کی لطافت، چمک صفائی اور شیرینی ہے۔ اُس کے فقروں میں آبشار کی سی روانی اور

شور ہے۔ اس کی نظموں میں بھرنے کا سا قدرتی جوشش ہے۔ مثنوی تو اس نے بہت کم لکھی ہے، میری نظر سے اُردو میں صرف ایک گذری۔ قصیدہ بھی، علیٰ ہذا۔ مگر مسدس اور مخمس اس کے اکثر عقیدت، حکمت اور نصیحت کے رنگ ڈھنگ سے جواہرات کی بیچ لڑیاں ست لڑیاں ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کا کل کلام میسر نہیں ہے ورنہ سعدی کی ہر نصیحت کے مقابلے میں اس کی ایک نصیحت پیش کی جا سکتی۔ ناصحانہ مجموعوں کے جمع کرنے والے بہ مجبوری اس کے باغِ طبع سے گل چینی کرتے ہیں۔ اوّلاً تو ایسے مجموعے کم ہیں، مگر جو چند ہیں، ان میں کوئی مجموعہ میری نظر سے ایسا نہیں گزرا جس میں کثرت سے نظیر کے اشعار نہ لیے گئے ہوں۔ غرض یہی نصیحت ہے جو نظیر کو اُردو کا سعدی بناتی ہے۔ جب تک نصیحت کا شیراز آباد ہے، اس کو اس خطاب سے کوئی اتابکِ سخن محروم نہیں کرسکتا۔

اُردو کے شعراء میں شیکسپیر ہونے کی صلاحیت کس میں ہے۔

شمس العلماء مولوی امداد امام صاحب ایک دن مجمعِ احباب میں اپنے زمانہ گذشتہ کا ذکر کر رہے تھے۔ جب وہ ممالک مغربی وشمالی میں کسی مقام پر پیشۂ وکالت کرتے تھے کسی انگریز سے ان سے بہت ربط بڑھ گیا تھا اس کو چونکہ اردو فارسی کا بہت شوق تھا اور یہ ایک مستعد آدمی تھے۔ اکثر ان سے علمی نُہاکرہ[1] کیا کرتا اور فائدہ اٹھاتا۔ ایک دن ان سے اس نے یہ سوال کیا کہ کیوں مولوی، تمہارے اردو کے شاعروں میں شیکسپیر کا ہم پلہ بھی کوئی ہے؟ یہ سوال ایسا تھا کہ جس کا جواب بہت آسان نہ تھا۔ غور میں آئے اور تھوڑی دیر کے بعد یہ جواب دیا کہ ہماری زبان میں ڈرامہ کا رواج نہ تھا اس سبب سے واقع میں تو کوئی بھی شیکسپیر کے مقابلے میں کھڑا نہیں کیا جاسکتا لیکن بہ اعتبارِ قوّۃ ہم سوداؔ میں شیکسپیر کا سا مادہ پاتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض نظموں میں اس کی اعلا درجہ کی زبان دانی کی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ فیضو چیک باز[2] کی ہجو جو لکھی ہے اس میں پسر شکاروں کی اصطلاحیں اور قوش[3] خانے کی تفصیلات اس کثرت

---

[1] نہاکرہ (م)

[2] فیضو چیک باز۔ دیکھو کلیات سوداؔ (م)

[3] سوداؔ کا قوش خانہ دیکھا گیا۔ باز۔ شاہین۔ جرّہ۔ باشہ۔ باشین (مادۂ باشہ) شکرہ۔ ترمتی۔ کُہی۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ے ہیں کہ اس کی وسیع النظری اور کامل معلوماتِ لسانی پر دلیل کافی ہو سکتی ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ سودا کی معلوماتِ لسانی واقع میں بہت ہی وسیع ہے۔

وہ ہر طبقے اور گروہ کی اصطلاحوں سے اس طرح واقف ہے جیسے وہ مدتوں انہی میں رہا اور انہی میں پلا پرورش پایا ہو۔ وہ جب کسی پتنگ[1] باز بونڈے کی ہجو کرتا ہے تو خود ایک چھٹا ہوا پتنگ باز ہے۔ کبھی کسی کی پیندی میں پھندنا لٹکاتا ہے۔ کبھی کسی کو کسی کے پیچھے پنچھالا[2] بناتا ہے کہیں کسی کو سو سو بار گھر میں کھلاتا ہے۔ کہیں نئی ترکیب سے ارگامل کو زرد و باز بناتا ہے۔

(صفحہ 197 سے آگے)

بسیرا۔ چپک۔ دھوبی۔ کوئی گیارہ جانور ہیں اور ان کی زد پر یہ طیور نظر آئے۔ پِڈری۔ چٹیاں۔ (مادۂ لال) نارو۔ ڈھڈو۔ تیتر۔ پینگ (ایک چڑیا کا نام۔) لیک۔ غوغائی۔ دہیٹر۔ بٹیر۔ سبزک۔ بگلا۔ کبوتر۔ ٹیٹری۔ مُنے۔ قمری۔ تیتر۔ لوے۔ ابلقے۔ قاز۔ قرقرے۔ کلنگ۔ سارس۔ حواصل۔ سیمرغ۔ کوّے۔ مینا۔ طوطے۔ چوہے مار۔ گدھ۔ پودنی۔ شکاری غیر شکاری دونوں ملا کر کوئی بیالیس ہیں۔ نظیر کے ہاں 75 سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔ سودا کے یہاں تُرمتی۔ کہی۔ بسیرا۔ چپک۔ دھوبی۔ پینگ۔ چٹیاں[(الف)]۔ چوہے مار یہ سات وہ ہیں جو نظیر کے ہاں نہیں ورنہ سب ہیں۔

(الف) چٹی لال کی مادہ یعنی مادہ لال مینا۔ اس معنی میں صحیح چتی ہے۔ (ش)

[1] ٹھڈا[(ب)]۔ چِلیا۔ ڈھیل۔ بوہائی۔ ہوا نہ پانا۔ لوٹ لینا۔ یہ کٹا وہ کٹا۔ کینا۔ پیچ میں لانا۔ کاٹ دینا۔ پیچ میں آنا۔ ٹوپی والی لنگوٹیا۔ بوندھونا۔ سپولیا۔ پیچ دہرم کرنا۔ بدّھی دار۔ چوٹی دار کنّے ڈھیلے ہونا۔ ڈھلنا کھڑا آنا ہونا۔ لونگر۔ پچھلی پینسی کو جوڑنا۔ موڑنا۔ اُتارنا۔ چڑھانا۔ بگلا۔ چکر۔ چپیٹ کھانا۔ مانجھا چڑھانا۔ کنکوّا شہ دینا۔ گرہ پڑ جانا۔ لڑنا۔ غوطہ دینا۔ دو دھارا۔ کھینا۔ بڑھانا۔ تکل۔ کلسرا۔ پتنگ۔ (ش)

(ب) ٹھڈا پتنگ یا کنکوّے کے بیچ کی موٹی پتلی کھپچی۔ کانپ کے خلاف۔ پٹیا تکل یا کنکوّے کی ڈور کا جھول جو کم ہوا یا وزنی ہونے کے باعث نمایاں ہوتا ہے۔ پیٹا چھوڑنا۔ کنکوّے کی ڈور کا لٹک جانا۔ تکل ایک قسم کا دو کانپوں والا پتنگ جس کا سر تکّا اور پیٹا تیتری سے مشابہ ہوتا ہے۔ تُکّل ایک قسم کا کنکوا جس کو رات میں غبارے کی طرح ایک گیند روشن کرکے اُڑاتے ہیں۔ پتنگ بڑا کنکوا۔ مطلق کنکوا۔ جھپ کھانا۔ پتنگ یا کنکوّے کا جلد بلندی کے بل گر پڑنا۔ (ش)

[2] پنچھار۔ دُم چھالر۔ کنکوّے یا پتنگ کی دُم۔ دُنبالہ۔ (ش)

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

موںڈھوں پرار گیا ملے ہے یہ جب　　زرد اس کو دو باز کہتے ہیں سب

کبھی کسی کے ہاتھ میں شیشہ دے کر مانجھا چڑھاتا ہے :-

رگڑا شیشے کا دو جو اس کے ہات　　پھیر مانجھا چڑھاؤ ساری رات

کبھی کسی کے کنے ڈھیلے کرتا ہے :-

پاس کے آدمی کا یہ جی لے　　خوب کنے نہ ہوئیں تا ڈھیلے

اصطلاحوں کی کثرت سے نظم میں وہ کیفیت پیدا کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک وسیع میدان ہے۔ اس میں پتنگ بازی کا میلہ ہے۔ آسمان کنکوّوں سے چھایا ہوا ہے۔ کوئی یہ کٹا وہ کٹا کر رہا ہے۔ کوئی ڈھیل دے رہا ہے۔ کہیں پینچ دہرم ہوگیا ہے۔ کوئی غوطہ دے رہا ہے۔ کسی کا کنکوّا اچپل ہو رہا ہے اور سر دُھن رہا ہے۔ کوئی اُتار رہا ہے۔ کوئی بڑھاتا ہے۔ کسی نے ڈھیل دے کر کاٹ دیا ہے۔ کھینچے آرہا ہے۔ کنکوّا بونڈ ہو رہا ہے۔

جب کسی بقّال اصل شاعر کی خدمت میں مصروف ہوتا ہے تو پورا بنیا نظر آتا ہے۔ وہی پرلکھا، وہی رام وہی گھنا، وہی بیچ گیر، وہی نکد، وہی مُہت۔

ہنس کے لگا پوچھنے "کی ہے جی یہ جانور　　پرلکھا ہم سے کہو لے چلے اس کو کدھر"

سُن کے کہا بنیے نے "مسرک ہے یہ اپنی بھاؤں　　سانچ کہو پرلکھا باج اسی کا ہے ناؤں"

پھر وہ لگا پوچھنے "کہ یہ تو جینوے ہے کیا"　　+ + + + +

"سانچ بتاؤ مجھے باج کا کی بھاؤ ہے　　ایک کھریدار کو اس کا گھنا چاؤ ہے"

"سُنتے ہی بربھاؤنی نے اس میں ہے کیا تیری گت　　+ + + + +

پیسے مرے کرج ہیں ایک سپاہی کے پاس　　اس نے نکد ملنے کی مجھ کو نہیں ہے اب آس

باج بڑا ہی سا ایک دیکھا میں اس کے کنے　　اس کو کھریدوں میں اب کال کو جو وہ بنے"

(صفحہ 198 سے آگے)

کنکوا۔ تکل۔ چنگ۔ پتنگ۔ لنگوٹیا۔ سپولیا۔ بگلا۔ بدھی دار۔ چوٹی دار۔ کلسرا۔ دوباز۔ ٹوپی والی۔ دودھارا بہنا

سات قانوں میں گور کھو اسے موند　　یہ بہنا ہوا اس جگہ سے بھی بوند

چوگھڑا۔ شوق ہے گھر بہ گھر کے جانے کا　　جامہ پہنے ہے چار خانے کا

بوہائی۔ ٹھڈا۔ پٹیا۔ بولنگر۔ ڈھیل۔ یہ کٹا وہ کٹا۔ وغیرہ وغیرہ۔ (ش)

بنینی ۔ بولی بنینی یہ سُن "اُوت[1] تجھے کھیر ہے اس کی رسوئی ہے ماس، اس سے ہمیں بیر ہے"
بنیا۔ سُن کے کہا بنیے نے "کی کہی یہ تیں نے بات ناری پربھاوتی، رام کی سوں دودھ بھات"
بنینی ۔ بولی "جو یہ سانچ ہے، لا کے اسے تو سویر تھوڑے گھے کو نہ سوچ، جوں بکے توں بیچ گیر"
بنیا۔ آکے سپاہی کے گھر بولا کر "مرجا جی آؤ کرکے حساب آج تم، کہنے کو میرے چکاؤ"
بنیا۔ بنیے نے سُن کر کہا "کرج میں کچھ بیر ہے کھیر جو بتلاؤ ہو آج تمھیں کھیر ہے
سیانے تھے مرجا جی تم ہم سے کرج لینے میں ننھے ہوئے جاتے ہو کاہے کو اب دینے میں
ہو جو چکوتا مرا بلج کے بکنے ہی پر باج کو ہی دو مجھے سانچ کا کچھ بھاؤ کر"
بنیا۔ بول اٹھا بنیا یہ سُن "پرمکھا کی کھیر ہے کرج کسو کا نہ دے کوئی اجب شیر ہے"
بنیا۔ دیکھ تو پربھاوتی، پرمکھا، کی باج ہے رام جی کی بچھل ہے آج ہمیں راج ہے
بنینی۔ دیکھ کے ان نے کہا "اُوت تجھے ہے علوم یہ تو جناور ہے وہ، ترک کہیں جس کو بوم
ناؤں نہیں لیویں ہیں پرتکی ہیں اس کا سویر کھویا کرج ساتھ تین نکد روپیوں کا ڈھیر"
بنیا۔ کہنے لگا "ہائے وہ کیا یہ دگا دے گیا سو نکد اور دو کی جنس گھر سے مُتھت لے گیا"
بنیا۔ سانچ بتا میری بات، لینے یہ کچھ تو بکی ہے سب ہے دیا رام کی، یہ بھی ہے اُلّو بھی ہے"

جب کسی ضائع روزگار لکڑی باز لونڈے کے ساتھ ہاتھ ہلاتا ہے تو پورا پہلوان ہے مرزا مُفت برجی بن کر آتا ہے۔ اور یوں اکھاڑے میں ڈنڈ پیلتا ہے۔

دیکھ کر دست بوس ہی میں سُبھاؤ کر گئے مرزا پُور پُور سے داؤ
رکھ کے گردن پہ ہاتھ مارے اڑے کیا کہوں کس طرح سے کُشتی لڑے
کرکے یک دستی اور پیچھے جائے گرہ دیکھنے سے اس کو پیچھے مُبلائے
کے ہفتہ، چسڑھا دیے گھُٹنے اور کیا کیا کیا، کہوں کس سے
کس مُچکا کاچھ کے تئیں جس دم پھر ہوا سامنے بجا کر ۔۔۔ خم[2]
مرزا نے دیج۔ بنا قدم گاڑا لونڈے کو ڈھاک پر تڑتڑا مارا

---

[1] اُوت (1) بن بیاہا۔ کنوارا۔ وہ مرد جو بیاہ ہونے سے پہلے مر گیا ہو۔ (2) بے وقوف احمق۔ (3) نامُراد۔ لاولد۔ بے اولاد۔

[2] خم ٹھونکنا۔ پٹھے ٹھونکنا۔ ڈنڈ بجانا۔ (ش)

نیچے لینے کا مرزا نے کر ٹھاٹ   کیا لونڈے پہ دوں ہی دھوبی پاٹ[1]
چاہے تھا زانو میں اُسے جکڑا   لونڈے نے دوڑ مالکھم پکڑا
کر کلارنگ، دے بغل کے بیچ   کیا کیا اُس کو دکھائے اُونچ اور نیچ
دے لنگوٹے میں ہاتھ جڑنا پھاڑ   کیا کہوں کیسی کی اکھاڑ پچھاڑ
دھس کے پٹھوں میں پھر اٹھالے چٹ   کہا "کہہ اب کے چت کروں یا پٹ"
کُشتی کا لونڈے کو پڑا جو مزا   کہا "ہو جس طرح سے تیری رضا"
غرض اسرم میں اُس کو پیچ کہا   ٹنگڑیاں کھینچ زور کھینچ لیا
دے کے اُس بہت دو دم میں گلا   ٹانگیں جب دیکھیں مور چال چلا
الغرض اس طرح سے کُشتی لڑ   ڈال پٹکا گلے میں، پاؤں پڑ
بولے مرزا "بُرا نہ مانو گے   اپنا اُستاد مجھ کو جانو گے"

جب الغزا بن مُحسین کی ماں کی زبان سے بین کرتا ہے۔ ایک دُکھیاری عورت نظر آتا ہے۔

ٹک تو پیارے لب کو کھول   غوں غاں کر مادر سے بول
ہے ہے میرے لال انمول   جی ماں کا ہے ڈانوا ڈول
تجھ بن میرے نورالعین
کیوں کر ہو اس دل کو چین
روتا میں کس کو بہلاؤں   دُودھا تھپک کر کس کو سُلاؤں
چھاتی آگے کس کو سُلاؤں   جھولے میں اب کس کو جُھلاؤں
تجھ بن میرے نورالعین
کیوں کر ہو اس دل کو چین
بچّے کو چڑیا جو گنوائے۔   جنگل جنگل ڈھونڈھنے جائے
دانہ پانی اس کو نہ بھائے   رینٗ بسیرے[2] نیند نہ آئے
تجھ بن میرے نورالعین
کیوں کر ہو اس دل کو چین

---

[1] دھوبی پاٹ۔ کُشتی کا ایک پیچ جس میں حریف کو کمر پکڑ کر دے مارتے ہیں۔ (ش)
[2] رین بسیرا۔ رات کاٹنا۔ شب باشی۔ (ش)

گاتے بھی تب اڑاتی ہے   بچھڑے جو چھٹ جاتی ہے
آٹھ پہر دُکھ پاتی ہے   میری تو کیا چھاتی ہے
تجھ بن میرے نورالعین
کیوں کر ہو اس دل کو چین
جاگ پیارے ہوئی اوبیر   سومت، 'لالا'، اتنی دیر
مجھ ماں سے مت آنکھیں پھیر   زیست سے مجھ کو مت کر سیر
تجھ بن میرے نورالعین
کیوں کر ہو اس دل کو چین

لیکن اس امر میں کچھ سوداؔ ہی مختص نہیں ہے۔ میرؔ صاحب کی زبان دانی اعلا درجے کی تھی۔ اس میں کسی طرح کا شک نہیں لیکن ان کا کلام جس قدر موجود ہے، اس سے اس قدر گہری واقفیت کا ان کے ثبوت نہیں ملتا۔ عام زبان دانی ان کی بہت خاصی ہے لیکن وہ زبان دانی کہ جس گروہ کے خیالات ظاہر کیے جائیں، معلوم ہو کہ خود اسی گروہ کا آدمی بول رہا ہے۔ ان کے موجودہ کلیات سے مستنبط نہیں ہوتی۔ ان کی زبان ایک ثقہ شاعر کی زبان ہے۔ شستہ ترکیبیں ان کے مزاج کا خمیر ہو گئی ہیں۔ وہ شاعری کے بلند زینے سے بمشکل نیچے اُترتے ہیں چونکہ بے دماغی بڑھی ہوئی تھی۔ مزاج میں ایک خاص خلوت پسندی تھی۔ سوسائٹی میں کثرت سے ان کو ملنے جُلنے کا کم اتفاق ہوتا تھا۔ ہر طرح کی صحبت میں شریک ہونا ان کے نفس پر کسی قدر شاق ہوتا تھا۔ ثقاہت اتنی تو اجازت دیتی ہی نہ تھی کہ رقص سرود کی محفل میں گھڑی دو گھڑی کو شریک ہو کر غم غلط کر لیں ـــ بایں ہمہ اس سے انکار کرنا کہ وہ ہر طبقے کی زبان سے واقف تھے اور اگر چاہتے تو ہر طبقے کی زبان خاصی طرح نہایت فصاحت اور برجستگی کے ساتھ لکھ سکتے تھے، ان کی زبان دانی پر بہت بڑا نقص عائد کرتا ہے۔ ان کی شستہ اور متین ہی عبارت میں کہیں کہیں ہم ان کی مفصل معلوماتِ زبان کی جھلک دیکھتے ہیں۔ مثنوی تو مثنوی غزل کی تنگ وسعت میں بھی ان کی تفصیلی زبان دانی اکثر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ آصف الدولہ کے شکار نامے میں شکاری معلومات کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مُرغ بازوں کی مثنوی میں زبان دانی کی پالی میں تحقیق کے مُرغ اچھے لڑے ہیں۔

پر دِ پرزہ درست ویکساں ہے　　مُرغ تصویر کا بھی حیران ہے
لات کی گھات کر جو مُڑجاوے　　لسرِ طائر کا رنگ اُڑجاوے
ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا[1] ہے　　اس کے آگے کینل پھیکا ہے
مُرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں　　سینکڑوں ان سیقھوں کی باتیں
اُن نے پَر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے　　اِن نے کی نوک پہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج　　ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دَھج
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ　　ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جُھکتے ہیں آپ کو چُراتے ہیں　　لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

ہولی کی مثنوی بھی اسی رنگ سے رنگین ہے۔ سانگ بھی خاصے ہیں۔ آتش بازیاں بھی اچھی ہیں۔

گُل فشاں ہیں پڑیں جو پُھلجھڑیاں　　کُھلتیاں ہیں دلوں کی گلچھڑیاں
بادے دو دیے ہوئے گر ماند　　دغیں مہتابیاں کر نِکلے چاند

میر صاحب کی زبان دانی واقع میں کتنی ہی ہو مگر سودا کے مقابلے میں ہم ان کو کھڑا نہیں کر سکتے۔ سودا کے مقابلے کے لیے ہماری تحویل میں دو شاعر ہیں۔ ایک تو نظیر دوسرا انشا اللہ خاں۔

اب میر اور سودا اور نظیر اور انشا اللہ خاں میں جو فرق ہے اس کو ملاحظہ کیجیے۔ سودا کے مزاج میں بالخلقتہ معرکہ آرائی ہے۔ وہ مزاج کا لڑاکا واقع ہوا ہے۔ اس کو جب غصّہ آتا ہے تو کسی طرح اپنے مزاج پر قابو نہیں رہتا ہے۔ جو کچھ اس کے مُنہ میں آتا ہے بک دیتا ہے۔ وہ تعلّی کے مضامین کو اپنے کلام میں خوب چمکاتا ہے۔ وہ رسمی مشائخ اور خشک زہّاد پر اچھی ٹیپ جماتا ہے۔ ہجو کی کڑی کماں کو شعرائے اُردو میں پہلے پہل اسی نے زہ[2] کیا۔ جس قسم کی

---

[1] ٹیکا۔ خصوصیت کا نشان جیسے

اڑد کھے میسرے ماتھے ٹیکا
مجھ بن نباہ نہ ہونے کا　(ش)

[2] اصطلاح فنِ تیر کشی۔ (م)

ن نے اپنے لیے تجویز کی تھی اس کے زہ کرنے کو کچھ اس کی قوت بھی درکار تھی۔ لوگوں کو ہنساتا ہے مگر آپ نہیں ہنستا۔ جس قدر زیادہ ہنسانا چاہتا ہے اسی قدر زیادہ منہ بنا تیوری چڑھا لیتا ہے۔ جس کے ذریعے سے وہ اپنے مخاطب پر خوش دلی کا اثر پیدا کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اس کو ایک خاص کاوش ہوگئی ہے۔ بھانڈوں کی طرح وہ نقلی جوتے گدّے پر نہیں جماتا۔ وہ سچ مچ کا پکّا سولہواں سر بدلے کر مستعد ہو جاتا ہے۔ وہ بھانڈوں کی طرح ان کو مہلت نہیں دیتا۔ جب تک چاند گنجی نہ ہولے وہ ہاتھ نہیں روکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں کس قدر زور تھا۔ اس غیر معمولی زور کے نکلنے کے لیے ڈرامہ سے بہتر کوئی رستہ نہ تھا۔ اس میں یہ زور مختلف اشخاص پر تقسیم ہو کر ایک اچھا خاصا اثر پیدا کرتا ہے۔ اس کی زبان دانی مختلف فرضی اشخاص کے منہ میں فصاحت کے لب و لہجے سے مناسب تقریر کرتی اور عمدہ طور سے پھولتی پھلتی۔ اس کی کاوش پسند خوش مزاجی اور کینہ کش زندہ دلی خیالی مسخروں پر دلکش اور مفید طور پر اپنا مسرت بار بخار نکال سکتی۔ غرض میری رائے میں وہ ایک عمدہ کمک رائیٹر (ظریف انشا پرداز) ہو سکتا تھا جس کے قلم سے شاید اعلا درجے کے ناٹک نکل سکتے تھے۔ رُلانے کی قابلیت اس میں میر سے زیادہ نہ تھی۔ میر کی طرح وہ دل برشتہ کہاں سے لاتا۔ یہ برشتگی میر صاحب کو فطرت سے ملی تھی۔ ایک آنچ کی کسر تھی وہ مصائب نے مٹا دی۔ زمانے کے مصائب نے ان کے دل کو ایسا گداز کر دیا تھا کہ ان کے ہر شعر سے دل پر ایک چوٹ بیٹھتی ہے اور ہر نظم سے ایک خاص اُداس اثر قلب پر پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے لوگ کہتے ہیں کہ ان کے کلام میں ستر دو بہتّر نشتر ہیں۔ دُنیا کی معلومات اس شخص کی بھی کم نہ تھی۔ اگر اس شخص کی تُزینی[1] ٹریجڈی کے آتش فشاں سے اُبلتی تو آنکھوں سے اشک کے چشمے ایک خاص خوش نمائی سے جاری ہوتے۔ ان کی آہِ سرد نسیم سحر کا کام نہیں دے سکتی تھی اور کس طرح ان کی ہوائے طبیعت کے جھونکے سے کمیڈی کے گلزار کا پھول کھل نہیں سکتے۔ خلاصہ یہ کہ سوداؔ ٹریجڈی کے لیے ناموزوں تھے اور میرؔ کمیڈی کے لیے پورے شیکسپیر نہ یہ ہو سکتے تھے نہ وہ۔ ہاں کسی طرح دونوں روحوں کو قدرت ایک غالب میں پیدا کرتی تو شاید ہم شیکسپیر کا جواب

---

[1] تزینی۔ سوگواری، غم زدگی۔ (م)

ایک شخص کے ذریعہ سے دے سکتے۔

اب انشاؔ اور نظیرؔ میں فرق دیکھیے۔ انشاؔ کے مزاج میں ظرافت غایت درجے کی ہے۔ وہ اخذِ زبان کا ایک خاص ملکہ رکھتا ہے۔ ابھی وہ پنجابی بولتا ہے۔ ابھی پشتو میں "ڈوڈے او تڑا" کر رہا ہے۔ پل میں وہ ایران پہنچتا ہے۔ اور شاہِ ایران کی زبان بن کر یوں سناتا ہے "بو کر من ہم زعنایاتِ تو غلطے ببرم"۔ دم میں ترکستان پہنچتا ہے اور والیِ ترکستان کی زبان سے یوں ہانک لگاتا ہے "شاہ حسن ایلگدا اوستہ اے شاہ کرم"۔ بدو عرب کا شاعر بنتا ہے اور یوں ارشاد کرتا ہے ؎

شلہ لیس شجاعٌ وامیرٌ فی الدھر　　خصہ اللہ مغیثا بجمیع العالم

پھر اطرافِ خراساں سے یہ زمزمہ سناتا ہے:-

موکہ در عشقِ تو دوبا در مجہسم　　بزبیں ذرمیلم بہوا در مجہسم
دلبرِ مو بنشاپور و حوالی بمشد　　تو ببیں موز کجا تا یکجا اور بجہسم
حلتہ عہد مرا یوسف اور شاہ بدانم　　مونمک خوردہ رلا مطنبہ منظر مدام

کبھی راجپوت کا روپ بھرتا ہے اور دشمن کے چھریاں مارتا ہے:-

کاتیں باندھا چھری بیری جو نہ ہو جائے بھسم

کبھی زمان شاہ کی زبان سے کابل سے یہ لہجہ سناتا ہے:-

ذرزماں ایں زمادوار پتاصد قے کنزم کبھی کنگ انگریز بن کر یوں گٹ پٹ کرتا ہے:-

اومی لاڈیو نو آلمٹی یور سیلو

پیشوا بن کے کبھی یوں امامِ فصاحت بنتا ہے:-

داداری اکڑی آل نچہ سلہدار ری بلا

حاکمِ کشمیر بن کر یوں کبھی بندگی بجا لاتا ہے:-

یہ بندہ بھی فدوی تجھ کو ہے دلم ودرم

زری مل محلہ ہوں سکونت درزیدہ　　یا نہیں مجھ کو دیا چاہے کا او ساک کرم

برج کی گوپیوں کی زبان سے کبھی یوں بنتی[1] کرتا ہے:-

ڈھونڈ رہے درم کہ پنگھٹ ہوں بتی آئے جو　　بھوم رے سیام برن کیس چھٹے چھٹکے تم

---

[1] بنتی۔ عذر خواہی، معذرت، منت سماجت، عرض، التجا۔ (ش)

کبھی لکشمی کی زبان سے یوں مژدۂ دولت سناتا ہے :۔

تورے چرنوں لگی ہوں چھاڑ اوتے سگر دگھ

کبھی کسی مُغلیے سے تمسخر کر رہا ہے :۔

تمھارے ہاتھ سے ساقی جو شیشہ توت گئی　　بلا ہوا کر دیگر تم بلا سے جوت گئی
چہ جوت جوت دروغے کے ناک میں دم ہے　　مغل جو تم سے بلا قسمت اسس کا پوت گئی
مثالِ ماہیٔ بے آب میں ترپتی ہوں　　نکل کے دلوسے آں سر پہ برج خُوت گئی
چہ چیز جالۂ مکری است زالِ محتالہ　　جولے کے تارِ سخن را چو عنکبوت گئی
عظامتہ نخرہ چوں فدائے نخرۂ او　　اور اس کی زُلف کی جوں آنکھ سے چت توت گئی
جو اس پری کو میں دیکھا یہی کہا اشتلر　　کر فوجِ غربلہ آئی مغل کو لوت گئی

کبھی اہلِ خطّہ کی خاک اُڑا رہا ہے :۔

ایک اہلِ خطّہ مجھ سے ہوکر خفا یہ بولا　　میں نے جو اسس کو کانا کھو دیا چمن میں
چاہیے او قف پکڑتا تو وہ بے عقل شعر چست　　مجھ کو اندر خندہ کے گالی کیا چمن میں

مغلوں کی نقل ایک اور :۔

سُن کر اسس پر بادلبس آغا نے اک جریب　　دی پشت برہمن پہ بہ زور تمام چھوڑ
کہنے لگا چرن جے چرن جے تو بولے آپ　　کردی تو بدو عام چپرا رام رام چھوڑ
ایں مردمانِ ہند مرامی کنند اسیر　　ام بابا باگ جاویں گے بس ایں مقام چھوڑ

لہجہ برہمہ و نہود :۔

مہاراج جی تم نے یہ سچ کہا　　جنھیں درشن ات ہیں انھیں درشن اُت
کہے ہے انھیں دیکھ کر راجا اندر　　یہ لجیات ہیں تم تیں دامن کی دُت
(چمک)

انگریز کی نقل :۔

کر چ لے کر آہ کی کہتا ہے یوں دل چرخ سے　　تم سے دَل بوگر بڑا صاحب لڑائی مانگتا

اہلِ عرب کی نقل :۔

عجب طرح کا یہ مضمون ہاتھ آیا تھا　　کسی عرب کی جو ضربت رسیدہ تھی کفِ دست
تو اہلِ ہند کے سمجھانے کو یہ کہتا تھا　　ہٰذا ملاحظہ شُف انّ ہٰذہ اچوت اسٹ
(چوٹ)

اسی طرح عربی فارسی اُردو کو بھی قیاس کر لیجیے۔

غرض اس کے مُنہ میں پندرہ سولہ زبانیں ہیں۔ ہر چند یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر زبان کو منصفانہ قابلیت کے ساتھ جانتا تھا لیکن اس میں کسی طرح کا شبہ نہیں کہ وہ زبان سیکھنے کی ایک خاص صلاحیت ازل سے لے کر آیا تھا۔ وہ ہر آدمی کا لہجہ اختیار کر لیتا تھا اور نہایت ہی عمدہ طور سے اس کی نمائش کرتا تھا۔ یہ ایک خاص قدرت ہے جس کو ڈراما نویسی سے زیادہ ڈراما کے ایکٹ کرنے میں دخل ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت کا مادہ بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ سعادت علی خاں کے دربار میں جہاں یہ پہنچا معلوم ہوا کہ ایک طائفہ بھانڈوں کا آ گیا۔ کبھی نواب کی ڈھول کھا رہا ہے۔ کبھی کسی کشمیری کو بیٹھا چڑا رہا ہے کبھی بیگم کی طرح ڈوپٹہ اوڑھ کر ناز نخرے کے ساتھ ریختی کے اشعار پڑھ رہا ہے۔ دلوں میں کرکولے کی لچک اور مٹک چٹک دیکھ کر مردانہ گدگدی پیدا ہو رہی ہے حاملہ عورت بنا ہے۔ دردِ زہ کی بے اختیارانہ چیخیں دُور دُور تک پہنچ رہی ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں واقعی کوئی نیک بخت بچّہ جنم رہی ہے۔ کبھی وہ بچّہ ہے جو ابھی پیدا ہوا ہو۔

اسی طرح رو رہا ہے۔ لوگ ہیں کہ مارے ہنسی کے بے اختیار ہو رہے ہیں۔ نواب رزیڈنٹ سے ملاقات کر رہے ہیں نہ نواب کی کرسی کے پیچھے رزیڈنٹ کو دکھا دکھا کر کھڑا چہرے کی لے رہا ہے۔ وہ جھینپ کر سر نیچا کر لیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ندیمی کے اسٹیج کا خورشید جی تھا۔ جو حرکت تھی مضحک، اور جو بات تھی ہنسانے والی اگر اس کو کسی واقعی اسٹیج پر باضابطہ تعلیم دی جاتی تو یقیناً اوّل درجے کا گیرک ہوتا۔ زبان کے اخذ کی غیر معمولی قدرت، مزاج کی جبلّی شوخی، طبیعت کی طبعی شگفتگی، اعلا درجے کا انتقالِ ذہن، کافی علمی استعداد، یہ باتیں اس کو ایک عُمدہ ڈراما نویس بنا سکتی تھیں لیکن متانت کی اس میں بھی ایسی قلّت تھی کہ شائد وہ عُمدہ ٹریجڈی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس کے کلام میں کوئی ایسی مثال مجھ کو نہیں ملی جس سے دل پر کوئی گہرا اثر رقّت کا پڑے۔ وہ انسان کے عادات وخصائل کو کوئی غائر نظر سے دیکھتا نظر نہیں آتا۔ وہ سرسری طور پر ہر مجمع پر نظر ڈال جاتا ہے۔ خیالات کی الجھنیں اور اغراضِ متفرق کی کیٹلیاں جو دلوں میں جمی ہوئی ہیں، ان کی کارروائی اور روداد کی بہت کم پروا کرتا ہے۔ اس لیے وہ اس عالم کے متعلق کبھی کوئی سنجیدہ اور فہمیدہ رائے نہیں دیتا۔ ڈراما کے لکھنے میں سب سے بڑی چیز انسان کے اطوار اور اخلاق ہی کا پہچاننا ہے جس کو مختلف اشخاص کے خصوصیاتِ خیالی کا

زیادہ علم ہے وہی عمدہ طور سے ان اشخاص کی تصویر بھی کھینچ سکتا ہے۔ ہندوستان میں نظیر کو بھی ہم کسی طرح کم رتبہ نہیں پاتے۔ اس نے ایک نظم لکھی ہے جس میں سات زبانیں ہیں۔

(1) فارسی:-

پری رخِ من شکر لب من دے تو بازآ بہ پیشِ چشم
بیاد سروِ توبے قرارم، نہالِ لشتہ قد شدہ است بالا

(2) عربی:-

فداک وجہک مثل شرتک دموع نہری من فراق
کثیر حذنی مع الہموم ثقیل ہجرے کا لجبالا

(3) پنجابی:[1]

تساڈے ہتھے نوں دل ہے بیکل ایہی وہ گلاں نت اکھدا ہے
سدا نیناں دے اپنے گھر وچ نہیں تو اتھی اساں نالا

(4) ہندی (بھاشا)

تمہاری آسا لگی ہے نس دن تمہارے درشن کو ترسیں نیناں
دلارے سُندر انوٹھے ابرن ہٹیلے موہن انوکھے لالا

(5) مارواڑی:

اپن کے من کو جو چھینوں نہیں اے یار کائیں لگائی آتی
پھرائیں آکر کھبر لو جانکی پلک کنارا جو تھان نے گا گھالا

---

[1] پنجابی زبان کے دو شعر باطن نے دیوان سے بھی نقل کیے ہیں۔

یہ عشق دی بہاران جن دہلی آندیاں ہیں
کہ کر طرح جگر وچ دھوہیں مچاندیاں ہیں
کوئی نہ دیکھدا ہے، دیکھو بہ تو پیارے
تم بن ہماری انکھیاں آنجھو بہاریاں ہیں

ہو کے خفا اور تیوری چڑھا کر بولی ہیں اپنی کہا نظیر   اپن نے جد گھالی تھی نہیں جن شخص او ہو کا بن چھیے (ش)

(6) پوربی:-

ارے کیلے، ارے چھبیلے، ارے ڈھبیلے، کبھی تو آنان
اگن برت ہے ہیا میں مورے رہ تیرے لے من موہنوا
تورے جو نینوں نے موہا مہکوں، نہ چینوں تنکو بھوادکھالا

(7) برج:-

جگت سبھا مت برہمکھ اٹک کھوا ممن کرن کھا
دوانی کیسنی تُمن سرکھن، نہ سُدھ کی گر، پر، نہ بدھ کی چھالا

ان سات زبانوں کے علاوہ آٹھویں زبان وہ اردو بھی جانتا تھا۔ اس زبان کے نکات جیسے اس کو شاید معلوم تھے کم کسی پر کھُلے ہوں گے۔ آزادوں کے لہجے میں جس وقت گفتگو کرتا تھا معلوم ہوتا تھا واقعی انھیں کے میل کا آدمی ہے۔ جوگیوں کی اصطلاحوں میں جب اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا، کوئی سُن کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جوگی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے مردانہ اور زنانہ خیالات کی تصویریں جو اس نے کھینچی ہیں، ان کا کسی مُسلمان کے قلم سے نکلنا ایک قسم کا تصرّف معلوم ہوتا ہے۔ وہ گنواریوں کے روزمرّے اس خوبی سے ادا کرتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کبھی شہر میں اس کا گزر بھی نہ ہوا تھا۔ ریختی کو ان دنوں شروع شروع رواج ہو رہا تھا۔ ہنوز اس کو پوری مقبولیت حاصل نہ ہوئی تھی۔ اساتذہ شعراء اس کی نسبت رکیک خیال ظاہر کرتے تھے۔

میر صاحب دیوانِ سوم میں فرماتے ہیں:-

خسروں نے ریختی کو ووں ریختہ بنایا
جوں ان دنوں میں بالے لڑکوں کی بالیاں ہیں

میر دردؔ کے ایک شاگرد میر غفیر غلینی دتیائی نے کوچۂ بلاقی بیگم کی بی نورن سے جو ایک مشہور تقریر کی ہے اس میں انھوں نے بھی ریختی کے باب میں اپنے خیالات خلاف میں ظاہر کیے ہیں۔ اس سب سے زیادہ ایک اور سُنیے کہ سعادت یار، طہماسپ کا بیٹا انوری ریختے کا آپ کو جانتا ہے۔ رنگینؔ تخلّص ہے۔ ایک قصّہ کہا ہے اس مثنوی کا "دل پذیر" نام رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسنؔ پر زہر کھایا ہے۔ ہر چند اس میر مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیوں کر کہیے۔ سارے

لوگ لکھنؤ کے اور دِلّی کے رنڈی سے مرد تک پڑھتے ہیں۔

بیت:

چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی
کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سوا اس بیچارے رنگین نے بھی اس کے طور پر قصّہ کہاہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم، لیکن بچارا برچھے بھالے کا رکھنے والا، تیغ کا چلانے والا تھا، تو ایسا قابل کہاں سے ہوا اور کرہائی[1] پن (کُنھائی پن) جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختے کے تئیں چھوڑ کر ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ اپنا مُنہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے ع

یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو
اور نچوڑی انگیا اور نگوڑی انگیا اور مروڑی انگیا، مُردہ ہو کے یوں کہے ع
کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں

اور کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے۔ اُوپر والیاں چیلیں، اُوپر والا چاند اُجلی دھوبن، اندر والا دل اور دوگانہ[2] گانا، بے گانہ، زناخی[3] الایچی دوست۔ لیکن جس آدمی کو واقعی شاعرانہ مذاق ہو وہ عورتوں کی پیاری بولی کو کیوں کر نا پسند کر سکتا ہے۔ عورتوں کی زبان مختلف اسباب کی وجہ سے آمیزش سے محفوظ رہتی ہے۔ اس میں زبردستی کے عربی فارسی الفاظ شریک نہیں ہو سکتے۔ اس میں غیر زبانوں کے

---

[1] کرہائی۔ (کرہائی پن) مرد شبیہ، بزنان در لباس و کلام و حرکات۔ (ش)

[2] دُگانا۔ ہم عمر عورتوں کا ایک رشتہ جو دو مغز کا بادام کھا کر جوڑا جاتاہے۔ (م)

گر دُگانا وہ نہیں ہے تری ہر دم
تو یہ پھر چھیڑتی ہے تجھے کیوں آن کے سوسن کوکا (رنگین) (ش)

[3] زناخی قلعے کی عورتوں کا دستور تھا کہ وہ آپس میں اس طرح کے رشتے مقرر کر کے ایک دوسرے کو خطاب کیا کرتی تھیں۔ جس طرح سہیلی بھینلی کہتے ہیں، اسی طرح وہ کسی کو دل دھان، کسی کو جان جیٔ کسی کو دشمنی، کسی کو زناخی، کہا کرتی تھیں۔ زناخی کا رشتہ اور رشتوں سے زیادہ مضبوط اور قابلِ قدر گنا جاتا تھا۔ جب انھیں کسی کو زناخی بنانا منظور ہوتا تھا تو وہ باہم مل کر زناخ یعنی کبوتر یا مرغ کے سینے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

محاروں کا خام ترجمہ دخل نہیں پا سکتا۔ تکلّف کے استعارے اور تشبیہیں اس میں مائی نہیں رکھتیں۔ استعارے سیدھے سادے، اُلجھاؤ سے دُور، تشبیہیں برجستہ، قدرتی، تکلّف سے الگ۔ پھر آواز وہ کہ چڑیل بھی اگر پردے میں بول رہی ہو تو معلوم ہو کوئل کوک رہی ہو یا بُلبل چہک رہی ہو۔ دل میں ان کے خیالات بھی ایسے ہی لطیف اور نازک اُبلتے ہیں کہ اس کوثر کی دھوئی ہوئی زبان کو زیب دیں۔ عشق و مُحبّت کے خیالات مردانہ دلوں میں اُتنے لطیف نہیں ہیں جتنے زنانہ دلوں میں ہیں۔ عورتیں گویا قدرت کی طرف سے خاص اُلفت و ہمدردی ہی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ان سے ایک زمانے تک بچّوں کا رکھ رکھاؤ متعلّق رہتا ہے۔ وہ کیا کیا تکلیفیں ان کی پرورش کی اُٹھاتی ہیں اور پیشانی پر بل نہیں آتا۔ جب تک بچّے بے شعور رہتے ہیں راتوں کو ان کی نیند حرام رہتی ہے۔ ذرا سی پلک لگی اور بچّہ رویا یا بے چین ہوا، آنکھ کھُل گئی —— بہلانے کو گھنٹوں گود میں ٹہلا رہی ہیں۔ تھپک رہی ہیں۔ لوریاں دے رہی ہیں۔ دُودھ پلانے کے زمانے میں بیسیوں قسم کے کھانے کے پرہیز کرنے پڑتے ہیں۔ پرہیزی کھانا کس قدر بدمزہ ہوتا ہے لیکن ان کو اُسی میں مزہ ملتا ہے۔ بچّہ آئے دن بیمار پڑا کرتا ہے۔ دس دن اچھا ہے تو پندرہ دن بیمار۔ مرد اگر ہو تو غضب میں جان آجائے۔ ایک ہی دو دفعہ کی بیماری میں بھاگ کھڑا ہو۔ لیکن یہ کبھی نہیں اُکتاتیں اور دن رات نہایت خوش دلی سے اس کی تیمارداری میں مصروف رہتی ہیں۔ غرض ہمدردی و اُلفت جیسی عورتوں میں ہے واقعی مردوں میں نہیں۔ اسی لیے ان کی زبان عاشقانہ اور ہمدردی آمیز خیالات ظاہر کرنے کے لیے ایک قدرتی ذریعہ ہے۔ لطیف جاذباتِ دلی، شوق، محبّت، اُلفت، ہمدردی، دل سوزی، رحم، شفقّت، تاسّف، عورتوں ہی کی زبان میں کچھ خوب ادا ہوتے ہیں جو مضمون

(صـــ 210 سے آگے)

کی جُڑی ہوئی ہڈّی کو توڑا کرتی تھیں۔ گویا اس طرح یکّی یاری ہری جایا کرتی تھی۔

ہے زناخی مری وہ لال پری
ہو جسے دیکھ کر نڈھال پری (رنگین)

بیگمات قلعہ جب کسی عورت سے بہناپا کر کے اِلاچی کے دانے باہم کھاتی تھیں تو اسے اِلاچی کہا کرتی تھیں۔ (طبق زنوں کی اصلاح) (ش)

وہ ایک فقرے میں ادا کر دیں گی دفتر کا دفتر سیاہ کر دینے سے بھی ادا نہ ہوگا۔

نظیر اس مضمون کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا تجربہ عورتوں کے باب میں بہت وسیع تھا۔ اس نے فقط اپنے ہی گھر میں ان کی زبان نہیں سُنی تھی بلکہ اس کی لطافت سے محظوظ ہونے کے لیے وہ مختلف جگھٹوں اور میلوں میں شریک ہوا کرتا تھا۔ بلدیوجی کا میلہ ہے، گنواری عورتیں ایک جگہ جمع ہیں، ان میں ایک کو کوئی دھکا مار کر شرارت سے نکل گیا۔ یہ گِر کے یوں گالی دے رہی ہے۔

کیسو اٹھلا چلے ہے داڑھی جار

نظیر کی نوٹ بُک میں داخل۔

کاشی والے راجہ اور مائی تھان کی سرکار میں تعلق تھا۔ ان دونوں سرکاروں میں اکثر رنڈیاں اُونچی اونچی آتی تھیں۔ بذلہ سنج، لطیفہ گو، شیریں کلام۔ اپنی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کی خاص سفارشں سے ان کی خدمت میں پہنچتا۔ اور تقرب ہم کلامی حاصل کرتا۔

بخشری محال کا بھی اس کو کم تجربہ نہیں ہے۔ اکبرآباد میں رنڈیاں بکثرت آباد ہیں شاید اس قدر رنڈیاں دوسرے شہر میں کم ہوں گی۔ اکثر دُور سے ان کی خوش کلامیوں سے فائدہ اُٹھاتا اور بعض وقت وہ اپنے شاعرانہ مقاصد نے ان کے کوٹھوں پر جاکے گھڑیوں بیٹھا کتاب ناز و نیاز اور دیوانِ حُسن و جمال کی ورق گردانی کرتا۔ شرعی قانون نے ہمارے یہاں عورتوں کی سوسائٹی کو مردوں کے استعمال کے لائق نہیں رکھا۔ معمولی آدمیوں کو شاید اس پرلُطف سوسائٹی کی ضرورت اور احتیاط چنداں محسوس نہ ہوتی ہو لیکن شاعر بعض وقت ایسی سوسائٹی کے نہ ہونے سے جی میں بہت کُڑھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اصلی خیالات ان کے دریافت کرے لیکن اس کو عورتیں اس مطلب کے لیے کافی طور پر نہیں ملتیں۔ ہارے درجے طوائف کی دُنیا کی طرف جُھکتا ہے۔ گویا عصمت دُنیا کے خیالات سے یہ دُنیا کسی قدر الگ ہے لیکن پھر بھی بہت سے خیالات ملتے جُلتے اور اکثر مشترک ہیں۔ اس سے اس کی تلاش کی پیاس اور تفحّص کی بھوک کچھ تسکین پاتی ہے۔ نظیر نے بھی اسی مقصد سے ان لوگوں کے ہاں اپنی آمد و رفت جاری کی تھی۔ حقیقتہً یہ ان کی رغبت اور نفرت سے بہت اچھی طرح واقف ہوگیا تھا اور ان کے خیالات پر اس کو کامل عبور تھا۔ ان کی زبان کی معلومات بھی اس کو اچھی خاصی تھی۔ ہمدردی عام جو اس کی فطرت کا

خاصہ تھا، اس کو ان عورتوں کی صحبت میں بیٹھتے بیٹھتے اور بھی ترقی ہوئی۔ شاید اسی ترقی دینے کا صلہ ہے کہ اس نے اس "پاک طائفے" کا جہاں بھی ذکر کیا ہے اپنی خاص ہمدردی سے محروم نہیں رکھا۔

عورتوں کی زبان کی معلومات ان بندوں سے کسی قدر ظاہر ہو سکتی ہے جن میں ایک برہن[1] کے عاشقانہ حسرت آلود خیالات کو کس خوبی کے ساتھ آگ بھڑکا رہے ہیں۔

بن دِلبر اب کیوں کر پُھولے میرے دل کی کلی کلی
قول بچن کر کر جھوٹا مجھ سے، پھر جھوٹی خبر نہ لی
گشت لگا کوتوال کا پھرنے، چوکی بیٹھی گلی گلی
اُس بن جی گھبراتا ہے اور لگتی نہیں کچھ بات بھلی
شام گزر گئی یار نہ آیا رات بھی آدھی آن ڈھلی

اس جھوٹے کی راہ کو تکتے تکتے آنکھیں گئیں پتھرا
پھول پلنگ پر سیج کے میرے غم سے سُوکھ گئے مُرجھا
کاجل ڈھلکا سُرمہ بگڑا مُنہ میں پان ہوا پھیکا
جی اُکتاوے دل گھبراوے آہ بھلا اب کیجیے کیا
شام گزر گئی یار نہ آیا رات بھی آدھی آن ڈھلی

---

[1] برہن۔ بروگن، برہ کی ماری فراق زدہ (ش)

حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں ایک عفیفہ نے یہ شعر بتقاضائے فطرت پڑھے تھے جو نظیر کی نظم سے بہت مناسبت رکھتے ہیں۔

تطاول ہذا اللّیل۔ تسری کواکبہ
وآرقنی ان لا ضجیعاً ـــ اُلاعبہ
فوالد لولا تخشّی ـــ عواقبہ
تزعزع من ہذا السریر جوانبہ
مخافتہ ربّی والحیاء یصدّنے
وأکرم بعلے ان تُنالَ مراتبہ

کیا ڈکھ روؤں رات کی میری مفت گئی سب تیاری
بجل مِسّی پھیکی پڑ گئی اور سنگھار ہوا بھاری
انگیا میں کچھ پھڑک پھڑک کر سُست ہوئیں پیاری بجاری
سینہ پھڑکے کلیجہ دھڑکے جاؤں میں کیدھر من ماری

شام گزر گئی یار نہ آیا رات بھی آدھی آن ڈھلی
نیند اُچٹ گئی، کروٹ جل گئی، کاٹے نہیں کٹتی ہے رات۔ کیا ہی بروگ کی آگ میں پڑا جل رہا ہے۔ برہ کی کوک ہے جو دل میں چھید کرتی ہے۔
عشق و معشوق کے دل میں اثر کرتا ہے اور اس کے مُنہ سے بے اختیاری شوق میں یہ بول نکلواتا ہے۔

اب تجھ سے میں اک کوڑی بھی پیارے نہیں لوں گی
یاں کھول تجھے اپنی میں چنپا کلی دوں گی
جاوے گا جہاں تو میں تیرے ساتھ چلوں گی
خدمت سے تری ٹک نہ ٹلی ہوں نہ ٹلوں گی

نائیکا نوچی کو نصیحت کر رہی ہے۔
نوچی مُنہ پیٹ کر ہمسائی سے کہتی ہے۔

+ + + بھنیا

ناحق کی لڑائی ہے نہ لینا ہے نہ دینا
اِک چار گھڑی سے مجھے پٹواتی ہے بُڑھیا

ہمسائی کے دل سُنتے ہی کٹاری لگی اور نوچی کی طرف دار ہو کر گھر میں سے پکاری۔

کیا بات ہوئی تجھ سے وہ کچھ مجھ کو بتا ری
جس بات پہ دوپہر سے لڑاتی ہے بُڑھیا

نوچی

+ بھنیا! یہ گزرتی نہیں ڈھنڈو[1]
اور قہرِ خدا سے بھی یہ ڈرتی نہیں ڈھنڈو

---

[1] ڈھنڈو۔ ایک مشہور شور مچانے والی مٹیالے رنگ کی چڑیا کا نام جو اکثر باغوں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

لب اپنے ذرا بند یہ کرتی نہیں ڈھڈو
کیا سخت خرابی ہے یہ مرتی نہیں ڈھڈو
ایسا جو مرے پاس لگی جائے گی جھانپو[1]
اک روز مجھے گھر سے نکلوائے گی جھانپو
سب کھا چکی مجھ کو بھی یہ اب کھائے گی جھانپو
وہ کون سا دن ہوگا جو مر جائے گی جھانپو

کیسے پورے پورے خیالات ہیں اور کیا ہی مناسب زبان۔ اسی کو کمال زبان دانی کہتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ نظیر نہ فقط مردانہ حق زبان و خیالات سے واقف تھا بلکہ اس نے اپنی تحقیق کو عورتوں کی زبان سے بھی کافی مزہ اٹھانے کا موقع دیا تھا اور ان کے خیالات کے کمروں میں اس کے آزادانہ آمد و رفت کی اجازت تھی۔ زبان دانی میں اس کے مقابل کے بہت سے شعرا نکلیں گے لیکن خیالات کا عمق جو اس کو حاصل تھا شاید بہت کم شعرا کو نصیب ہوا ہے۔ وہ جس مجمع میں کھڑا ہوتا تھا لوگوں کے خیالات ہی کی چھان بین میں مصروف رہتا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اشخاص کی صورت دیکھ رہا ہے لیکن وہ صورت سے معنی کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ انسانی طبیعت کا طلسم بہت کم لوگوں پر کھلا ہے لیکن جن معدودے چند پر کھلا ہے الحمدللہ کے نظیر بھی انہی میں ہے۔ اس نے خوب خوب اس طلسم کی سیر کی ہے اور خوب خوب تماشے دیکھے ہیں۔ ان کا ایسا گہرا اثر اس کے دماغ پر ہے کہ بے اختیار اس کی زبان قلم سے ان کا تذکرہ نکل ہی جاتا ہے۔ عجائبات جو وہ بیان کرتا ہے اس کو پرانی لکیر کے پیٹنے والے رسمی شعرا گو حدیث خرافہ کی پھبتی کہیں، لیکن واقعی وہ بڑے کام کی باتیں ہیں اور اس لائق کی آب زر سے لکھ لی جائیں۔

آتی ہے یہ آواز خود اپنے سر سے
شایاں ہے لکھ رکھیں گر آب زر سے
دنیا کے عجائبات مجھ تیں ہیں بھرے
بہتر ہوں میں ہر ایک عجائب گھر سے

ص 214 سے آگے۔

میں اپنے گروہ کے ساتھ پھرتی اور ڈومنی کہلاتی ہے۔ بڑھیا عورت۔ زن فرتوت۔ بکواسی۔ بکی۔ جھکی۔ (ش)

[1] جھانپو۔ ایک چڑیا کا نام جو اکثر دم اٹھاتی اور ڈھکتی ہے جیسے دھوبن کو بھی کہتے ہیں۔ اوچھال چھنال (ش)

انشاؔ اس خصوص میں نظیر سے کسی طرح لگا نہیں کھا سکتا وہ ایک محض معمولی ٹھٹھول تھا۔ دن رات اس کی اوقات ہنسی دل لگی کھیل تماشے میں گزرتی تھی اُس نے کبھی کسی چیز کو متانت اور سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں۔ اگر وہ متانت سے کسی بات پر غور کرنا بھی چاہتا تو کر نہ سکتا۔ نواب دن رات اس کو اپنے مشاغل تفریح میں لگائے رہتا تھا اِس تفریح کی حد یہاں تک پہنچی تھی کہ قواعدِ زبان اور عروض منطق کے رسالے لکھے جاتے ہیں اور اس میں بھی دل لگی بازی چلی جاتی ہے۔ تعقید معنوی کی مثالیں یوں بیان ہوتی ہیں۔

(۱) گل گتا سبز ڈوپٹا اوڑھے بیٹھی تھی مجھے کہنے لگی کہ میری طرف دیکھا تو اندھا ہو جاوے گا۔ میں نے کہا کہ میں کالا ناگ ہوں مجھ سے ڈرو ہنس کر کہا کہ ڈوپٹے کا رنگ تو دیکھ کس طرح اندھا نہ ہو جاوے گا

(۲) بنّو کی باتیں بھی فیے[1] کی تلوار سے ہاتھی کے زینے پر کچھ کم نہیں۔

عروض میں شاید ارکان کو ظرافت نے یوں پشواز پہنائی ہے۔

پری خانم ۔ مفاعیلن ــــ چنچل پری ۔ مستفعلن ــــ نور باتی ۔ فاعلاتن ــــ چیت لگن۔ فاعلن ــــ پیازو ۔ فعولن ۔ صاحب بخش ۔ مفعولات ۔

نوچیوں اور لونڈیوں کی بھی ایک بھیڑ ہے جو زحاف کا بناؤ سنگار کیے بیٹھی ہیں۔

قلندر رو ہملاگیر، گجراتن ، بی جان، پری، جان، جیٔ البیلی ، نور بخش، انمول، جادی ، بیگی جان، سنجی، سنجی جان ، مال دہی ، دیدار بخش، گوری پیازو، مراد بخش ، نور جہاں ، بڑی پیازو، راج دُلاری۔

شروع سے آخر تک جہاں نظر ڈالیے بس انہی کمبختوں کا ہجوم ہے۔ عروض کا رسالہ کیا ہے خاصی بجسترِی محال کی ڈائرکٹری ہے۔

منطق میں تحصیلِ حاصل کی مثالیں اس طرح ہیں۔

(۱) بالوجی ہیں ہیں مکھا، جیسے ہم مکد کا لڈو کہیں ہیں اسے مکھا لوگ کی کہیں ہیں۔ نالاتن جانے ہوروں کے کھانٹر ماں کبھی آدے ہے کہ ناہیں۔ بھلا بالوجی، ہم لوگ تو سب مکد کا لڈو کہیں ہیں۔ ملوم نہیں کہ ہم لوگ بلاسے اس کا نانو کچھ اور بھی کہیں ہیں کہ لوئی کہیں ہیں۔

---

[1] فیا ــــ ایک قوم رہزنوں کی ہے ۔ راجپوتوں کے ملک ۔ جواہر سنگھ سورج مل جاٹ کے بیٹے کو کسی فیانے ہاتھی پر چڑھتے وقت مار ڈالا تھا۔ (ش)

(2) یہ جو ملّا صدرا میر باقر کی کیر اعلم معقول ماں شاگرد رشید، آد کچھ بوجھی نا نہیں پڑت کہ معقول کیری کتب کیسے پڑھتے ہیں۔

منطق کی اصطلاح بھی تمسخر سے خالی نہیں۔

گُپت ، نظری۔ پرگھٹ ، بدیہی۔ الجھا سوت، تسلسل۔ ایر پھیر، دور۔ جوڑ، حرفِ رابطہ۔ جون کا توں، تصدیق۔ دھیان، تصور۔ بول، موزون۔ بھرپور ، محمول۔ پورا جوڑ۔ موجبہ۔ پورا توڑ، سالبہ۔ بولتی ہوئی ، لفظی دلالت۔ پتا ، معرّف۔ بت کہاؤ ، حجت۔ چُپ چپاتی ، دلالتِ غیر لفظی۔ مراد کا گھر، معنی۔ پھِسّل ، مُفرد۔ پھنسا ہوا ، تقیاسی۔ چھٹا ہوا ، غیر تقیدی۔ اکہری اونچ نیچ ، عموم وخصوص مطلق۔ دُہری اونچ نیچ ، عموم وخصوص من وجہ۔

دولت کی مثال میں منطق میں بھی رنڈیوں نے ہجوم کیا ہے۔

(1) گُنّا کے چہرے سے پایا جاتا ہے کہ شبراتن نے کچھ اس پر غصہ کیا ہے۔

(2) وزیرن کے آج میلے میں نہ آنے سے یہ پایا جاتا ہے کہ حضور کے ہر کاروں کا پاس بہت منظور رکھتی ہے۔

(3) کلّو کا آج مجرے میں نہ جانا یہی کہتا ہے کہ شام کو حضور میں جایا چاہتی ہے۔

(4) بنّو کی دریچہ ہی پکارے کہتی ہے کہ جنابِ عالی مجھے ایک مرتبہ دیکھیں تو اکثر یاد فرمادیں۔

موجبہ جزئیہ کی مثال سنیے۔

بعضے کبوتر گلی خالی ہیں۔ دلیل۔ جو غٹ غوں غٹ غوں کرتا ہے وہ کبوتر ہے۔ اور سب گلی خال غٹ غوں غٹ غوں کرتے ہیں۔ نتیجہ بعضے کبوتر گلی خال ہیں۔

سالبہ کلیہ کی مثال ملاحظہ کیجیے :

جو بگلا ہے وہ کبوتر نہیں۔ دلیل جو غٹ غوں غٹ کرتا ہے، وہ کبوتر ہے اور جو بگلا ہے وہ غوٹ غوٹ غوں نہیں کرتا۔ نتیجہ جو بگلا ہے وہ کبوتر نہیں۔

جس کو ظرافت نے اسی درجے اپنے بس میں کرلیا ہو وہ کب کسی دقیق مسئلے پر غور کر سکتا ہے اور کب وہ انسانی طبیعتوں کے باریک پہلوؤں سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اُس کے پاس ہنسانے کا سرمایہ بہت ہے لیکن دل میں جن باتوں سے سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو، اُن کی اُسے خبر بھی نہیں۔ وہ معلومات کے تیز نشتر نہیں رکھتا کہ دل کو چیر کر آنکھوں سے اشک کے فوارے جاری کر دے۔

انشآ کے پاس اشخاص کے مختلف خیالات کی پوری پوری تصویریں نہ تھیں۔ وہ مختلف اشخاص کو ان کے خاص خیالی خصوصیات کے ساتھ دیکھنے کا موقع ہی نہ رکھتا تھا۔ بخلاف اس کے کہ میاں نظیرؔ اس خصوص میں یکتائے زمانہ تھے۔ میرے خیال میں اُردو کے شعراء میں شاید ہی کسی کو انسانی طبیعت کا اس قدر صحیح اور عمیق تجربہ ہو۔ اُس کی ہر نظم سے پایا جاتا ہے کہ اس کی دن رات اسی کام کے لیے آنکھیں کھلی رہتی تھیں۔ وہ دن رات انسان ہی کا تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ اور انسان ہی کے حالات کے دریافت کرنے کو مقصدِ اعظم جانتا تھا۔ میلے ٹھیلوں میں اگر وہ گیا ہے تو اسی کام کے لیے۔ رنڈیوں کی صحبت میں بیٹھا ہے تو اسی غرض سے سیر و سیاحت کی ہے تو اسی مطلب سے۔

اُس کو مختلف اشخاص کی خصوصیتِ خیالی کا اس قدر گہرا علم ہے کہ جس کی تھاہ ہی نہیں ملتی۔ وہ ایسا ان خیالات میں ڈوبا ہوا ہے کہ اُس کی ذاتی خصوصیتِ خیالی کا مشکل سے پتہ ملتا ہے۔ اُس کی طبیعت ایک ہموار بحر ہے جس میں نہ مینڈھوں کی ٹکر ہے نہ بھنور کا چکر۔ کسی قوم کا جہاز ہو، بہت آسانی سے گزر جاتا ہے اور کسی ملک کی کشتی ہو تیر کی طرح ساحلِ مقصد پر پہنچ جاتی ہے۔ کوئی کیسا ہی گنہگار ہو، اُس کی وجہ سے کشتی چکر میں نہیں آتی، اور کوئی کسی کا ظالم و سیہ کار ہو، اُس کے سبب سے طوفان اُٹھ کر عالم کو تیرہ و تار نہیں کرتا۔

شیکسپیر کے حالات میں گرین[1] نے کسی مقام پر لکھا ہے کہ "باوجود ے کہ متاخرین محققین نے بڑی کوشش و جانفشانی کی لیکن پھر بھی ادنا سے ادنا درجے کی بھی کوئی تفصیل ان کو نہیں مل سکی جس سے اُس کے قبلِ موت گوشہ گزیں ہونے کے زمانے کے کچھ حالات روشن ہو سکتے۔ یہ جو ناصحرِ دنیا کے حافظے پر کوئی خاص ممتاز خصوصیت کا نشان اُس نے نہیں چھوڑا اس کا باعث شاید یہ ہے کہ شیکسپیر کی طبیعت مُفرد اور یکتا واقع ہوئی تھی اور اس کے خیالات میں نہایت مرتبے کا اعتدال تھا۔ اُس کی ذہانت کی عظمتِ شان اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اُس کی تصنیفات میں ہم اُس کی ذاتی خصوصیتِ مزاجی کا کوئی اثر نہیں پاتے۔ یہ جو لوگ قیاس کرتے ہیں کہ سانٹ میں اُس نے کچھ اپنے خیالاتِ خاص ظاہر کیے ہیں۔ اُس کی حالت ایسی مشکوک ہے کہ زبردستی کے قیاسات سے بھی اُس کی حالاتِ زندگی کے متعلق صرف چند موٹی موٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اپنے ڈراموں میں وہ ہمہ تن اشخاص قصہ ہے اور اسی کے اشخاص قصہ تمام قلمرو انسانیت میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ایک شخص بھی ان ڈراموں میں ایسا نہیں کہ اس کو یا اس کے اقوال

---

[1] گرین ـــــ کسی مغربی مصنف سے مراد ہے۔ (م)

و افعال کو خود شاعر کی ذات یا خیالات سے بخطِ مستقیم نسبت دے سکیں ـــــ، یہ خصوصیت ہم نظیر میں بھی پاتے ہیں۔ اُس کی طباعی کے اسٹیشن میں سینکڑوں اشخاص بھرے ہیں۔ مختلف مذہب و ملت کے لوگ خوش خوش پھر رہے ہیں۔ کوئی گپ کر رہا ہے۔ کوئی ہنس رہا ہے۔ کوئی اپنی تعلی میں معروف ہے۔ کوئی دُوت دات ہانک رہا ہے۔ لیکن موسیو ژوبیر[۱] کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ وہ ضُلعِ کُل کے آفس میں بیٹھا ہوا چپ چاپ لوگوں کو ٹکٹ بانٹ رہا ہے۔

نظیر کے خیالات اور تجربوں کا ذخیرہ کسی طرح شیکسپیر سے کم نہ تھا۔ ظرافت اور شوخ طبعی بھی اُس میں اس مرتبے میں تھی۔ ذہانت کا حصہ بھی اُسی قدر ملا ہوا تھا۔ دل میں ہمدردی کا بھی ویسا ہی جوش تھا ہر چند اُس نے ڈراما نہیں لکھا تو کیا ہوا۔ اُس کی اکثر نظمیں ڈرامے کا کام دیتی ہیں۔ جس نظم کو دیکھئے معلوم ہوتا ہے ڈرامے کا کوئی خاص سین ہے۔ خیال کے اسٹیج پر کبھی میاں قلندر اپنا ریچھ کا بچا لے کر تشریف لاتے ہیں ـــ وہی سوامن کا سونٹا جس پر لوہے کی کڑی کھڑکتی ہوئی۔ وہی کاندھے پر جھولنا[۲]۔ وہی ہاتھ میں پیالا۔ وہی ڈھپلی[۳]۔ وہی لڑکوں کا ہجوم وہی کشتی کے داؤ پیچ۔ وہی کہروا ناچ۔ کبھی طوفان کا سماں دکھلائی دیتا ہے۔ چاروں طرف سے آندھی گھر آئی ہے۔ رستے میں کوئی معشوق مل گیا ہے۔ لگا کر گھر لیے جا رہے ہیں۔ گھر پہنچ کر مزے کی خاطر مدارات ہوتی ہے۔ رُقبا کو خبر لگتی ہے۔ آ کر گھر کو گھیر لیتے ہیں۔ لیکن ہر شخص کا گھر اپنی جگہ میں قلعہ ہے۔ کب ان کی کوئی تدبیر چلتی ہے۔ طوفان کی زد میں بیٹھے بیٹھے صورت دیکھنے ہی کے قابل ہو گئی ہے۔

تلے کوٹھے کے بیٹھے، اٹ گئے سب گرد کے مارے

بھری نتھنوں میں اُن کے خاک دس دس سیر آندھی میں

کبھی ہولی کی مجلس کا رنگ جمتا ہے۔ رنڈیوں کی بھیڑ ہے۔ بھوتوں کے لڑکوں کا ہجوم ہے۔ ناچ ہو رہے ہیں۔ ہولیاں گائی جاری ہیں۔ پیہ پکاری آتی ہے۔ رنگ کا چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ گالیوں کی اس سے زیادہ بوچھاڑ ہے۔ پھر ہاتھا پائی ہاتھ پاؤں نکالتی ہے، اور ایک عجیب پُر لطف بھاگ دوڑ مچتی ہے۔ پھر کبھی نیواؤں کا رنگ نکلتا ہے۔ جوگیوں کا قافلہ آتا ہے۔ کسی موقعہ پر پالی کا نقشہ

---

[۱] (Mosio Ioubert)

[۲] جھولنا: فقیروں کی وہ جھیلی جس میں روٹی اور آٹا مانگ کر رکھتے ہیں۔ (ش)

[۳] ڈفلی: ایک دائرے کی وضع کے باجے کا نام۔ (ش)

کھنچ جاتا ہے۔ شوقین اپنی بلبلیں لے کر پہنچے ہیں۔ کھلاڑیوں نے اپنا اپنا پٹھا چھوڑا ہے۔ گھمسان لڑائی ہو رہی ہے۔ کہیں کوئی صاحب بایں ہئیت کذائی کہ داڑھی کے بال بڑھے ہوتے ہیں۔ منہ زرد ہے۔ آنکھوں میں آنسو سے بھر رہے ہیں۔ سر پر میلی پگڑی ہے۔ انگرکھے کے ٹکڑے اڑے ہوتے ہیں۔ لڑکوں کے مجمع میں نمودار ہوتے ہیں اور لڑکوں کے فریفتہ کرنے کو ایک خاص انداز سے گلہری کا بچہ نکالتے ہیں

کمر کو دیکھ، ڈھونڈھی جیب، پگڑی کو ٹٹول اس جا
وہیں ہم نے نکالا ڈھونڈھ کر بچا گلہری کا

اشخاص خاص خاص مزاج اور خیالات کے ساتھ جو اس کے مرقع میں اپنی تصویریں دکھا رہے ہیں، بہت ہیں۔ طوائف کی تصویر اس میں موجود ہے۔ نوچیاں اپنا جلوہ اس میں دکھا رہی ہیں۔ عاشق مزاج تعلّی باز بوڑھے یہیں بنکار رہے ہیں "دیدبازی خدا راضی" کے پروفیسر بہروپ[1] دکھا رہے ہیں۔ بھنگڑ یہیں گاڑھی چھان رہے ہیں۔ نوجوانوں کی عیش و تفریح کی مجلیس یہیں جمی ہوتی ہیں۔ بجلیوں کے سر پر یہیں ٹیپ جمائی جا رہی ہے۔ مُلّوں کی یہیں اونچی کرسی دی گئی ہے۔ چھلّس پیسنے والے اسی بازار میں اپنی دکانوں پر بیٹھے ہیں۔ پہلوان اسی اکھاڑے میں ڈنڈ پیل رہے ہیں۔ کبوتر باز اسی باغ میں کبوتر اڑا رہے ہیں۔ تیراک اسی دریا میں تیر رہے ہیں۔ بھکاری اسی دروازے پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ ٹھگوں[2] کی مشکیں یہیں کسی گئی ہیں۔ جوگیوں نے یہیں بھبوت رمائی ہے۔ صوفی اسی مجلس میں حال تال کر رہے ہیں۔ جوگی، اتیت، جنگم، سیوڑا، نانک شاہی، کبیر پنتھی، بھرتھری، ہندو مسلمان، فاسق، عابد، امیر فقیر، ہر مشرب اور ہر طریق اور ہر خیال اور ہر خصلت کے لوگ اس میں موجود ہیں۔

مختلف اشخاص کی تصویریں اُس نے جس عنوان سے کھینچی ہیں، بہت ہی قابل مدحت، بلکہ بعض اوقات میں موجب رشک ہے۔ وہ اشخاص کے خط و خال کو پورا پورا قائم رکھتا ہے۔ اپنی طرف سے کوئی زائد رنگ بھر کر ان کی تصویر کو بہت زیادہ دلفریب بنانے کی کوشش نہیں کرتا۔

---

1. بہروپ ـــــ اصل میں بہروپ۔ بہت سے روپ۔ طرح طرح کے بھیس بدلنا (ش)
2. ٹھگ ـــــ ایک قوم جس کا پیشہ مسافروں کو زہر یا پھانسی دے کر مار ڈالنا اور طرح طرح سے چھلنا ہے۔ (ش)

نقص جتنے ہیں ان کو بھی نہایت ایمانداری سے تصویر میں دکھاتا ہے۔ وہ بدنیتی سے ان کے بدنما دکھانے کے لیے کوئی خراب تیور اُن میں اپنے جی سے پیدا نہیں کرتا۔ یہ صحوار نہ ایمانداری ڈرامانویس کے لیے گویا اعظم صفات ہیں۔

نظیر میں ہم متانت اور ظرافت دونوں بتا چکے ہیں۔ یہ دونوں صفتیں ایک خاص اعتدال کے ساتھ اس کے مزاج میں شریک ہوتی تھیں۔ نہ متانت ظرافت پر غالب آتی تھی، اور نہ ظرافت متانت کو دباتی تھی۔ گویا دونوں کا پلّہ برابری تھا۔ وہ اگر کوئی کلام سنجیدگی سے کرتا تھا تو نہ اس وجہ سے کہ ظرافت پر وہ قادر نہیں، بلکہ اس جہت سے کہ وہاں ظرافت کا موقع نہ ہوتا تھا اور اگر کسی کلام کو شوخیِ طبع کے رنگ میں رنگتا تھا تو اس لحاظ سے کہ اس کے ہاتھ سے متانت کی باگ جاتی رہی ہے، بلکہ اس نظر سے کہ وہ موقع ہی ظرافت کا ہے۔ کسی موقع پر وہ ظرافت اور متانت دونوں کو شیر و شکر بھی کر دیتا ہے اور یہ بھی صرف اس کا ایک فعلِ اختیاری ہے۔ دونوں وضع کلام پر اس قسم کا قابو بہت شاذ لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ــــ نظیر کو واقع میں ایک بہت بڑی دولت حاصل تھی۔ یہ وہ دولت ہے کہ اگر اس کے زمانے میں شیکسپیر کی طرزِ انشا پردازی کو رواج ہوتا تو اس کی بدولت ٹریجڈی (غم کا ناٹک)، اور کامیڈی (خوشی کا ناٹک)، دونوں میں پوری شہرت حاصل کر سکتا۔ اُس نے کسی قدر اپنی ڈرامانویسی کی قابلیت کا اُن دو قصوں میں جلوہ دکھایا ہے جو اس کے کُلیات کے اوّل اور آخر میں موجود ہیں۔ کُلیات کے آغاز ہی میں لیلیٰ مجنوں کا قصہ ہے۔ اس کا انجام ٹریجک (غمناک) ہے۔ بحر جس میں اس نے اس قصے کو نظم کیا ہے ایک خاص اثرِ غم رکھتی ہے۔ یہ بحر اب ان چند بحروں میں داخل ہے جن میں مرثیہ کہنے کا معمول ہو گیا ہے۔ حمد و نعت ہی سے دل پر ایک اداسی چھانے لگتی ہے اور آخیر قصہ تک پہنچتے پہنچتے ایک خاص رقتِ قلب میں پیدا ہوتی ہے، جس کو انسان کسی طرح روک نہیں سکتا۔ بیان میں لکھنؤ کے مرثیہ گو اساتذہ کی طرح رُلانے کا کوئی اہتمام نہیں پایا جاتا۔ سیدھی سیدھی بندشیں ہیں اور معمولی باتیں، لیکن نہیں معلوم کہ جس دل سے لکھا ہے کہ آدمی جوں جوں پڑھتا جاتا ہے اثرِ غم بڑھتا جاتا ہے۔ انہی سیدھی سادی بندشوں میں نہیں معلوم کہاں کے گُپتی نشتر چھپے ہوتے ہیں کہ آدمی کا دل بے قرار ہو جاتا ہے لیلیٰ مجنوں تو ٹریجڈی کی مثال ہوئی۔ اب کامیڈی کی مثال ملاحظہ فرمایئے۔ گو کم لوگ دیکھتے ہیں، مگر واقع میں دیکھنے ہی کی چیز ہے۔ مہادیو کا بیاہ کس خوبی سے لکھا ہے کہ سبحان اللہ۔ کُلیات میں کنہیا جی کی راس سب سے آخیر میں درج ہے۔ اس سے پہلے جو نظم ہے وہی مہادیو کا بیاہ ہے۔ تکلف اس نظم میں یہ ہے کہ چونکہ مہادیو کے بیاہ کا

مذکور ہے اور وہ ہندوؤں کا ایک دیوتا ہے، پوری نظم ہندوؤں کی زبان میں لکھی ہے۔ شروع سے آخیر تک زبان کی لطافتوں اور باریکیوں کو اس خوبی سے قائم رکھا ہے کہ آدمی کے منہ سے خواہ مخواہ واہ واہ نکل جاتا ہے۔ اس میں مختلف کیرکٹر (اشخاص) ہیں۔ ہماچل، ہماچل کی رانی، ہماچل کی بیٹی، قصے کی ہیروئن (مطلوبہ)، ہماچل کا پردھان یعنی وزیر، ہماچل کا پروہت، مہادیو، قصے کا ہیرو (طالب)، ان تمام اشخاص کے خیالات انہی کے خاص محاوروں میں نہایت عمدگی سے ظاہر کیے ہیں اور واقعی اسی نظم میں کسی قدر ڈرامے کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ کامیڈی کی قوت بڑھانے کو بعض خاص سین تفریح کے بھی دیتے ہیں۔ مثلاً باراتیوں کا بیان۔

پھر اور ہزاروں ساتھ چلے جو بھوت پری اور راچھس تھے
ڈیل اونچے ان کے بروج سمن اور سیس بھی اُن کے گُسّس تھے

ہر پگڑ ان کا سومن کا اور موٹے رسّو کے سنکے
اور پگڑوں میں طرّوں کی طرح تھے ساکھو بڑکے بررکھے

کوئی ننگے سر، وہ بال اس کے جوں بانس بڑے دس دس گز کے
کوئی منڈ، کوئی رنڈ اور کوئی بن پاؤں ناچے اُچھلے کودے

کوئی ہاتھی رکھتے کاندھے پر، کوئی اونٹ بغل میں دبکاتے
کوئی اَرنا بھینسا گود لیے، کوئی گینڈا سر پر بٹھلاتے

کوئی سانپ گلے میں لپٹاتے، پھن اُن کے دم بدم چومے
کچھ لنبے سونٹے لوہے کے، کچھ ہاتھ لیے بھاری لکڑے

کوئی گاوے پھاڑ گلا اپنا، کوئی نرت کرے چک پھیری لے
کوئی شور کرے خوش حالی سے یوں جیسے ہاتھی چنگھاڑے

کوئی ہاتھ نچا وے رہ رہ کر، کوئی نین خوشی سے مٹکاوے
کوئی لنبے لنبے ڈگ رکھے، کوئی دس دس گز کی جست کرے

کچھ رنگ عجیب، کچھ ڈھنگ نئے، سب ہنس ہنس دھج دکھلاتے تھے
تھے دھوم مچاتے رستے میں، ہر آن اچھلتے جاتے تھے

اس نظم کی بحر بھی ایسی دھوم دھام کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شعر میں بڑا شادیانہ بج رہا ہے۔ نظیر نے اپنی قدرتِ تصویر کشی کو بھی اس میں ختم کر دیا ہے۔ ہر سین کو اس خوبی

سے نقش کیا ہے کہ اصل سین سے مستغنی کر دیا ہے۔ جہاں باجوں کا ذکر چھڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے واقعی باجے بج رہے ہیں۔ جس جگہ آتش بازی میں آتش بیانی دکھائی ہے صاف نظر آتا ہے کہ انار چھوٹ رہے ہیں۔ ہاتھی گھوڑے بھڑک رہے ہیں۔ غرض جس سین کو لکھا ہے تصویر کھینچ دی ہے۔ اتنی قوت کے ساتھ اس نے بہت کم نظمیں لکھی ہیں۔ اس سے اس کی طبیعت کا اصلی زور ظاہر ہوتا ہے۔

یہ دو نمونے پوری طرح ثابت کرتے ہیں کہ اگر وہ ناٹک کے طور پر لکھتا تو یقیناً محزن اور عیش دونوں کی پوری پوری داد دیتا۔ پس پورے شیکسپیر ہونے کی صلاحیت اگر کسی میں تھی تو وہ میاں نظیر علیہ رحمتہ تھے۔

زبانِ اُردو کے ڈاکٹر جانسن منشی سید احمد دہلوی بھی نظیر کو شیکسپیر کا معزز خطاب دینے میں میرے ہم زبان ہیں۔ اُن سے میں نے کسی موقع پر نظیر کی نسبت خیالات دریافت کیے تھے تو انہوں نے یہ مختصر مفید مطلب عبارت لکھ بھیجی تھی۔

بعض دہلی کے تذکرۂ شعرا جمع کرنے والوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ ایک ملا مکتبی، صحتِ الفاظ سے معرّا، پُرگو اور عوام الناس کی بلکہ جہلا کی زبان لکھنے والا تھا۔ لیکن میری رائے میں وہ ہندوستان کا شیکسپیر اور فطرتی و قدرتی مضامین کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھنے والا تھا۔ اس نے ادنا ادنا اور رکیک مضمونوں کو اس خوبی سے باندھا اور عمدہ نتیجہ نکالا ہے کہ دوسرا نہیں نکال سکتا۔

مضامین کے اعتبار سے نظیر کے کلام کی قسمیں

میں نے مضامین کے اعتبار سے نظیر کے کلام کو غور سے دیکھا تو اُس کی چودہ قسمیں نظر آئیں۔ اور وہ امورِ ذیل سے متعلق ہیں۔

(1) تقریبات (2) موسم اور فصل
(3) مختلف مراتبِ زندگی (4) لوازماتِ تمدنی
(5) ایام و لیالی اور نور و ظہورِ قدرت (6) مشاغلِ تفریح
(7) عمارات

(8) استشیائے قدرتی

(9) نادر امثال اور مفید حکایات

(10) مذہب اور تصوف

(11) حُسن و عشق

(12) اخلاق اور انقلاب و فنائے جہاں سے جو اثر عبرت کا دل پر مترتب ہوتا ہے

(13) بعض قصص

(14) ہزل و ظرافت

اگر اس کو کلام کو دوسری نظر سے دیکھیں اور کسی صفت سے متصف کریں تو یہ قسمیں پیدا ہوتی ہیں۔

حکیمانہ، ناصحانہ، عارفانہ، عبرت مندانہ، صوفیانہ، عاشقانہ، عقیدت مندانہ، رندانہ، ظریفانہ وصافانہ، ہزلانہ، موحدانہ، شیعیانہ، واعظانہ، آزمودہ کارانہ، تجوانانہ، خوش طبعانہ، قلندرانہ، مصورانہ، ترجمانہ، معاملہ بندانہ، ہندوانہ، سیاس مندانہ،

(1) عارفانہ، عبرت مندانہ، صوفیانہ، عقیدت مندانہ، موحدانہ، واعظانہ، سیاس مندانہ، شیعیانہ — ان آٹھ قسموں کو ایک دوسرے سے علاقہ ہے۔ یہ سب ایک ہی دل سے لکھے گئے ہیں۔ وہ دل جس کا رُخ عقبیٰ کی طرف مُڑا ہوتا ہے۔

(2) آزمودہ کارانہ، ناصحانہ، حکیمانہ۔ یہ تینوں قسمیں بھی گویا ایک ہی دل سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں عقبیٰ کے خیالات کو بلا واسطہ مستقیم دخل نہیں دیا گیا۔ معاملاتِ دنیا کو جس طرح ایک حکیمانہ خیال آدمی دیکھ کر ان سے گہرے تجربے حاصل کر سکتا ہے اور نشیب و فراز زمانہ دیکھنے کے بعد آزمودہ کاری کے زینے سے جس طرح لوگوں کو خیر خواہانہ نصیحت کر سکتا ہے، اُسی قسم کے مضامین کو اس قسم میں داخل کیا گیا ہے۔

(3) رندانہ، قلندرانہ، خوش طبعانہ، ظریفانہ، ہزلانہ۔ یہ پانچ قسمیں ہمرنگ ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی قسم کے خیالات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب اُن کو کوئی مذہبی رنگ میں نہیں رنگا گیا تو رندانہ، ہیں۔ رندانہ کلام پر مذہبی رنگ چڑھا دیا گیا، قلندرانہ ہو گیا۔ عاشق نے وصل کی کامیابی میں خوش خوش اپنے خیالاتِ عشرت کسی قدر معمولی متانت کے احاطے سے نکل کر بیان کیے، وہ خوش طبعانہ ہو گئے۔ خوش طبعی کچھ زیادہ بڑھی پوری ظرافت ہو گئی ظرافت نے اور ہاتھ پاؤں نکالے ہزل ہو گئی۔

(4) وصافانہ، معاملہ بندانہ، مصورانہ۔ یہ تینوں قسمیں بھی آپس میں دست و بغل ہیں۔ کسی شے

کی صفت عمدہ طور سے بیان کی گئی، تو یہ وصافانہ ہوا۔ کسی واقعہ کو عمدہ طور سے قلم بند کیا گیا، تو یہ معاملہ بندانہ ہوا۔ اور کسی سمیں کو اس طرح بیان کیا کہ وہ سماں آنکھوں کے تلے پھر جائے، تو یہ مصوّرانہ ہے۔ وصافی اور معاملہ بندی کو مصوری گویا کمال ہے۔

(5) عاشقانہ، جُوانانہ۔ جوانانہ کلام عشق میں محدود نہیں تعلّی اور دُوت دات بھی اس کا حصّہ ہے۔ لیکن عاشقانہ کلام منحصر فی العشق ہے۔ ازبس کہ عشق نتیجہ جوانی ہے جُوانانہ اور عاشقانہ دونوں کلام میں ایک خاص تعلّق ہے۔

(6) مترجمانہ وہ کلام ہے جس میں فقط کسی مشہور قصے کو معمولی طور پر نظم کر دیا گیا ہو۔ ہرن اور گدھے کی دوستی کا قصہ اِس قسم میں داخل ہے۔

(7) ہندوانہ وہ مضامین ہیں جن میں ہندوؤں کے عقائد۔ ہندوؤں کی تقریبات، ہندوؤں کے قصص، ہندوؤں کے مختلف پیشواؤں کا ذکر اُس دل سے کیا گیا ہے جو ایک ہندو کے لیے شایاں ہے اور کسی قسم کا تعصب کہیں دکھایا نہیں گیا——

اس طور پر سات قسمیں نظیر کے کلام کی پیدا ہوتی ہیں۔ مُترجمانہ کلام بہت کم ہے۔ دو تین نظموں سے زیادہ نہیں—— لہٰذا اس کو ساقط کرنا چاہیے۔ پس اصل میں اُس کے کلام کی مستقل اور قابلِ اعتبار چھ ہی قسمیں ہیں۔

نظیر کے کلام نظم کی قسمیں

اس میں شک نہیں کہ نظیر ایک بڑا ہی متفنن شاعر تھا۔ جس صنفِ کلام کا ذکر کیجیے اس کے ہاں موجود، غزل، قصیدہ، مثنوی، رُباعی، مخمّس، مسدّس، مثمن، معشّر، قطعہ بند، ترکیب بند، ترجیع بند، واسوخت، بحرِ طویل، تضمین—— ان میں سے کون سا فن ہے جس میں وہ بند ہے——

حکیم باطن اپنے تذکرہ میں یوں لکھتے ہیں:۔

ہر گاہ عنصرِ لطیف سمت ترقیم نظم متوجہ ہوا اور صیاد فکر نے دام طبع کھایا، مرغانِ مضمون لامکاں پرواز اُڑنے سے باز آکر بخوشی صید ہوتے۔ (ایک ہلکا سا اشارہ نظیر کے ہنس نامے کی طرف ہے)، تو غزل، مستزاد، مثلث، مُربّع، مخمّس، مسدّس، مسبع مثمن، معشّر رُباعی قطعہ بند، ترکیب بند، ترجیع بند، تضمین، واسوخت، بحرِ طویل۔ وغیرہ ہر ایک کو متعدد تحریر فرمایا۔ یہ کچھ برائے گفتن و نوشتن نہیں۔ بلکہ فی الواقع بلا تصنع اور

اُس میں کُل صنعتیں شاعری کی ختم کیں۔

غزل ـــــ نظیر کی غزلوں سے کون واقف نہیں۔ غزلیات کا دیوان ہی موجود ہے۔ اکثر غزلیں گائی بھی جاتی ہیں باطن نے اپنے تذکرے میں غزلوں سے جو اشعار انتخاب کیے ہیں تو ان میں اس بات کا خاص التزام کیا ہے کہ اکثر ردیف کے اشعار ہوں تاکہ یہ معلوم ہو کہ دیوان اس کا ردیف وار مرتب ہے۔ وہ ردیفیں جن کے اشعار نہیں ہیں، یہ ہیں۔

ردیف ٹ، ردیف ث، ردیف ڑ، ردیف غ، ردیف ف، ردیف ق، ردیف ک، ردیف گ اور علاوہ ان کے ہائے مخلوط کے ساتھ جو ردیفیں ہیں جن میں غالباً کم شعرا طبع آزمائی کرتے ہیں۔

ان متروک ردیفوں میں سے ردیف ڑ کے غزل کُلیات مروجہ میں موجود ہے۔ پس ترک دلیل اس بات کی نہیں ہو سکتی کہ ان ردیفوں میں اُس کی غزلیں ہی نہ ہوں ـــــ

قصیدہ ـــــ قصیدے کا ذکر حکیم باطن نہیں کرتے۔ شاید بالاستقلال کوئی بڑا مجموعہ ان کے ہاں قصائد کا نہ ہو۔ لیکن خود باطن نے اپنے تذکرے میں جس قدر کلام نظیر کا دیا ہے اُس میں سے بعض صاف قصیدہ ہے، وہی شوکت الفاظ، وہی تسلسل، شاید قلتِ اشعار سے ان کو داخل غزل کیا ہے۔ لیکن یہ قلت اشعار کی بس ایک قصیدہ میں ہے۔ دوسرے قصیدے میں وہ بھی نہیں۔ تو وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ قصائد دیوانِ غزلیات سے لیے ہیں اسی لیے ان پر اطلاق قصیدے کا نہیں کیا۔ میں ان قصائد کو اپنے موقع پر بصیرت ناظرین کے لیے نقل کر دوں گا۔

مثنوی ـــــ مثنوی کا بھی باطن کوئی ذکر نہیں کرتے، لیکن آخر وغیرہ کس دن کے لیے ہے۔ میں نے پہلے پہل تذکرۂ باطن ہی میں اُس کی مثنوی دیکھی۔ اس میں نہایت عمدہ تمہید سے کشتی، دریا، شیرینیِ آب، خنکیِ آب، موج، حباب، گرداب، ماہی، صدف، ریگ اور ساحل کی تعریف کی گئی ہے۔ اس مثنوی کو بھی اپنے موقع پر میں پیش کش کر دوں گا۔

رُباعی ـــــ رُباعی اُردو کی کوئی میری نظر سے نہیں گذری۔ کلیات میں کوئی رُباعی نہیں ہے۔ باطن نے بھی گو فہرست میں ذکر کیا ہے لیکن کوئی مثال پیش نہیں کی۔ اُردو میں جب نہیں ہے تو فارسی ذخیرے میں ڈھونڈھنا چاہیے۔ اُس میں چند رُباعیاں نہایت دلچسپ موجود ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رُباعیوں سے بھی اُس کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔ اکثر مضمون آفرینی کی راہ میں مجدّدانہ قدم مارے ہیں۔

مُربّع کی مثالیں مجھ کو نہ فارسی میں ملیں نہ اُردو میں۔ شاید باطن نے کہیں دیکھی ہوں کلیاتؔ کی فہرست میں اُس نظم کو مُربّع لکھا ہے جس کی ترجیع کا بند یہ ہے ؎

ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دل بر کو ہر اک رنگ میں پہچان

میرے خیال میں یہ ترجیع بند معشّر ہے۔ مخمّس اور مسدّس کو نظیرؔ کے نام کے ساتھ وہ نسبت ہے جو رُباعی کو عمر خیامؔ کے ساتھ، غزل کو سعدیؔ کے ساتھ، قصیدے کو خاقانیؔ کے ساتھ، مثنوی کو فردوسیؔ کے ساتھ، قطعہ کو ابن یمیںؔ کے ساتھ۔ مخمّس جتنے کلیات میں ہیں، وہ نول کشوری میں تو (98) ہیں اور مطبع احمدی والے میں پورے (100)۔ جوگی نامہ جوگی نامہ جنگ نامہ وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ مُسدّس نول کشوری کلیات میں کوئی (67) ہیں اور مطبع احمدی والے میں کوئی (72)

مسبّع بھی میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ باطن لکھتے ہیں تو شاید کوئی ہوگا۔ مثمّن (3) سے زیادہ نہیں۔ دو ترجیع بند ہیں اور ایک ترکیب بند۔

(1) چاندنی صحن چمن میں واہ وا اور کھلی تھی چاندنی ترجیع بند ——
(2) برسات رات لگی تھی واہ وا کیا ہی بہار کی جھڑی۔ ترجیع بند ——
(3) واسوخت۔ اے گل تازہ کہ بوے زوفا نیست ترا —— ترکیب بند مُعشّر بھی گنتی ہی کے ہیں۔

(1) ایک تو لیلیٰ مجنوں۔ اس کو ترکیب بند میں بھی شمار کر سکتے ہیں۔
(2) دوسرے عالم بہار۔ شب کو چمن میں واہ وا کیا ہی بہار تھی مچی۔ یہ ترجیع بند ہیں۔
(3) تیسرے تضمین فارسی ـ نظر آیا مجھے اک شوخ ایسا نازنین چنچل۔ اس میں استادوں کے دوہرے اور اشعار تضمین کیے ہیں۔ اس لیے بہ خاص تضمین کی مثال میں پیش کرنے کے قابل ہے۔
(4) چوتھے وہ ترکیب بند۔ مجھے اے دوست تیرا ہجر اب ایسا ستاتا ہے۔ اس ترکیب بند میں بھی دوہرے ہیں۔
(5) پانچویں ہر کی تعریف۔ میں کیا وصف کہوں یا رو اس شام برن اوتارے کی۔
(6) چھٹے بلدیو جی کا میلہ۔ کیا وہ دل بر کوئی نویلا ہے۔ یہ ترجیع بند ہے۔

دو ترکیب بند مُعشّر سے زیادہ ہیں۔ ایک میں تو ہر بند میں بارہ مصرعے ہیں۔ اثنا عشری کہہ لیجیے۔ اور دوسرے میں سولہ مصرعے، ششہ عشری جس میں بارہ مصرعے ہیں وہ یوں شروع ہوتا ہے۔ ادھر کو جس گھڑی اے ہمنشیں وہ یار آیا۔ جس میں سولہ مصرعے ہیں۔ اس کو عرف میں مہادیو کا بیاہ کہتے ہیں۔

واسوخت دو ہیں۔ لیکن ایک تو وحشّی کا ہے جو نہیں معلوم کیوں درج دیوان ہوگیا ہے اور دوسرا خاص میاں نظیر کا ہے۔ یہ واسوخت آٹھ مصرعوں کا ہے۔ مثمن سوداؔ کے یہاں بھی آٹھ ہی مصرعوں کا واسوخت ہے۔ یہ واسوخت فارسی میں ہے۔ اردو کا واسوخت کوئی میری نظر سے نہیں گزرا۔ وحشّی کا واسوخت شاید اس لیے لکھ دیا گیا ہے کہ بالمقابلہ دونوں کا لطف پوری طرح حاصل ہو کہ کون واسوخت کس پائے کا ہے۔ نظیرؔ نے وحشّی ہی کے واسوخت کا جواب لکھا ہے۔ دونوں تلے اوپر کلیات میں مندرج ہیں۔ مستزاد مثلث بھی صرف ایک ہی ہے۔ شعر تو اس میں یہ کہے ہیں۔

سُدھ لے گئی بالے کی جھمک صبر کرن پھول اور عقل کو بندے
بالے کی گئی جھوک لگا سینے میں اک ہول، دل لے گئے جھمکے
اور جی کے تئیں لے گئی زنجیر طلائی۔ زنجیر پہنا کر
کاجل کی کٹھپاوٹ نے کیا دل پہ یہ طوفاں۔ جو ہوش اُڑایا
مستی کی دھڑی نے وہ کیا ظلم نمایاں، جو غش پہ غش آیا
ہاتھوں نے بھی اک آگ سی سینے میں لگائی۔ مہندی کو دکھا کر

ایجاد کی طرف نظیرؔ کو اکثر جدّت پسندی لے جاتی تھی اور اس کی ایجادیں ایسی ہوتی تھیں کہ مقبولیت کے محکمے میں فوراً ان کی رجسٹری بھی ہو جاتی تھی۔

مستزاد میں پہلی ایجاد تو اس نے یہ کی کہ دو مصرعے کی جگہ تین مصرعے کیے۔ یعنی شعر سے گزر کر مثلث اس فن میں تصنیف کیے۔ دوسری ایجاد یہ کی فقرۂ مستزاد ایک سے دو کر دیے۔ مثلث کی مثال تو لکھی جا چکی ہے۔ مستزاد مکرّر کی مثال ملاحظہ ہو۔

یوں ہجر میں روتا ہوں میں اس گل کے شب و روز۔ کر نالہ و فریاد جیسے کہ کسی وقت
یوسف کے لیے روتی تھیں یعقوب کی آنکھیں۔ ہر شام و سحر کو۔ خوناب میں بھر بھر

خط میں نے جو بھیجا اُسے باحسرت دیدار۔ لکھ خون جگر سے۔ اور داغ کی کر مُہر
تکتی رہیں جاکر مرے مکتوب کی آنکھیں۔ اُس رشک قمر کو حیرت سے سراسر

شاعر کے کلام کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد یا خود اس کے زمانے میں اس کی نکالی ہوئی طرح یا طرز کو اساتذۂ وقت اپنی طبع آزمائی کا شرف بخشیں۔ نظیر کی اس ایجاد کی ہوئی طرز پر بعد اس کے انشاء اللہ جیسے ذہین نے بھی طبع آزمائی کی اور اُس نے دو سے ترقی کر کے پانچ پانچ مستزاد فقرے لکھے۔ دوہرے فقرے کے مستزاد کا نام مستزاد در مستزاد رکھا ہے اور پانچ فقروں کا مستزاد کا نام مستزاد خُماسی۔

مستزاد در مستزاد

نسبت وہ جو آرام سے ہے ہاتھ کو سوکیا۔ کچھ سوچ کے بنلا۔ ہے اس میں کلائی
نوبت کو ترے نام سے ہے میل یہ کیسا مت کر تو اچنبھا۔ کہہ دے اری باجی
تاب میں تیرا کرے دن رات جو چیڑیا۔ کیا ہے وہ بھلاجی۔ بوجھو تو پہیلی
ہر شخص اُسے دیکھ کے نہوڑا دے سر اپنا۔ یہ چال انوکھی۔ ہے قبلہ نما کی

مستزاد خُماسی

میں پھاند کے کل رات جو دیوار نہ جاتی۔ کنڈی نہ ہلاتی۔ جاکر نہ جگاتی۔ نیند اس کو نہ آتی
جوبن کی وہ ماتی۔ تیوری نہ ہلاتی
اور چٹکیوں میں میرے تئیں صبح اڑاتی۔ ہاتھوں پہ نچاتی۔ گاتی نہ بجاتی۔ کھانے کو نہ کھاتی
پھر تو نہ بلاتی۔ سو سو ہلے گاتی

بحر طویل میں بھی اس نے خاصی طرح طبیعت آزمائی کی ہے۔ بحر طویل کا ایک اُردو شعر باطن نے لکھا ہے۔ دو شعر مجھ کو فارسی کے بھی مل گئے ہیں۔ اپنے موقع پر نقل ہوں گے۔

قطعہ بند ——— قطعہ بند غزلوں میں داخل ہیں۔ سوداؔ اور میرؔ کے زمانے میں یہ ایک خاص فن قرار پا گیا تھا۔ غزل کی یکسانی سے اکثر طبیعتیں مشاعروں میں ملول ہو جاتی تھیں۔ اس ملامت کے رفع کرنے کے لیے یہ ایک اچھا نسخہ تھا کہ اخیر میں کسی خاص مضمون کو مسلسل طور پر بیان کیا جاتا تھا۔ جس کی فیہ آخیر شعر میں بڑے زور اور لطف کے ساتھ کھلتی تھی اور زحمت انتظار کا شوق کو پورا پورا صلہ مل جاتا تھا۔ اس طرز کو اس قدر مقبولیت ہوئی کہ مشاعرے کی غزلوں میں اکثر قطعہ بند سے لوگ مشاعرہ مار لینے کی کوشش کرتے۔ نظیر گو اُن لوگوں میں نہ تھا کہ مشاعرے

میں جاکر زور آزمائی کرکے حریف کو داؤ پیچ سے چت کرنے کی کوشش کرے لیکن پھر بھی قطعہ بند کی لطافت سے وہ بے خبر نہ تھا۔ اُس کو غزل کی شاخ میں یہ ایک اچھا پھول معلوم دیا۔ جب کبھی موقع ملتا وہ اپنے مشام فکر کو اس کی خوشبو سے معطّر کر لیتا۔ مضامین چونکہ اس کے دل میں بہت ابلتے تھے، قطعہ لکھنا اس کے لیے ایک طبیعی بات تھی۔۔۔ اکثر غزل میں اس کے خیالات اِس تسلسل سے آنے لگتے ہیں کہ وہ غزل۔غزل باقی ہی نہیں رہتی، خود بخود قطعہ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ ایک طرح کی تجدید تھی جس کو اس کی استادانہ کوششوں سے مقبولیت خاص کا شرف حاصل ہوا۔ انشاؔ نے اِس باب میں نظیرؔ ہی کی تقلید کی ہے۔

اور جو عشق کا گلزار کھلاتا ہے نظیرؔ
پنج تن پاک کا دنیا میں کہاتا ہے نظیرؔ
ریختہ۔ فرد۔ رُباعی بھی بناتا ہے نظیرؔ
کہہ سخن عشق کا پھر سب کو سُناتا ہے نظیرؔ
اُس کے سب حرف و حکایت سے کہو عشق اللہ

نظیرؔ کی تصانیف

نظیرؔ کا دماغ بہت قوی تھا۔ اس کی نظر نہایت تیز تھی اس کے خیالات میں بڑی وسعت تھی۔ اس کے تجربے اس قدر گہرے ہیں کہ ان کی تھاہ نہیں ملتی۔ مشق سخن اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ دیکھتے ہیں، وہ قلم ہاتھ میں اُٹھاتا ہے، زمین طرح کرتا ہے اور پھر لکھ چلتا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ تصنیف کرتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کاغذ سے دیکھ دیکھ کر نقل کر رہا ہے یا اشعار یاد ہیں ان کو قلم بند کرتا جاتا ہے۔ زمانے نے بھی اس کو کسی قدر فراغت دے رکھی تھی۔ اُس پر عمر بھی لمبی خاصی، اسّی اور نو نواسی۔ اتنے سروسامان کے بعد یہ سمجھنا کہ اس نے صرف وہی ایک کلیات لکھا ہوگا جو متداول ہے جس میں تخمیناً چھ سات ہزار شعر ہیں جس کا حجم بارہ جزو سے زیادہ نہیں، نہایت ہی غلطی ہے۔ نظیرؔ شاعر نہ تھا۔ واقعی ایک کل تھا جس میں دن رات شعر ڈھلا کرتے تھے۔ وہ بات بات پر ایک دلچسپ نظم لکھ دیتا تھا۔ کہیں سے لڑکے آتے، ہاتھ میں بیا لیے ہوتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ایک مضمون پھڑکا۔ باتوں ہی باتوں میں دس پندرہ بند ہو گئے۔ لڑکے یاد کر کے تمام شہر میں پڑھتے پھرتے ہیں۔ گرمیوں کی فصل ہے۔ نئی نئی پتلی پتلی ککڑیاں نکلی ہیں۔ صورت سے، لذت سے، تازگی سے، طراوت سے، آنکھوں کو دلوں کو خنکی

اور ٹھنڈک بخشتی ہیں۔ نظر پڑنا شرط ہے۔ پھر کیا کیا مصرعوں کی قاشیں ترشتی ہیں اور کس کس طرح شوق کی تشنگی کو بجھاتی ہیں۔ تربوز، جمالیاں بھی اس کے خیالی چاقو سے بچ نہیں سکتیں۔ کورے برتن میں پانی کی بوند کھنکی اور اس کے خیال میں مضمون کا ایک دریا امنڈ آیا۔

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی!

مکھیاں بھنبھناتیں اور اس کے قلم نے کاغذ کی زمین دیکھی[1] — برسات آتی سبزہ لہلانے لگا مور جھنکارنے لگے۔ بگلوں کی قطاریں ابر میں اڑتی دکھائی دیں۔ مینڈکوں نے شور مچایا۔ گھٹا امڈ رہی ہے پھواریں پڑ رہی ہیں۔ جھولے پڑے ہوئے ہیں پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ ہمارا فقیر بھی کسی گوشے میں کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا ہے۔ مضامین گھٹا کی طرح آتے۔ قلم پر برسات کے پرنالے کی پھبتی صادق آتی ہے۔ بقول امیر خسرو

ساون بھادوں بہت چلت ہیں اور دتن ماں تھوری۔ برس کر کھل گیا ہے۔ حبس[2] نے ہوا کو قید رکھا ہے۔ ایک پتے کو جنبش نہیں۔ مچھر اور پسوؤں کی فوج چاروں طرف سے ٹوٹ پڑی ہے۔ کھٹملوں نے دھاوا بول دیا ہے۔ انھاروں پسینہ چلا آتا ہے۔ جدھر دیکھئے پنکھے چل رہے ہیں مگر کسی طرح قرار نہیں۔ خلقت بولا اٹھی ہے۔ اس عام بلا میں نظیر بھی گرفتار ہیں لیکن یہ بلا کہیں طبیعت کی روانی کو روک سکتی ہے؟۔ کاغذ پر قلم ہے کہ چل رہا ہے۔ بند پہ بند قلم بند ہو رہے ہیں۔

برسات رخصت ہو رہی ہے۔ جاڑے کا پیش خیمہ آگیا ہے۔ دن عمر عاشق کی طرح گھٹنے لگا ہے۔ راتیں زلف شب گوں کی طرح بڑھ رہی ہیں۔ گلابی جاڑا اپنا رنگ جما رہا ہے۔ ہوا کی خنکی معشوق کی سرد مہری سے زیادہ لطف دے رہی ہے۔ جس قدر سردی بڑھتی جاتی ہے، بزم عیش و نشاط گرم

---

[1] زمین دیکھنا۔ استفراغ کرنا، قے کرنا

کثیف — چاند ہے دیکھو نہ آسماں کی طرف
مجھے یہ ڈر ہے مبادا کہیں زمین دیکھو (ناسخ)
بیمارِ غم جو اس کا کھا کر زمین دیکھے
خوش خوش وہ مقبروں کی جا کر زمین دیکھے (ذوق)

[2] حبس۔ امس۔ (ش)

ہو رہی ہے۔ اُمرا اور پیٹ بھرے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ غُربا سردی کی شدّت کا تصور کر کے ابھی سے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ نظیرؔ کو تو قدرت کی طرف سے عام پروانگی ملی ہوئی ہے۔ کیا محل کیا جھونپڑا ہر جگہ اُن کی آؤ بھگت ہے۔ جہاں بیٹھے وہیں ایک قُفلی نازک خیالی کی جما دی۔ غرض گرمی ہو، جاڑا ہو برسات ہو — کوئی زمانہ ہو کسی طرح کی واردات ہو، اِن کے خیال کو فرصت نہیں۔ یہ ایک کل ہے کہ دن رات چل رہی ہے۔ اتنی بڑی کل اور یوں دن رات چلے اور صرف چھ ساڑھے چھ ہزار شعر ڈھلیں؟ یہ کوئی قرینِ عقل بات نہیں۔ مجھ کو معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ نظیرؔ کو جس قدر لکھنے کا شوق تھا اس قدر اپنے کلام کے جمع کرنے کا اہتمام نہیں تھا۔ وہ زیادہ تر بہ تکلیفِ وقت لکھتا تھا۔ کوئی تقریب پیش آئی۔ دل میں خیال پیدا ہوا لکھا اور پھینک دیا۔ دوست یا شاگرد اُٹھا کر لے گئے۔ تبرک کچھ کر بیاض میں نقل کیا۔ غرض نظیرؔ کے ان خوشہ چینوں میں مائی تھان کے کھتریوں کا نمبر سب سے اوّل ہے۔ کلیات جو متداول ہے انہی کے ہاں کی بیاض سے منقول ہے۔ نظیرؔ کے زمانے میں کوئی ہندو رئیس تھا۔ بلاس رائے اس کا نام تھا۔ اس کے چھ بیٹے تھے ہر بخش رائے، گوربخش رائے، مول چند رائے، تن سکھ رائے اور دو اور جن کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ ازبس کہ تعلیم کے باب میں بلاس رائے کے خیالات روشن تھے۔ اُس نے ان کی تعلیم کے لیے نظیرؔ جیسا مستعد اور طبّاع اُستاد مقرر کیا۔ ہندو تو اپنے اُستاد کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اس خاندان میں نظیرؔ کی بڑی قدر تھی۔ تنخواہ بھی کچھ کم نہ تھی۔ ستّر روپے ماہانہ ملتے تھے۔ نظیرؔ کے خیالاتِ درویشانہ نے اُن کی تعظیم و تکریم کے خیالات میں اور ترقی بخشی تھی۔ وہ لوگ اس کو درویش کامل کی طرح مانتے تھے۔ اور دین و دنیا دونوں کی سعادت اس کی خوشنودی میں منحصر جانتے تھے۔ سعادت مند شاگردوں نے بزرگ استاد کے کلام کو بڑے شوق سے جمع کیا۔ نصیحت، حکمت، درویشی، ظرافت، عقیدت کوئی رنگ ہو، کوئی ڈھنگ ہو نظیرؔ کا کلام ہونا چاہیے۔ بیاض میں نقل ہونا اس کا ضرور۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جس قدر کلام نظیرؔ کا تھا وہ سب ان لوگوں نے فراہم کر لیا۔ غزلیں جو کلیاتؔ میں درج ہیں، چالیس سے زائد نہیں، وہ بھی غیر مرتّب۔ حال آنکہ میرزا نوازش علی بیگ کے بیان سے معلوم ہوا کہ ان کا ایک پورا دیوان ہے جو ردیف وار مرتّب ہے۔ باطنؔ نے اشعار منتخب کیے ہیں۔ اُن سے بھی مستنبط ہوتا ہے کہ ہر ردیف میں ان کی غزلیں ہیں۔ میرزا نوازش علی بیگ نے تو یہ بھی کہا کہ فقط اُردو ہی کا دیوان نہیں ایک دیوان ان کا فارسی میں بھی ہے۔ میں نے ان سے طلب کیا تو انھوں نے فرمایا کہ دونوں دیوان ایک میرے عزیز گوالیار لے گئے ہیں، وہاں سے منگوا کر حاضر کروں گا۔ نہیں معلوم کیا سبب آج تک انھوں نے وعدہ وفا نہیں

کیا۔ شاید ان کے وہ گوالیاری عزیز دبا بیٹھے۔

(میرزا نوازش علی بیگ کے آخیر خط مورخہ 3 اپریل 1893 کی عبارت دیوان کے متعلق یہ ہے۔

"دیوان مرحوم مغفور کے معاملات سخت مشکل ہیں۔ میں تو ایک متوسلان سے ہوں۔ دور کا ناطہ رشتہ ہے۔ گو کیسا ہی قریب کیوں نہ ہو مگر ان کے نواسے کنوا سے زیادہ مستحق ہیں۔ اتفاق سے ان کا گذر مجھ تک ہوا۔ گوالیار سے تشریف لائے۔ بہت قیل و قال بابت دیوان کے رہی، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر غریب خانہ پر رہ کر وعدہ امروز و فردا کی کرتے رہے۔ آخیر وہ یہاں سے تشریف لے گئے۔ نہ خط و کتابت ہے۔ یہ تو کیفیت مختصر اً عرض کی، مگر تدبیر ملنے دیوان کی گذارش کرتا ہوں کہ وہ حضرات عہدوں پر ہیں۔ یعنی میر بشارت علی صاحب نائب کوتوال شہر دھول پور ریاست میں ہیں۔ دو بھائی امجد علی صاحب وغیرہ چھاؤنی مُرار گوالیار میں ——— پتہ ان کا عقب شفا خانہ سرکاری متصل پولیس کا مکان ہے آپ ان صاحبان سے یہ لکھ کر کہ آپ لوگ خویش اور قریب میاں نظیر کے ہیں۔ آپ کے پاس دیوان میاں نظیر سنا جاتا ہے۔ نقل یا اصل جیسی ہو مجھ کو بھیج دیجیے۔ کیا عجب ہے کہ بھیج دیں۔ ———"

اس خط کے بعد حسب ہدایت میں نے سلسلہ جنبانی کی مگر کامیابی نہ ہوئی)

کلیات کو چھوڑ کر اور بھی بعض تصانیف نظیر کی میری نظر سے گزری ہیں۔ جوگی نامہ اور جوگن نامہ کلیات میں نہیں ہے۔ جوگی نامہ کے انتالیس بند ہیں اور جوگن نامہ کے چھیالیس بند، یہ دونوں مخمس۔ روٹی نامہ، بنجارہ نامہ، کوڑی نامہ، پیسے نامہ، آٹا دال نامہ، گرہ بند نظیر (مکافات نامہ)، ہنس نامہ کے ساتھ 1276ھ میں مطبع نظامی میں چھپے تھے۔ مخمس کے سوا کل نظمیں کلیات میں موجود ہیں ———

کلیات ابتدا میں مطبع آلہی واقعہ کنبوہ دروازہ میں چھپا تھا۔ پھر بار ثانی 1282ھ میں مطبع احمدی واقع چارسو دروازہ میں چھپا۔ ان دونوں چھاپوں میں بعض فحش بند اور بعض فحش نظمیں بھی تھیں جن کو منشی نول کشور نے اپنے ہاں کے ایڈیشن سے موجودہ نفاست پسندی اور قانونی مصلحت سے خارج کر دیا۔

نظیر نے کریما کی پوری تضمین کی ہے اور یہ تضمین چھپ گئی ہے۔ ہر جگہ ملتی ہے۔ کریما کی تضمین کارستہ معلّی نے دکھایا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب سے اس کو بہت زیادہ تعلق رہتا تھا۔ ایک

دن بیٹھے بیٹھے دل میں آگئی کہ لاؤ اس کی تضمین کر ڈالوں۔ مذاق تو متفق تھا ہی، تھوڑے ہی دنوں میں پوری ہوگئی۔ اس میں کا ایک شعر دل سے نہیں بھولتا جو واقعی ضرب المثل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور ضرب المثل ہے بھی ؎

سپیدی نے ڈالا سیاہی کو دھو
گئی پر نہ تجھ سے لڑکپن کی بو

بو نظیرؔ کی زبان پر بواو مجہول ہے۔ قدیم میں لوگ اسی طرح بولتے تھے۔

میری رائے میں اردو کے شعراء میں آج تک نظیرؔ سے بہتر کسی نے تضمین نہیں کی۔ گویا نظیرؔ تضمین کا بادشاہ ہے باطنؔ اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ حافظؔ کے دیوان کے دیوان کی تضمین کر ڈالی ہے گنتی کی غزلیں تضمین سے رہ گئی ہوں گی چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"دیوانِ حافظؔ کی چند غزلیں زیور خمسہ سے معرّا ہیں۔ باقی سب جواہر فکر سے مرصع ہوئیں، اگر حافظؔ کے کلیم چھ ہزار شعر ہوں تو ہر شعر پر ان کے تین مصرعے ——— چھ ڈیوڑھے نو ہزار شعر میاں نظیرؔ کے ہوتے ہیں۔ کچھ غزلیں اگر چھوٹ گئی ہیں تو ہزار شعر چھوڑ دیجئے۔ آٹھ ہزار میں تو کوئی کلام نہیں۔

مخمسوں کا یہ دیوان میں نے نہیں دیکھا۔ کلیات میں جس طرح خسروؔ، سعدیؔ کی غزلوں کی تضمین ہے۔ دو چار غزلیں حافظؔ کی بھی تضمین کی ہوئی ہیں۔ جن غزلوں کی تضمین کلیات میں ہے ان کے مطلع یہ ہیں۔

سحر گاہانہ مخمورِ شبانہ
گرفتم بادہ باچنگ و چغانہ
دوش رفتم بہ در میکدہ خواب آلودہ
خرقہ تر دامن و سجادہ شراب آلودہ
ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما
مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
ساقیا برخیز و دَر دہ جام را
خاک بر سر کُن غم ایام را
صوفی بیا کہ آئینہ صاف است جام را
تا بنگری صفائے مے لعل فام را

حافظ انور خاں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، فرماتے تھے کہ ایک روز میں ایک پنساری کی دکان پر کھڑا تھا۔ میاں نظیر کے ایک شاگرد بھی اس دکان پر سودا لے رہے تھے۔ وہیں پر انہوں نے باتوں ہی باتوں میں بیان کیا کہ نظیر کا کلام جو یہ چھپا ہے یہ تو بہت ہی مختصر ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ ایک میرے پاس جس قدر کلام ان کا ہے کوئی ڈیڑھ لاکھ شعر کے قریب ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کسی قدر تخمین کی غلطی ہو۔ لیکن اس سے یہ بات تو صاف ظاہر ہوتی ہے کہ نظیر بہت ہی پُرگو شخص تھا — آٹھ ہزار تضمین کے شعر، سات ہزار کلیات کے، پندرہ ہزار تو یہ بھی ہوتے ہیں۔ چھ سات ہزار شعر دیوان میں بھی ہوں گے۔ ایک فقیر نظیر کی نظم کی ہوئی خیبر کی لڑائی پڑھتا تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا بلکہ قصد کیا کہ لکھ بھی لوں۔ لیکن فقیر بعض خام خیالی کے سبب لکھوانے پر راضی نہ ہوا۔ یہ نظم بھی کہیں چھپی نہیں اور بہت سی نظمیں فقیروں کی زبان پر ہیں۔ جن کو چھاپے کا فائدہ ہنوز نہیں پہنچا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظیر اکثر نظمیں لوگوں کی فرمائش سے بھی لکھا کرتا تھا اور چونکہ طبیعت دریا تے موّاج تھی، اس کو اپنے کلام کی چنداں پروانہ ہوتی تھی۔ لکھا اور صاحب فرمائش کے حوالہ کیا۔ اس طرح بہت سی نظموں کی نقل خود اس کے پاس بھی نہ رہی۔ ان دنوں چھاپہ خانہ تو تھا نہیں بڑا چھاپہ خانہ یہ تھا کہ گانے کی غزلیں ارباب نشاط کی زبانوں پر ہوں۔ شہروں شہروں رنڈیاں گاتی پھریں اور ان کو شہرت ہو عارفانہ کلام فقیروں کی پُر اثر صدا بن کر در قبول پہ دستک دے۔ رندانہ کلام بھٹیوں اور بھنگڑ خانوں میں اپنے اثر سے یاروں کو مست کرے۔ جہاں کوئی کلام کسی مذاق کا نظیر کے قلم سے نکلتا تھا، وہ اس کی اشاعت کے لیے بے چین ہوتا تھا۔ اس کو اس کی چنداں پروانہ تھی کہ اس کی کوئی نقل اس کے پاس موجود رہے۔ اور کلیات کے حجم کو بڑھائے۔ وہ شہرت کے چھاپے خانے میں اپنا کلام فوراً چھپوا لیتا تھا۔ پھر دیکھتا تھا کہ ہر دل میں اسی کا نقش ہے اور ہر زبان کو اسی کا درد۔ افسوس نسیان کے جھونکے نے بہتیرے اوراق اڑا دیئے۔ قلم کے کانٹوں سے الجھ کر جو رہ گئے ہیں وہی تو ہیں باقی سب برباد — یہ بچے کھچے بھی کوئی اکیس بائیس ہزار ہیں۔

نظم کے علاوہ نثر بھی نظیر نے لکھی ہے لیکن ان دنوں اُردو نثر کا رواج نہ تھا۔ لوگ نثر لکھتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور مختلف خیال ان کے دل میں پیدا ہوتے تھے — نظیر نے بھی اپنی خیالات سے اُردو میں طبیعت آزمائی نہیں کی۔ نثاری کے اکھاڑے میں ایرانی پینترے کیے ہیں۔ باطن کا تو بیان ہے کہ نو نثریں انہوں نے لکھیں مگر میری نظر صرف پانچ سے روشن ہوئی۔ باطن کی عبارت یہ ہے۔

"جس وقت مزاج عالی تحریرِ نثر پر ملتفت ہوا مضمون انشا تے ہاتے نرمی گزیں قدر میلتن
فہم قرین، بزم عیش، رعنا زیبا، حسن بازار، طرز تقریر وغیرہ نوحد دشاہیں نوزن
زیب بازو تے شاہد مدعا ہو کر دست بستہ آن پہنچا" گنوائیں گو نو ہیں، مگر نام ان کے ہاں بھی سات ہی
کے ہیں ـــ ان سات میں نرمی گزین اور رعنا زیبا تو میرے پاس نہیں۔ باقی سب ہیں۔ یہ نثر میں
چھپی نہیں ـــ میرزا نوازش علی بیگ کی نوازش سے مجھ کو قلمی نسخہ ہاتھ آیا۔ ان کا بیان تھا کہ خود میاں
نظیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ورق تھے۔ کتابت میں وضاحت، خط خوش خط نستعلیق۔
میرے پاس اس نسخے کی نقل ہے۔ ہر چند یہ امر مسلّم ہے کہ میاں نظیر اچھے خوشنویس تھے چنانچہ شاہ محمد
اکبر ابوالعلائی داناپوری نے بھی اپنے بیان سے اس کی شہادت دی۔ لیکن اس میں مجھ کو کلام ہے کہ یہ
نثریں ان ہی کی کتابت سے ہیں۔ اس لیے کہ ان میں بعض ایسی غلطیاں نقل کی ہیں جو سوا کاتب کو
ان کے مصنف سے ہو ہی نہیں سکتیں۔ مثلاً تصحیف جو مکتی نویسی کا دوسرا نام ہے۔ مصنف ـــ خود
تصحیف کی غلطی نہیں کر سکتا ـــ بعض نثروں کی تصحیح شاید خود مصنف نے کی ہے اور حاشیہ پر غالباً
ان ہی کا خط ہے۔ وہ خط بھی بُرا نہیں، بلکہ خوش خط ہے۔ بعض نثریں، ایسی بھی ہیں جن کی تصحیح
نہیں ہوئی۔ ان میں اکثر نہایت فاش غلطیاں نظر آتی ہیں جو مصنف کے قلم سے ناممکن ہیں۔

باب 5

نظیر کی شاعری پر عام رائے

(۱) نظیر کا مفہومِ فطرت :-

نظیر فطرت کو آبادی سے الگ خیال نہیں کرتا۔ اس کی نگاہ میں فطرت صنعت سے ملی جلی نظر آتی ہے۔ فطرت جو اس کے خیال میں ہے وہ سراسر تمدنی ہے۔ فطرت جو سوسائٹی سے الگ ہے اس کی وہ چنداں پروا نہیں کرتا۔ سوسائٹی میں کبھی فطرت گل و جل نہیں، نہ جزو غالب بلکہ وہ ایک خوش نما بیک گراؤنڈ کا کام دیتی ہے جو سوسائٹی کے خط و خال کو عمدہ طور سے نمایاں کر سکے۔ اُس کے ہاں پہاڑوں کی رُعب دار کیفیت کا بیان نہیں ہے۔ اس کے ہاں جنگلوں کا پُر لطف وحشت ناک سماں نہیں دکھایا گیا۔ وہ پہاڑ پر برف کی چوٹیاں نہیں دکھاتا۔ وہ سمندر میں برف کے پہاڑ نہیں قائم کرتا۔ اُس کے ہاں سمندر نہیں۔ سمندر کا طوفان نہیں۔ اُس کے ہاں جوالا مکھی نہیں۔ جوالا مکھی سے بھونچال[1] نہیں۔ وہ جنگلوں میں آگ نہیں لگاتا۔ وہ دشت میں بجلی نہیں گراتا۔ وہ آبادی میں ہے اور منجھ آبادی میں۔ وہ گاؤں میں صرف ہوا خوری کو کبھی کبھی نکل جاتا ہے، مگر زیادہ تر رہتا وہ شہر ہی میں ہے۔ اُس کی سوسائٹی میں آتے اُمرا و اکابر بھی ہیں، مگر انقلاب زدہ اور مصیبت رسیدہ۔ زیادہ تر اس کے ہاں بازاری خلقت بھری رہتی ہے کبھی کبھی

---

[1] بھونچال پر ایک نظم ہے جس کی ٹیپ یہ ہے۔

دریا و کوہ و شہر جنگل سب ہلا دیا   اک آن میں ہلا دیا اور پھر تھما دیا

یہ زلزلہ 1218ھ میں آیا تھا۔ شاعر نے اس سے ایک واعظانہ اثر لیا ہے۔ (ش)

خوش پاکر اُس کو کم عمر بچے بھی گھیر لیتے ہیں۔ بعض خاص وقتوں میں عاشق مزاج لوگ بھی آکر اپنا درد دکھ اس کو سنا جاتے ہیں۔ وہ فطرت کے قہر و غضب کو بھی دکھاتا ہے مگر وہ قہر و غضب چشمۂ شفقت میں بجھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ غضب کچھ اُسی طرح کا غضب ہے جس طرح کے غضب کا برتاؤ اچھے اور نیک مزاج ماں باپ اپنے پیارے بچوں کی بعض خفیف ناہموار باتوں پر کرتے ہیں۔ گویا وہ فطرت کو انسان کے ساتھ پوری ہمدردی کرنیوالی شفیق ماں سمجھتا ہے۔ کبھی کبھی اس کے تیور پر میل بھی آتے دیکھتا ہے، لیکن وہ دیکھتا ہے کہ پھر تبسم بھی اس کے بعد ہی ہے۔

(2) انسانی فطرت:۔

انسانی فطرت کے اس جوش کو وہ بہت پسند کرتا ہے جو انسان کے مدنی الطبع ہونے کو زور سے ثابت کرتا ہے۔ اس موقع پر اس نگاہ میں کوئی عیب عیب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گو بعض تفصیلات قابل گرفت ہوں مگر حقیقت میں ان کے اجتماع کا باعث ایک امر محمود ہے جس پر تمام دنیا کی آبادی کا دارومدار اور انحصار ہے۔

(3) نظیر کی ہمدردی

اشجار و طیور و بہائم و اجار وغیرہ میں نظیر کی ہمدردی نافذ نہیں ہے، مگر انسان کے کل طبقات کے درمیان اس کی ہمدردی الیکٹرک کرنٹ (بجلی کی لہر) کی طرح پھیل کر تریاقی اثر پھیلاتی ہے۔ غیر ذی روح کسی قدر کورے برتن میں اس کی یہ روح بہت تری و تازگی کے ساتھ سمائی ہے۔ روٹیوں میں بھی نور ظہور خاصہ ہے۔ تربوز اور نارنگیاں بیک گراؤنڈ میں پڑی ہیں۔ ککڑیوں میں کچھ جان ہے۔ ازار بند بھی اپنا مول تول خاصہ دکھا رہا ہے۔ موتی میں بھی آب دتا ہے۔

طیور۔۔ بلبلوں کی لڑائی اور پدڑی اور ارنے کی لڑائی میں طیور کی جنگ آزمائی اور حُسن تدبیر کا تماشہ دکھایا ہے۔ جس بلند شاخ سے اڑا ہے، اور پھر بلندی کی شاخ پر جا کر بیٹھا ہے۔۔ معاشرت کی ہوا اس کو لگی نہ لگی دونوں برابر ہے۔ دکھایا ہے کہ طیور میں رنگِ محبت اُسی طرح پھیلا ہے جس طرح انسانوں میں۔

چرند و پرند:۔ ہرن کی اچھل پھاند خاصی ہے۔ حسن اور ناز پروردگی اور امور دنیا سے

ناواقفیت یہ باتیں ہرن میں جمع ہو کر اُس کو وقفِ ناز اور گرفتارِ بلا کرتی ہیں۔ کوّے کی دوستی اور ہوشیاری اور تجربہ کاری اس کو چھڑاتی ہے۔ معجزے والی شیرنی شفقتِ مادری کا ایک اعلا نمونہ ہے۔

(۴) نظیر کا مفہوم موت :-

موت کو وہ ایک عمدہ مُصلح اخلاق جانتا ہے اور امراؑ و اکابر پر جو انقلابات طاری ہوا کرتے ہیں، وہ اس کے خیال میں اس غرض سے ہیں کہ عام خلقت کو عبرت ہو اور ان کے اخلاق درست رہیں۔

وہ سوسائٹی کا اس قدر عاشق ہے اور اس کی اجتماعی خوش گوار کیفیت اس کے دل پر اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ جب عین اس کیفیت میں وہ ڈوبا ہوتا ہے تو کبھی کبھی اس کو موت کی مصلحت میں بھی کلام معلوم ہوتا ہے۔ کوئی موت کا نام لیتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے اور متوہم ہو کر اس کو ذکرِ موت سے منع کرتا ہے۔

(۵) نظیر کا خیالِ دین

دنیا اُس کے نزدیک اصل ہے اور دین اس کی فروغ۔ جو ہستی کے دین میں ہوگی وہ گویا اس جہان کی ہستی پر منحصر ہوگی۔ وہ ایک عکس ہوگا جس کا سارا دار مدار آج کل کی زندگی پر ہے۔ وہاں اغراض کی گرم بازاری نہ ہوگی۔ لوگوں میں ملنے جلنے کا مادہ نہ ہوگا، کیونکہ کسی کو کسی سے غرض نہ ہوگی۔ تعلق اغراض سے روابط پیدا کرنے کی بہار نہ ہوگی۔ طلب و تلاش کی گرم بازاری سرد ہو جائے گی۔ ہر شخص فنا فی الحق ہوگا اور غرقِ لذّاتِ عیشِ مُطلق۔ ادیان کے اختلاف کو وہ کوئی امر مخلِ حکمتِ الٰہی قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک خدا کے ماننے والے گویا سب بخشے جائیں گے ہر مذہب میں اس کے خیال کے مطابق انسان کی بھلائی کے لیے مفید نصائح ہیں۔ موت سے وہ ڈرتا ہے مگر اس وجہ سے کہ سوسائٹی اس سے چھوٹتی ہے اور دنیا کی بات دنیا کے ساتھ جاتی ہے

(۶) نظیر کے خیالات معجزوں اور خرقِ عادات کی نسبت :-

وہ خدا کی قدرت کے آگے ان کو مطلق بعید نہیں سمجھتا۔

(7) نظیر کے الفاظ:-

ان کی تین قسمیں ہیں، روڑے، سنگ ریزے، جواہرات۔ روڑوں میں وہ الفاظ ثقیل و دشنام آمیز شامل ہیں جو کچھ تو آزادوں کی طرف سے ملے ہیں۔ اور کچھ سوسائٹی کی بدلگامی نے عنایت کیئے ہیں۔

(8) نظیر کی ترکیبیں:-

الفاظ ایک خاص وضع سے اس کے دماغ میں ترتیب پاگئے ہیں اور اسی ترتیب سے بختگی کے ساتھ نکلتے ہیں۔ گویا اس کے دماغ میں متفرق الفاظ نہیں ہیں جن کو وہ وقت پر ترکیب دیتا ہو بلکہ مختلف طول کی لڑیاں ہیں جو پروئی ہوئی رکھی ہیں اور وقت ضرورت خودبخود نکل آتی ہیں۔

(9) نظیر کے قافیے:-

قافیوں میں نظیر اکثر پہلوِ وقت اختیار کرتا ہے اور اس وقت میں آسانی کی ایسی راہیں نکالتا ہے کہ وقت سہل ممتنع ہو کر نظر آتی ہے۔ اکثر اس میں خصوص میں وہ استلزام مالایلزم کی رعایت کرتا ہے۔

(10) نظیر کی بحریں:-

رفتار اکثر سست ہے۔ نصیحت کی نظمیں اور بعض نظمیں، جو تقریبات کے بیان میں ہیں اسی طرح کی ہیں۔ نصیحت کی بعض تیزی بھی دکھاتی ہیں اور وہ غالباً آزادوں کی زبان سے ہیں۔ لڑائی کے بیان میں اکثر بحریں تیز ہیں۔

(11) ہندی مضامین اور ہندی الفاظ:-

ہندی مضامین اور ہندی الفاظ کا بھی اس کے دماغ میں ایک عمدہ خمیر پیدا ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے اُس کے اِس قسم کے کلام میں بھی ایک خاص مزہ ہے۔

(12) نظیر کی جدّت :۔

غزل کے سوا نظیر پرانی لائن پر چلنے کی خواہش بہت کم رکھتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس میں بھی بہک جاتا ہے۔

(13) تضمین :۔

نظیر تضمین کا آپ کو امام اور مجتہد جانتا تھا اور واقعی تھا بھی۔

(14) ناصحانہ کلام :۔

اس کے ناصحانہ کلام پر زیادہ تر اثر درویشی پایا جاتا ہے، جیسے کوئی درویش دنیا سے منہ موڑے ہوئے اپنے مریدوں اور چیلوں کو نصیحت کر رہا ہو۔

(15) صنائع :۔

نظیر صنائع کا برتاؤ بہت کم کرتا ہے۔

(16) اغلاط :۔

کچھ تو وہ ہیں جو غلطی کاتب کی وجہ سے ہیں کیونکہ مصنف کو جمع کی طرف سے چنداں خیال نہ تھا۔ کچھ وہ ہیں جن کو وہ رواج اور استعمال کی وجہ سے صحیح سمجھتا تھا، غلط العام فصیح۔ اور کچھ وہ ہیں جو اب داخل اغلاط ہیں، مگر پہلے وہ یوں نہ تھے۔ یجوز للشاعر ما لا یجوز لغیرہ کے قاعدے کو وہ کسی قدر وسعت کے ساتھ برتتا ہے۔

(17) نظیر کے کلام کی بقا :۔

نظیر کے کلام کا وہ حصہ جو اس نے اپنے خاص مذاق اور خاص خیال کے مطابق شاعرانہ جوش میں لکھا ہے، کبھی فنا ہو نہیں سکتا اور اس قسم کا کلام اس کے مجموعے میں نصف سے زیادہ ہے

غزلوں پر رائے

غزلوں کے لیے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ شاعر کے دل میں عشق کا گہرا اثر ہو۔ چنانچہ اکثر شعرا کی نقلیں مشہور ہیں کہ جب کوئی ان سے شاگرد ہونے کو گیا تو پہلے انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا "میاں تم نے کہیں دل بھی لگایا ہے" حقیقت یہ ہے کہ انسان غزلوں میں ایک سچے عاشق کا پارٹ[1] پلے کرتا ہے۔ اگر معشوق سے جدا ہے تو اس کو سراپا سوز و گداز ہونا چاہیے اور اگر وصل سے کامیاب ہے تو اس کو ہمہ تن شوق و نیاز ہونا چاہیے۔ جب تک جدائی اور وصل کے مزے خود نہ چکھ چکا ہو وہ ایک عاشق کے اصلی خیالات کو کیوں کر جان سکتا ہے اور ان کی اچھی اور سچی تصویر کیوں کر کھینچ سکتا ہے۔ نظیر کے حالات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقع میں گویا عشق و عاشقی ہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ جہاں کہیں اچھی صورت دیکھتا تھا۔ پھسل پڑتا تھا بیسیوں واقعات اپنے عشق کے اس نے خود قلم بند کیے ہیں۔ ان واقعات کی تفصیل اگر منظور ہو تو بزمِ عیش اور طرزِ تقریر اس کی دیکھ لو ـــ طرزِ تقریر میں یہ شعر اس نے حسبِ حال کیا خوب لکھا ہے۔

چناں محو پری وش شمع رویانم کہ اے یاراں
مرا دیوانہ و پروانہ باید بیش ازیں گفتن

جس کی ساری عمر حسن پرستی اور عاشقی میں بسر ہوتی ہو، اس کے عاشقانہ خیالات کی تاثیر کا کیا پوچھنا ہے۔ جتنے مضامین ہیں دل کو چھو کر نکلتے ہیں اور دل ہی میں جا کر بیٹھتے ہیں۔

اس باب میں تو کچھ نظیر ہی منفرد نہیں ـــ میر صاحب کا یہ رنگ ان سے کہیں بڑھا ہوا ہے لیکن ان کے خیالات زیادہ تر محرومی کے دھندلکے میں پڑے ہوتے ہیں۔ ان کے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عشق اکثر ناکام رہا ہے۔ وہ فراق کے جلتے بھنتے مضمون بہت گرم نکالتے ہیں لیکن وصل میں آن کر بالکل ہی پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ نظیر ہجر میں ایک بیتاب عاشق ہے۔ رات اس کو پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ دن اُس کو کاٹے کھاتا ہے۔ تصورات اس کو ستاتے ہیں۔ آنکھ کھولے ہوتے ہے جب بھی معشوق سامنے ہے۔ آنکھیں بند ہیں جب معشوق سامنے ہے۔ کبھی خواب کا طلسم کھڑا کرتا ہے معشوق سے اُس میں ملاقات ہوتی ہے۔ ذوق شوق کی باتیں ہونے لگتی ہیں۔

---

[1] عاشق کی پوری پوری نقل کرنا ہے، جس طرح تھیٹر والے کرتے ہیں۔ (ش)

پھر آنکھ کھل کر سارا طلسم ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ پھر وہی انتظار کی زحمتیں ہیں۔ وہی وعدہ خلافیوں کے صدمے، وہی شوق کی فراوانی، وہی نام و ننگ سے قطعِ نظر۔ وہی ناصحوں سے نفرت، وہی رُقبا، وہی پاس کی دل آزاری، وہی مرگ کی تمنا، وہی گریہ کی طغیانی، وہی جنوں کی جیب دری، وہی آبلہ پائی وہی داغوں کی افراط، وہی ہوا سے باتیں، وہی در و دیوار سے گفتگو۔

جب نظیر وصل کے شبستان میں شمعِ عیش روشن کرتا ہے، وہ ہجر کی تاریکی بالکل رفع ہو جاتی ہے۔ اُس کے کُل زخم بھر جاتے ہیں۔ وہ جن آنکھوں سے رو رہا تھا، اب اُن میں تبسّم کے اثر سے، ایک خاص مسرت انگیز شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ لختِ دل جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہ گئے تھے، اب پھر سمٹ آتے ہیں اور سینے میں پھر ایک بھلا چنگا دل پڑا خوشیوں کی اُمنگ پیدا کر رہا ہے۔ آبلوں میں جو کانٹے چبھے تھے، اُنہی کانٹوں نے سوئیاں بن کر اُن کے پھٹے ہوئے جیب و دامن کو رفو کر دیا ہے۔ دل کے داغ اب داغ نہیں ہیں، ہرے بھرے باغ ہیں۔ مرگ کی تمنا کے عوض زندگانی جاودانی کے تصور بندھ رہے ہیں۔ معشوق حور نظر آتا ہے اور کوٹھری قصور کا جلوہ دکھاتی ہے۔ اگر پاس میں کوئی خانہ باغ ہے تو بلا شبہ روضۂ رضواں ہے۔ رات پہاڑ تھی مگر وصل نے ایک چھو منتر میں پربت سے رائی کر دیا۔ اِدھر آئی اُدھر گئی۔ مرغِ سحر کی آواز دل میں چٹکیاں لیتی ہے اور مؤذن کی بانگ بے ہنگام بے چین کرتی ہے۔ بزمِ عیش کی تصویریں نظیر نے نہایت شوخ رنگ سے کھینچی ہیں۔ یہ رنگ اس کی طبیعت میں اس کی عام کامیابی نے بھر دیا تھا۔ میر صاحب کے ہاں یہ رنگ بہت زیادہ پھیکا ہے۔ وہ اپنی مایوسی اور افسردہ دلی سے بمشکل ابھرتے ہیں، وہ ہنستے ہیں تو ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی ماتم زدہ صفِ ماتم پر ہنسے۔ ان کی ہنسی میں آورد ہے اور نظیر کی ہنسی میں آمد ـــ ان کی ہنسی جاڑے کی صبح ہے، اور نظیر کی ہنسی صبحِ بہار۔ ایک طرف تمام کہرا چھایا ہوا ہے اور ایک طرف بڑا نور برس رہا ہے۔

مجھ کو ابتدا میں ایسا خیال تھا کہ نظیر نے شاید غزلیں کُل اس عمر میں لکھی ہیں جبکہ اس کا شباب تھا اور دل میں عشق و عاشقی کی امنگ بھر رہی تھی، مگر جب غور سے اُس کی غزلوں کو دیکھا تو یہ خیال بدل گیا۔ اس لیے کہ بعض غزلوں میں اس قسم کی پختہ مشقی نظر آئی کہ ان کو جوانی کی طرف منسوب کرنا چنداں قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ عاشقانہ غزلوں کے کہنے کی اُمنگ جوانی نے پیدا کی۔ اس زمانے سے مشق برابر جاری رہی۔ پکی عمر میں پہنچ کر جب اس کے خیالات پر صوفیانہ مضامین کا ہجوم ہونے لگا اور نصائح کے خیالات

اُبلنے لگے، اس وقت غزلیں ایک مہمل چیز معلوم دیں۔ لیکن مشق اتنے زمانے کی بے کار ہاتھ سے نہیں دی جاسکتی تھی، اور ان دنوں کے کچھ خیالات بھی یہ تھے کہ تا وقتے کہ انسان متغزل نہ ہو شاعری نہیں۔ پھر مختلف مقامات میں طرحیں ہوتیں۔ لوگ اُن طرحوں کو لاکر سُناتے اور اُس طرح میں اور لوگوں کی غزلوں کی تعریفیں کرتے تو خواہ مخواہ دل میں تحریک پیدا ہوتی۔۔ غرض اس طور پر کبھی کبھی غزل کی طرف بھی توجہ کرتا۔ مسدّس اور مخمّس اور غزلوں میں آسمان زمین کا فرق ہے، خصوصاً اس کے مخمّس مُسدّس۔ مگر جب غزل گوئی پر جھکتا ہے تو شربت کے گھونٹ کانوں کے رستے اتار دیتا ہے۔ جس غزل پر نظر کرو استاد کی پڑیا اور تجربے کی گانٹھ ہے۔۔۔ بعض غزلیں مسجّع بھی ہیں اور بعض میں بعض[1] صنائع بھی صرف کیے ہیں۔۔ بعض غزلوں کو جوش مضامین کی جہت سے قطعہ بند پائیے گا۔ کلیات میں غزلیں ردیف وار مرتب نہیں ہیں۔۔ معلوم ہوتا ہے جس جس طرح کہتا گیا ہے۔ بیاض میں درج کرتا گیا ہے۔ اِس ترتیب سے کسی قدر اُن غزلوں کی ترتیب۔ تاریخی معلوم ہو سکتی ہے۔

غزل نمبر (7) سے تقلید میر کی جھلکتی ہے۔ یعنی طرز بیان کسی قدر فارسیت ہے جس کو غالب نے دوسری حد تک پہنچایا تھا۔۔۔

شورا فگن جنوں ہے جس جانگاہ کرنا
رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبط آہ کرنا
جانا بھی آگے اُس کے اکثر پے نظارہ
باعث بھی بہر اخفا پھر رو براہ کرنا
ملنا بھی اُس روش سے جس میں گمان اُلفت
گر کچھ بھی ہو دو نہیں دور اشتباہ کرنا
پوچھا اگر اس صنم نے ہم حُسن میں ہیں کیسے؟
تو بے شعوری اپنی ہنس کر گواہ کرنا
کیا کیا نظیر تجھ میں مکر و فریب ہیں جو
اُس رمز آشنا سے اِس ڈھب کی چاہ کرنا

---

[1] کلّیات کی غزل نمبر (27) واسع الشفتین ہے۔ غزل نمبر (4) میں صنعت سوال و جواب ہے۔ (ش)

اس غزل سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نظیرؔ نہایت چوگو شیبا آدمی تھا۔ ہر موقع پر نہایت موقع سے بات بنا دیا جاتا تھا۔۔۔

بعض غزلیں مُرَدّف نہیں ہیں ۔۔۔ یہ طرز قدما کی ہے۔ فارسی میں اکثر بے ردیف غزلیں استادوں نے کہی ہیں اور ردیف کی کمی کو قافیے کی چُستی سے پورا کر دکھایا ہے۔۔۔ اُردو کے قدیم شعرا تو اکثر فارسی کے اُستادوں کی خوشہ چینی کرتے رہے ہیں ۔۔۔ محاورے لیتے تھے، طرحیں لیتے تھے، طرزیں اختیار کرتے تھے۔ خاص خاص بحریں اور زحافات جائز کرتے تھے۔۔۔ اکثر اوقات ریختہ پر وہ عالم ہوتا تھا کہ جیسے کسی ایرانی نے ہندوستانی لباس پہن لیا ہو۔ جُوں جُوں زبان ترقی کرتی گئی اور شاعری قدم اصلاح بڑھاتی گئی، قیدیں بڑھتی گئیں اور خصوصیتیں پیدا ہوتی گئیں۔ موجودہ خصوصیات کے رُو سے خصوصاً لکھنؤ والوں کے خیالات شستگی کے مطابق غیر مُرَدّف غزل کہنا گویا ایک طرح کا جرم ہے لیکن پھر بھی بعض شعراء کہتے ہیں۔۔۔ چنانچہ حالیؔ کا یہ مطلع اس کی شہادت کافی ہے۔

حکم ہے پیرِ مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ
خیر کفّارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ

نظیرؔ کی طرز کسی قدر انشاؔ سے ملتی ہوتی ہے ۔ وہی شوخیِ عبارت ہے۔ وہی لطفِ زبان۔ وہی جو چلے، وہی ڈھکو سلے، وہی روانی۔ اپنی روانی کی طرف نظیرؔ ایک غزل کے مقطع میں خود یوں اشارہ کرتا ہے۔

نظیرؔ ایک غزل اس زمین میں اور بھی لکھ
کہ اب تو کم ہے روانی ترے سخن کی سی

فرق انشاؔ اور نظیرؔ میں صرف اس قدر ہے کہ یہ کہیں کہیں عارفانہ غوطے لگاتا ہے اور وہ کسی قدر اس سے دور ہے۔ اکثر غزلیں جو نظیرؔ کی پُر لطف ہیں قطعہ بند ہیں، اور بہت کم غزل کلیات میں ایسی ہے جس میں کوئی قطعہ نہ ہو۔ کلّیات میں ان غزلوں سے اس کی طرز خاص آشکارا ہے۔

غزل نمبر ۱، غزل نمبر ۱۲، غزل نمبر ۱۵، غزل نمبر ۱۷، غزل نمبر ۱۸، غزل نمبر 23، غزل نمبر 26، واقعی یہ غزلیں جوانی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔۔۔ مگر اُسی زمانے میں آہستہ آہستہ رنگِ تصوف بھی چڑھ رہا تھا۔ یہ تصوّف عشقِ مجازی کے رستے سے آیا۔۔۔ اسی لیے اس کو عاشقوں

کے ساتھ غالباً ہر کلام میں ہمدردی ہے۔ ان کے ساتھ کبھی تشدد نہیں کرتا ــــــ
نظیر کے کلام میں شروع شروع عبرت کا رنگ ظاہر ہوتا ہے اور کبیر کے سے خیالات آہستہ آہستہ پیدا ہوتے ہیں۔

تنِ مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مزیّن یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشین بدن تھا معطّر کفن تھا
جو قبرِ کہن ان کی اکھڑی تو دیکھا
نہ عضوِ بدن تھا نہ تارے کفن تھا
نظیر آ گئے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

نظیر کے خیالات پر بہت ہی ابتدا میں تصوف کا رنگ چڑھتا ہے، اور غالباً یہ رنگ عشقِ مجازی کے آئینہ پر جھلکتا ہے:

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا
یارب تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا
لے عرش سے تا فرش، نئے رنگ نئے ڈھنگ
ہر شکل عجائب ہے، ہر اک شان تماشا
افلاک پہ تاروں کے جھمکتے ہیں طلسمات
اور روئے زمین پر گل و ریحان تماشا
جنات، پری، دیو، ملک، حور بھی نادر
انسان ہیں اعجوبہ تو حیوان تماشا
جب حُسن کے جاتی ہے مرقع پہ نظر آہ!
کیا کیا نظر آتا ہے ہر اک آن تماشا!
چوٹی کی گُندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہیں لہریں
رکھتی ہے کہیں زلف پریشان تماشا

مُنہ زرد، بدن خشک، جگر چاک، المناک
غُل، شور، تپش، نالہ و افغان تماشا
گر عشق کے کوچے میں گذر کیجئے تو واں بھی
ہر وقت نئی سیر ہے ہر آن تماشا
ہم پست نگاہوں کی نظر میں تو نظیرؔ آہ!
سب ارض و سما کے ہیں گلستان تماشا

نظیرؔ نے ایک غزل میں معشوق کا سراپا لکھا ہے جس سے اس کی مصورانہ قدرت کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے :۔

رُخ پری، چشم پری، زلف پری، آن پری
کیوں نہ اب نام خدا ہو ترے قربان پری
جُھمکے جُھمکے وہ ثریا کے کرن پھول وہ پھول
بُندے بالے پری۔ موتی پری اور کان پری
رشکِ خورشید، جبیں، ابر سیہ سی نس پے
لہر چوٹی کی غضب، زلفِ پریشان پری
حُسن گلزار قمر شکل۔ صراحی گردن
مہ جبیں۔ سیبِ ذقن۔ چاہِ زنخدان پری
باڑھ غمزے کی بلا۔ تیرِ نگہ دشنِ[1] سناں
تیغ ابرو کی ستم۔ ترکشِ مژگان پری
مسکرانے کی ادا جیسے چمک بجلی کی
آن ہنسنے کی قیامت، لب و دندان پری

---

[1] دشنہ کہتے تو ہیں نگاہ کو مگر چونکہ نگاہ کا لفظ اوپر آچکا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ شاعر نے کوئی اور معنی ذہن میں رکھے ہوں گے۔ بعض خاص ترکیبیں دیکھنے کی ایسی ہوتی ہیں جن کو نگاہ تو نہیں کہہ سکتے، مگر وہ نگاہ سے الگ بھی نہیں، جیسے مستی، خمار، خواب آلودگی، حیرانی۔ غالباً انہی حسن افزا اور دل فروز ترکیبوں کو دشنہ سے تعبیر کیا ہے —— (ش)

آنکھ مستی کی بھری۔ شوخ نگاہیں چنچل
تہر کا جل کی کھچاوٹ، مسی و پان پری
بینی اور نتھ کا وہ عالم کہ چھدے دل جس سے
نور چتّی کی جھلک۔ گوہر غلطان پری
ڈھک دھکی چاند سی۔ جگنوں بھی ستاروں کی مثال
عطر داں طرفہ، وہ توڑے بھی درخشاں پری
چاک سینے کا غضب۔ صاف بدن موتی سا
انگیا تصویر سی۔ کرتی کا گریبان پری
پشتِ گل برگ۔ شکم سیم۔ کمر تارِ نگاہ
ساق بلّور۔ گلاوٹ میں ہر اک ران پری
گھیرا پشواز کا وہ جس کی کناری قربان
چال آفت کی نشاں جنبش داماں پری
کیا کہوں اس کے سراپا کی میں تعریف نظیر
قد پری۔ دھج پری۔ عالم پری اور شان پری

ایک خاص طرز نظیر کی یہ ہے کہ وہ اکثر مشکل طرحیں کرتا ہے اور ان میں بڑی سلاست سے مضامین نکالتا ہے۔ طرحوں کی دقّت کہتی ہے کہ اس کو تشبیہات اور استعارات پیچ در پیچ کے پیچ زمین شعر میں چت ہی کر کے رہیں گے، لیکن وہ اس اکھاڑے سے بھی سلاست کے خم ٹھونکتا ہوا نکل آتا ہے۔ مرزا نوازش علی نے ایک خط میں جہاں ان کے دیوان کا ذکر کر کے مجھے مشتاق کیا، یہ بھی لکھا کہ دشواری قوافی وغیرہ کو ملاحظہ فرما کر آپ محظوظ ہوں گے۔ ایک غزل کا ان کے مطلع لکھتا ہوں جس کے 36 شعر ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔ آستین کا ثبوت کیسے سخت قوافی میں منظوم کیا ہے:۔

جب کہ اُلٹی ہم نے تکرار نظر پر آستیں
کھینچ لی اس نے رُخِ رشکِ قمر پر آستیں[1]"

---

[1] باطن نے تذکرہ میں اسی غزل کا یہ شعر لکھا ہے:۔

اُس پری رُو کے دوانے کی یہ ہے شکلِ لباس
تار دامن خار پر شاخِ شجر پر آستیں (ش)

چند مشکل طرحیں تذکرۂ باطن اور کلیات سے منتخب کرکے ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ طرح کی اس مشکل پسندی کو شاہ نصیرؔ دہلوی کی طرز سے کسی قدر تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

ہوا جو اس کا وہ کوچہ چمن سرشت نصیب
خدا نے ہم کو اسی جا کیا بہشت نصیب

ساغر کے لب سے پوچھیے اس لب کی لذتیں
کس واسطے کہ خوب سمجھتا ہے لب کی لب

ہے جو اس محبوب کی انگشتری در دستِ چپ
رکھتی ہے کیا کیا نزاکت پروری در دستِ چپ

کل تو دہنے ہاتھ میں تسبیح رکھتا تھا نظیرؔ
اور مصلے کی عنایت گستری در دستِ چپ

آج صہبا کی گلابی اس کے ہے در دستِ راست
اور مطبب مے کی اک پیالی بھری در دستِ چپ

تری قدرت کی قدرت کون پا سکتا ہے کیا قدرت
ترے آگے کوئی قادر کہا سکتا ہے، کیا قدرت

رکھی ہرگز نہ ترے رُخ نے رُخِ بدر کی قدر
کھوئی کاکل نے بھی آخر کو شبِ قدر کی قدر

عزت و قدر کی اس گل سے توقع ہے عبث
واں نہ عزت کی کچھ عزت ہے نہ کچھ قدر کی قدر

راستی خوار ہے اس چشم فسوں پرور سے
ہاں، مگر منزلت مکر ہے اور غدر کی قدر

مے پرستوں میں ہے یوں ساغر و مینا کا وقار
جیسے اسلام میں ہو محتسب و صدر کی قدر

کفش برداری سے اس مہر کی چمکا ہے نظیرؔ
ورنہ کیا خاک تھی اس ذرۂ بے قدر کی قدر

تیری بھی مُنہ کی روشنی رات گئی تھی مہ سے مل
تاب سے تاب، رُخ سے رُخ، نور سے نور، ظل سے ظل

یوسفِ مصر سے مگر ملتے ہیں سب ترے نشاں
زُلف سے زُلف، لب سے لب، چشم سے چشم، تل سے تل

جتنے ہیں کُشتگانِ عشق ان کے ازل سے ہیں ملے
اشک سے اشک، نم سے نم، خون سے خون، گل سے گل

جب سے ہوا ہے کوہ کن کرتے ہیں اس کا غم سدا
کوہ سے کوہ، جو سے جو، سنگ سے سنگ، سل سے سل

یار ملا جب اے نظیرؔ، میرے گلے تو مل گئے
جسم سے جسم، جان سے جان، روح سے روح، دل سے دل

ہوں ترے تصور میں، مری جان ہمہ تن چشم
دل ہے مرا جوں آئینہ حیراں ہمہ تن چشم

مت تختۂ نرگس سمجھ اے گل بدن اس کو
ہے عشق میں تیرے یہ گلستاں ہمہ تن چشم

اس آئینہ رو کے ہے تصور میں نظیرؔ، اب
حیرت زدہ نظارہ، پریشاں ہمہ تن چشم

خط کی رُخساروں پہ اس گل کے جو تحریریں ہیں دو
ہے یہ وہ مصحف کہ جس کے ساتھ تفسیریں ہیں دو

تا ابد آزاد ہیں دام و قفس کے جور سے
بُلبُلِ تصویر و طاؤسِ خیالِ آئینہ

ہستیاں نیستیاں یاں بھی ہیں ایسی، جیسے
وہ کہ اور وہاں کچھ نہیں، اور سب کچھ ہے

بے زری۔ فاقہ کشی۔ مفلسی۔ بے اسبابی
ہم فقیروں کے بھی یاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے

پُھنکی نکلتی ہیں اشکوں کی شیشیاں یا رب
ہمارے سینے میں کس شیشہ گر کی بھٹی ہے
بقاہماری جو پوچھو تو جوں چراغِ مزار
ہوا کے بیچ کوئی دم رہے، رہے، نہ رہے
ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ
مثالِ قطرۂ شبنم رہے، رہے، نہ رہے

ایک غزل اس نے صوفیانہ ڈھنگ میں کہی ہے۔ عبرت کی گہری نظر اور عبارت کی روانی و سلاست قابلِ توجہ ہے:۔

جو تو کہتا ہے، اے غافل! "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے"
یہ جس کا ہے اسی کا ہے، نہ تیرا ہے، نہ میرا ہے
تو اوّل سوچ تو دل میں کہ تو ہے کون اور کیا ہے؟
نمازی ہے، شرابی ہے، اُچکّا ہے، اُٹھیرا ہے؟
فرشتہ ہے، پری ہے، دیو ہے یا آدمی جن ہے؟
بلا ہے، بھوت ہے، بامن، مزورا یا کمیرا ہے؟
تری کیا ذات ہے، کیا نام ہے کیا کام کرتا ہے؟
مسافر بے وطن ہے، یاترا اس جا پہ ڈیرا ہے؟
جب ان چیزوں سے تو اپنے تئیں کچھ چیز ٹھہرا دے
تو اس کے بعد پھر کہیو: "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے"
یہ چیزیں تو غرض کیا ہیں، تو اپنا ہی نہیں مالک
تجھے، او بے خبر ناداں، یہ کس غفلت نے گھیرا ہے؟
تو کچے سوت کا دھاگا عبث بل پیچ کھاتا ہے
یہ سب وہم غلط ہے اور قصورِ فہم تیرا ہے
تو کیا جانے کہ تجھ کو کس نے کس چرخے میں کاتا ہے
تو کیا جانے کہ تجھ کو کس ایرن میں ایڑا ہے؟

لے اس طرح میں آصفؔ کی بھی غزل ہے۔ (ش)

تماشا ہے، مزا ہے، سیر ہے کیا کیا، اہاہاہا!
مصوّر نے عجب کچھ رنگ قدرت کا بکھیرا ہے

ترقّی میں تنزّل ہے، تنزّل میں ترقّی ہے
اندھیرے میں اُجالا ہے، اُجالے میں اندھیرا ہے

طلسماتِ حقیقی ہے، یہ کچھ سمجھا نہیں جاتا
یہی چاند اور یہی سُورج، یہی شام اور سویرا ہے

نظیرؔ، اللہ اللہ! اس جہاں میں دم غنیمت ہے
کہاں ہم اور کہاں پھر تم، کوئی دم کا بسیرا ہے[1]

یہ خیالات نظیرؔ کے کبیرؔ کے خیالات سے کس قدر مشابہ ہیں جہاں وہ کہتا ہے!

بھنورا رے ہم پر دیسی لوگ۔ آج کے بچھڑے نر جا ملیں گے رے، ندیا ناؤ سنجوگ

اب کچھ اور اشعار اس کے تفریح طبع ناظرین کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

از تذکرہ باطنؔ:۔

دیکھ سبزوں کی طراوت کو زمین پڑھتی ہے
دم بدم "انشاالله بنا تا حسنا"

چمن طرازِ حقیقی نے اپنی صنعت سے
کِسی کو پھول بنایا، کِسی کو گھاس کیا

---

[1] ماخوذ از بوستانِ معرفت مولفہ بابو مادھو داس مطبوعہ مطبع منشی نول کشور۔ یہ نظم حقیقت میں کبیرؔ کے اس مشہور دوہے کی شرح ہے:۔

کنکر چُن چُن محل بنایا لوگ کہیں گھر میرا
نا گھر میرا نا گھر تیرا، چڑیا رین بسیرا

یہ دوہا بھی ایک گیت کے ساتھ گایا جاتا ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

اُڑ جا پنکھیڑ دوں تو رہ گیو تھوڑا

آغوشِ تصوّر[1] میں جب ہم نے اُسے مسکا
لب ہائے نزاکت سے اک شور تھا بس بس کا

بدن گل، چہرہ گل، رُخسار گل، لب گل، دہن ہے گل
سراپا اب تو وہ رشکِ چمن ہے ڈھیر پھولوں کا

اُدھر اس کی نگہ کا ناز سے آکر پلٹ جانا
اِدھر مرنا، تڑپنا، غش میں آنا دم اُلٹ جانا

یہ کچھ بہروپ ہے بن دیکھو کر بن کر شکل دانے کی
بکھرنا، سبز ہونا، لہلانا، پھر سمٹ جانا

یہ یکتائی، یہ یک رنگی، تس اُوپر یہ قیامت ہے
نہ کم ہونا نہ بڑھنا، اور ہزاروں گھٹ میں بٹ جانا

دل ہوا جس دن سے بسمل ابروئے دل خواہ کا
تھا وہی پہلا دن اس بسمل کی بسم اللہ کا

نہ گل[2] اپنا نہ خار اپنا نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

نہ آئی بو جو ذرا تیرے مُصحفِ رُخ کی
نسیم پھاڑ گئی آکے ہر ورق گل کا

تو[3] وہ ہے نور سراپا تیری صُورت کو
بشر تو کیا ہے مری جاں ملک کا نہ دیکھ سکا

---

[1] امانت نے اپنے واسوخت کے اس شعر کا مضمون یہیں سے لیا ہے جو بطور ٹیپ کے بند وصل میں یوں واقع ہوا ہے ؎

یاں گرہ کھل گئی دل کی اُدھر انگیا مسکی
لب نازک سے صدا آنے لگی بس بس کی (ش)

[2] اس طرح میں علی گوہر کی غزل بھی ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

کہو بُلبُل سے لے جاوے چمن سے آشیاں اپنا
پڑھے گر صد ہزار افسوں، نہ ہوگا باغباں اپنا

[3] اس طرح میں سودا کی غزل بھی ہے۔ (ش)

گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے
ہمیں تو آہ فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا

یہ ناتواں ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو
تو صورت اس کی اُٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا

گھڑی تو دل کو پرو دیا، گھڑی جگر چھیدا
کبھی خوشی مجھے وہ اک پلک نہ دیکھ سکا

اب تو ذرا سا گانو ہے بیٹی نہ دے اُسے
لگتا تھا ورنہ چین کا داماد آگرا

بتوں کی ناز برداری میں بھی تیری عبادت کی
مری اس بندگی کا اب تو ہی شاہد ہے، معبودا

عزیزو، کیا پڑے سوتے ہو غفلت میں، ذرا جاگو
جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا

ایک نظر گر تجھے دیکھیں تو شادی سے پھر
مہ کو لگیں چار چاند، مہر کو چار آفتاب

فرصتِ عمر قطرۂ شبنم
وصلِ محبوب گوہر نایاب

بقول حضرتِ صائب ہزار حیف لنظیر
کہ در بہار ندارم بہ کف بہائے شراب

قسمت میں گر ہماری یہ مے ہے تو ساقیا
بے اختیار آپ سے شیشہ کرے گا جست

کچھ ہم کو امتیاز نہیں صاف و دُرد کی
اے ساقیانِ بزم بیاوید ہرچہ ہست

کیا کیا مگسِ عقل کے باندھے ہیں پر و بال
کرکے شکرِ خندہ بہم لبِ شکر چند

بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتبِ تقدیر کوئی اور

پڑی ہے خاک گورستاں میں کیا کیا قد موزوں پر
اُگی ہے گھاس کس کس گلبدن کے روئے گلگوں پر

وہ رکھے اینٹ چھاتی پر بہ زیرِ خاک سوتے ہیں
چمکتے تھے سنہرے قصر جن کے بام گردوں پر

واماندگانِ راہ تو منزل پہ جا پڑے
اب تو بھی اے نظیرؔ یہاں سے قدم تراش

وہ عارض اور جبیں تاباں کہ ہوں دیکھ اس کو شرمندہ
قمر، خورشید، زہرہ، شمع، شعلہ، مشتری، مشعل

کفوں میں، اُنگلیوں میں، لعل لب میں چشم سے گوں میں
حنا آفت، ستم فندق، مسی جادو، فسوں کاجل

دیکھے نہ مجھے کیوں کہ از چشم حقارت او
وہ سرو جواں یارو، من فاختہ پیرم

چُپ بیٹھوں تو کہتا ہے، خاموش چرا ہستی
کچھ بولوں تو ہوتا ہے، آزردہ ز تقریرم

کِس طرح سنبل ہوا ان زلفوں سے آکر سر بسر؟
یہ لٹک، یہ بل، یہ پیچ و تاب، یہ خوشبو کہاں

چمن میں جب سے لب اس غنچہ لب نے کھولے ہیں
گلوں کے پہلو میں غنچے نہیں، پھپھولے ہیں

میرے اگر جوئے شیر، تم بھی زری پوش بن
دُودھ چھٹی کا اُسے یاد دِلانے چلو

گو آتشِ گل بھڑکی ہے، پر یہ نہیں توفیق
پھُونکے جو اسیرانِ چمن کے قفسوں کو

تری وہ شان کی رفعت ہے یا رسول اللہ
کہ لامکاں نے کہا: "لا الٰہ الا اللہ"

مصحفِ رُخ پہ ترے ابروتے پیوستہ نہیں
موقلم سے یدِ قدرت نے لکھا بسم اللہ

پکارا قاصدِ اشک آج فوجِ غم کے ہاتھوں سے
ہوا تاراج پہلے شہرِ جاں، دل کا نگر پیچھے

سنو، میں خون کو تو ساتھ اپنے لے آیا ہوں لو رباقی
چلے آتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے لختِ جگر پیچھے

مرتا ہے جو محبوب کی ٹھوکر پہ نظیرؔ آہ !
پھر اس کو کبھی اور کوئی لت نہیں لگتی

زُلف ہو بر سرِ[1] احسان تو گرفتار کرے
چشم کی عین عنایت ہو تو بیمار کرے

مُنہ زرد آہِ سرد و لبِ خشک و چشمِ تر
سچّی جو دِلگی ہے، تو کیا کیا گواہ ہے

بیٹھے بٹھائے خلد میں اِبلیس نے، نظیرؔ
کیا دم دیا ہے حضرتِ آدم کو، دیکھیے

تن دیکھیے جس گل کا جان چھوڑ کے تن نِکلے
وہ سیم تن اُس تن سے کس طور نہ تن نِکلے

یہ نقش ہیں چیچک کے مُنہ پر عرق آلودہ
یا حُسن کی صافی سے قطرے کئی چھن نِکلے

موسیٰ کے تئیں گو شجرِ طور کی سُوجھی[2]
پر ختمِ رسالت کو بڑی دُور کی سُوجھی

---

[1] اس شعر میں بھی امانت کو توارد واقع ہوا ہے۔ دیکھو اس کا بند آنکھ کی تعریف میں۔ (ش)

[2] یہ طرح جرأت کی نکالی ہوئی ہے چنانچہ ان کا مصرعہ انشا کے لطیفے کے ساتھ مشہور ہے۔

اس زُلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سُوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دُور کی سُوجھی (ش)

آدم اک دمڑی کی ٹھِپا گور ہے حاجز سدا
ہم کو کیا کیا پیچواں اور گڑگڑی پر ناز ہے
غور سے دیکھا تو اب یہ وہ مثل ہے اے نظیرؔ
باپ نے پدڑی نہ ماری، بیٹا تیر انداز ہے
بالفرض اگر ہم ہوتے حوّا کے شکم سے
آدم کے تئیں پوچھیے "یہ کس کا جنا ہے؟"
حکمت کا اُلٹ پھیر نہیں جن کی نظر میں
وہ کہتے ہیں غافل یہ بقا ہے یہ فنا ہے؟
اک اُس کی دوا کبھی نہیں جاتی، نظیرؔ، آہ
کچھ روز ہی معجون کا نسخہ یہ بنا ہے؟
چمک ہے، درد ہے، کوندن پڑی ہے، ہوک اٹھتی ہے
مرے پہلو میں کیوں، یارو یہ دل ہے یا کہ پھوڑا ہے؟
کھجوری چوٹی اُدائیں موٹی، جفائیں لمبی ہیں وفائیں چھوٹی
ہے اس سے کھوٹی کر دل ہر اک کا ہر ایک لٹک میں لٹک رہا ہے
وہ نیچی کافر سیاہ پٹی نہ دل کے زخموں پہ باندھے پٹی
پڑھی ہے جس نے کر اس کی پٹی وہ پٹی سے سر پٹک رہا ہے
تیر نگہ کو واہ اِدھر دیکھ بھال دو
مکڑی سے پہلے تاڑنے والوں کو ٹال دو

ازکلیات :۔

پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیرؔ
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے
کرگئی ہے اس کی مژگاں کی چھپک بےکل ہمیں
کل اگر چاہے تو ہم دم اس گھڑی کچھ کل نہیں

دل خم ابرو کو دیتے ہیں تو کس کس پیچ سے
دام میں لیتا ہے اس کاکل کا اک اک بل ہمیں

یہ برق ابر[1] میں دیکھے سے یاد آتی ہے
جھلک کسی کے دوپٹے میں نورتن کی سی

میں ہنس کے اس لیے مُنہ چومتا ہوں غنچے کا
کہ کچھ نشانی ہے اس میں ترے دہن کی سی

دیکھا جو نہانے میں وہ گورا بدن اس کا
بلّور کی چوکی پہ جھلک نُور کی سُوجھی

سر پاؤں سے جب پھنس گئے اس زُلف سیہ میں
تب ہم کو سیاہی شب دیجور کی سُوجھی

وہ مجھ کو دیکھ کچھ اس ڈھب سے شرمسار ہوا
کہ میں حیا ہی پہ اس کی فقط نثار ہوا

سبھوں کو بوسے دیے ہنس کے اور ہمیں گالی
ہزار شکر: بھلا اس قدر تو پیار ہوا

قرار کر کے نہ آیا وہ سنگ دل کافر
پڑیں قرار پہ پتھر یہ کچھ قرار ہوا

گلے کا ہار جو اس گلبدن کے ٹوٹ گیا
تو ڈر نظر کا وہیں اس کو ایک بار ہوا

کسی سے اور تو کچھ بس چلا نہ اس کا نظیرؔ
ندان[2] میرے ہی آکر گلے کا ہار ہُوا

اب تو تری جفا سے یہ مانگوں ہوں میں دُعا:
ظالم، خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل

---

[1] اس طرح میں جرأت کی بھی غزل ہے۔ (ش)
[2] آخرکار۔ پُرانا محاورہ۔ (ش)

اور جس پہ تو فدا ہو، وہ ظالم ہو اس قدر
جو مطلقاً ترا نہ وہ خاطر میں لائے دل
تجھ پر بھی چند روز تو یہ کشمکش رہے
دُز دُزا ادھر کرے اور ادھر کو ستائے دل
ناچار جیسے تجھ سے بچھڑتا ہوں دل کو میں
ایسا ہی اس سے تو بھی لگا کر چھڑائے دل

ہنسے روئے، پھرے رُسوا ہوئے، جاگے بندھے چھوٹے
غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے
کلیجے میں پھپھولے، دل میں داغ اور گل ہیں ہاتھوں پر
کھلے ہیں دیکھیے ہم میں بھی یہ اُلفت کے گل بوٹے
ہزاروں گالیاں دیں، پھر ذرا ہنس کر ادھر دیکھا
بھلا اتنی تسلی سے پھپھولے دل کے کب پھوٹے
کُڑھتے ہو مجھے تم میں یہ مانگوں ہوں دُعا دل میں
"کوئی دلبر مرے آگے تمھیں بھی خوب سا کوٹے"
زباں کی کرکے مقراض، اور بنا دشنام کا کاغذ
ہمارے حق میں کیا کیا آپ نے کترے ہیں گل بوٹے

درجِ غم میں چشم نے گوہر اُگل کر بھر دیے
اشک نے جنگل کے جنگل دم میں ڈھل کر بھر دیے
کل بجوشک رویا کسی کو یاد کر وہ گُل بدن
اشک تھے آنکھوں میں یا موتی کچل کر بھر دیے

ساقی کو جام دینے میں اس خوش نگر کو، آہ
ہر دم اشارتیں ہیں کہ "اس کے تئیں نہیں"

نظیر نے اپنی بعض مشہور اور مقبول غزلوں کی آپ ہی تخمیس بھی کی ہے۔ ان غزلوں کے مطلعے ذیل میں لکھے جاتے ہیں:۔

ترے جمال کی سُورج جھلک نہ دیکھ سکا
کھُلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا

بھرے ہیں اس پری میں اب تو یار و سر بسر موتی
گلے میں، کان میں، نتھ میں، جدھر دیکھو اُدھر موتی

سحر جو نکلا میں اپنے گھر سے تو دیکھا ایک شوخ حُسن والا
جھلک وہ مکھڑے میں اس صنم کے کہ جیسے سُورج میں مُنہ اُجالا

پھر آن کے منّت سے مِلا مجھ سے وہ لالا
المنّتہ لِلّٰہ تقدّس و تعالےٰ

دیر سے آج جو نکلے مُحبتِ ذیشان گئی
لے گئے صبر گئی، دِل گئی، ایمان گئی

قاصد صنم نے خط کو مرے دیکھ کیا کہا
حرفِ عتاب یا سُخنِ دل کشا کہا

پھر ہو کر خفا رُوٹھ گیا ہم سے وہ لالا
اے داغ مبارک ہو تجھے منصبِ والا

کبھی تو آؤ ہمارے بھی، جان کوٹھے پر
لیا ہے ہم نے اکیلا مکان کوٹھے پہ

زُلفیں یہ دو نہیں رُخِ دلبر کے آس پاس
ابرِ سیہ ہے ماہِ منوّر کے آس پاس

لگایا دام زُلفوں کی شکن نے، پیچ نے بل نے
بنایا پان نے رنگ اور سنبھالا سحر کا جل نے

مانی نے جو دیکھا تری تنویر کا نقشا
سب بھُول گیا اپنی وہ تصویر کا نقشا

یہ غزلیں جو مخمّس ہوئی ہیں ان میں سے اکثر میں یہ لُطف پیدا کیا گیا ہے کہ باوجودے کہ غزل کے اشعار ایک دوسرے سے غیر متعلّق ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی تخمیس کی کاری گری سے ایک دوسرے سے ان کو اس طرح ربط دیا ہے کہ بجائے خود ایک مسلسل روداد ہے، جس

کے پڑھنے میں آدمی کو لطفِ افسانہ ہوتا ہے۔

کر قتل مجھے تُو نے ہمیشہ کو جلایا
ظالم، تجھے جیتا رکھے اللہ تعالیٰ
دیکھ اب تو مجھے ہر کوئی کہتا ہے، یہی آہ
"پھر قبر سے اللہ نے مجنوں کو نکالا"
مر مر، مجھے کہتا تھا سو مرتا ہوں میں یارو
اب لاؤ کہاں ہے وہ مرا کوسنے والا
قاصد، تو مرا نام تو لیجو نہ، و لیکن
کہنا: "کوئی مرتا ہے ترا چاہنے والا"
لے لے کے بلائیں مجھے پھر کہتی ہیں آنکھیں
"صدقے ترے، پھر ایک نظر مجھ کو دکھالا"
اوروں کو جو گرتے ہوئے دیکھا تو لیا تھام
ہم گر بھی پڑے تو بھی نہ ظالم نہ سنبھالا
جانؔ کر گورِ غریباں میں قیامت نہ مچا
ابھی سوتے ہیں ترے بے سرو سامان کئی
اب تو ٹک مُنہ کو دکھا، یار کہ نرگس بن کر
نکلے ہیں خاک چمن سے ترے حیران کئی
اس کے دامن سے لگوں، پاؤں پڑوں، ساتھ چلوں
خاک ہوں تو بھی مرے جی میں رہیں ارمان کئی

ؔ سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس پر سوداؔ کا اعتراض مشہور ہے کہ

"شعر تو میرؔ صاحب کا ہے مگر درد خواہی ان کی دوا کی معلوم ہوتی ہے" نظیرؔ نے اس اعتراض سے بچ کر ایک راہ نکالی ہے اور میرے خیال میں عاشقانہ پہلو سے سوداؔ سے بہتر کامیاب ہوا ہے۔ سوداؔ کے شعر سے مقابلہ کرکے دیکھ لو ——— (ش)

پان کھاکھا کے نہ ہنس اس درجہ تو اے دشمنِ جاں
ابھی بھر جائیں گے خوں میں لب و دندان کتنی

بوسے کی طلب کی تو کہا ناز سے "چل دور"
اور دل کو کہا "لے"، تو وہیں ہنس کے کہا "لا"

مجھ ضعف کے مارے کو نہ زنجیر پنھاؤ
کافی ہیں مری قید کو اک مکڑی کا جالا

گر بس ہو مرا تو میں کسی چور سے کہہ دوں
جا آج پلنگ اس کے تو سونے کا اُٹھالا

کیا جانیے کس حال میں ہووے گا عزیزو
دل آج میرا، سلّمہ اللہ تعالےٰ

کھڑے جو ہوتے ہو تم آن آن کوٹھے پر
کرو گے حُسن کی کیا تم دُکان کوٹھے پر

یہ چونے کاری میں ہوتی ہے سُرخی کب ایسی
کسی کے خون کا ہے یہ نشان کوٹھے پر

لڑاؤ غیر سے آنکھیں، کہو ہو ہم سے، آہ!
کہ "تھا ہمیں تو تمھارا ہی دھیان کوٹھے پر"

خُدا کے واسطے اتنا تو جُھوٹ مت بولو
کہیں نہ ٹوٹ پڑے آسمان کوٹھے پر

تجھ میں تو یہ شمیم نہ تھی سچ کہہ اے نسیم
کس کی پھری تو زُلفِ معنبر کے آس پاس

ہم تو کمر بندھانے کے حیلے سے پھر لیے
ٹپکے کے ساتھ ساتھ ستم گر کے آس پاس

لگایا دام زُلفوں کی شکن نے پیچ نے بل نے
بنایا پان نے رنگ، اور سنبھالا سحر کاجل نے

وہ دل دیکھتے ہی اس صنم کو ہو گیا شاداں
نگاہیں دم بہ دم سو عیش و عشرت سے لگیں بکنے
کبھی خوش ہو کے "ہو ہو" کی کبھی بولا "ہا ہا ہا!"
عجب لوٹے مزے اس وقت نظاروں کی اٹکل نے
نہ بولا منہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری
مگر کچھ کچھ تبسم کی شکر لب سے لگا ملنے
مجھے کر تجل سے غافل، بھولی صورت کا بنا نقشہ
کیا اِک بار منہ غصے میں سُرخ اس یار اچپل نے
اب اس ظالم کے ہاتھوں سے بچاؤں کیونکر اپنا جی
اُٹھا کر جھٹ قدم واں سے لگا گھر کی طرف چلنے
چلا ڈرتا جو آگے کو تو وہ پھر ہنس کے یوں بولا
"اُٹھا کر مفت نظارے بچا، اب تم لگے ٹلنے"
ادب سے یوں کہا: "اب تو ہوئی تقصیر یہ مجھ سے
لگے قطرے پسینے کے مرے منہ سے وہیں ڈھلنے
لگے غمزے لگنے تیر اِدھر دکھلا کے سو پھرتی
اُدھر سے تیغ ابرو کی بھی بھر کیا کیا لگی چلنے
اِدھر آنکھوں کے جادو نے بنایا باولا کیسا کیسا
اُدھر کیں پھرتیاں کیا کیا نگاہوں کی بھی چھل بل نے
دکھا کر مجھ کو اپنی واں زبردستی کے یہ نقشے
وہیں دل لے لیا جھٹ پٹ نظیرؔ اس شوخ چنچل نے
وہ زلفیں اس کی سیاہ پُرخم کر ان کے بل اور شکن کو یارو
نہ پہنچے سنبل، نہ پہنچے ریحاں، نہ پہنچے ناگن، نہ پہنچے کالا
نگہ لڑائی ہے اس نے جس دم جھپک کا جھپکے دل کو میرے
اداؤں نے اِدھر دبوچا، پلک پلک نے اُدھر اچھالا

وہ ہنستے ہیں تو کھلتا ہے جواہر خانۂ قدرت
اِدھر لعل اور اُدھر نیلم، اِدھر مرجاں، اُدھر موتی

سراپا موتیوں کا پھر تو اک گچھا وہ ہوتی ہے
کہ کچھ وہ خشک موتی، کچھ پسینے کے وہ تر موتی

تبسم کی جھلک میں یوں جھمک جاتے ہیں دانت اس کے
کسی کے یک بیک جس طور جاتے ہیں بکھر موتی

میں تو صفِ محشر میں بھی لوں گا تجھے پہچان
رانجھا کو نہ بھولے گا کبھی ہیر کا نقشا

کبھی بوسہ، کبھی انگیا پہ ہاتھ، اور گاہ سینے پر
لگے لٹنے مزے کے سنگترے اور بیر آندھی میں

وہ چاندنی میں جو ٹک سیر کو نکلتے ہیں
تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

چراغِ صبح یہ کہتا ہے آفتاب کو دیکھ
"یہ بزم تم کو مبارک ہو" ہم تو چلتے ہیں

دولت ہی کا ملنا ہے بڑی چیز، نظیرؔ آہ
بالفرض ہوئی اس سے ملاقات، تو پھر کیا؟

جس قدر پینا ہو پی لے ان بتوں کے ہاتھ سے
آبِ جنت تو بہت ہوگا، یہ پانی پھر کہاں؟

لذتیں جنت کے میوے کی بہت ہوں گی وہاں
پر یہ میٹھی گالیاں خوبوں کی کھانی پھر کہاں؟

واعظ و ناصح بکیں تو ان کے کہنے کو زماں
دم غنیمت ہے، میاں، یہ نوجوانی پھر کہاں؟

از تذکرۂ ابوالقاسم میر قدرۃ اللہ قادری ا۔

تو ہستی کی گرہ پہ عقل کا ناخن نہ تو ڑا ے دل
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

یہ ظالم سنگ دل محبوب جادوگر، ستم پیشہ
چُنان بردند صبراز دل کہ ترکاں خوانِ یغمارا

جگنو پہ جان لوٹے ہے، چنبا کلی پہ دل
اور رُوح لوٹتی ہے مِری عطر دان پر

کہا "جو ایک لے بوسہ" میں دو لگا لینے
تو ہنس کے کہنے لگے "چل بے، اب نہ ایک نہ دو"

سمندِ آسماں کب آپ سے دوڑے ہے اس پر تو
کسی کی ایڑ پر ہے ایڑ، اور کوڑے پہ کوڑا ہے

از فرہنگ آصفیہ و ارمغان دہلی:۔

کل بوسۂ پا ہم نے لیا تھا سو نہ آیا
شاید کہ وہ بوسہ ہی ہوا آبلۂ پا

آپھنسا جو کوئی اس دامِ گرہستی میں
تھا جو دانا بہت زیست سے بیزار رہا

لگی تھی آگ جگر میں بجھائی اشکوں نے
گر یہ اشک نہ ہوتے تو کیا ٹھکانا تھا

تم لگے غیروں سے ملنے دل ہمارا پھٹ گیا
جو قدم اُلفت کا آگے تھا سو پیچھے ہٹ گیا

دن کو ہمارے پاس وہ چنچل کاہے کو آوے گا اے دل
رات کو اک دم خواب میں آنا جس نے ادھر کا چھوڑ دیا

جال میں زر کے اگر موتی کا دانا ہوگا
وہ نہ اس دام میں آئے گا جو دانا ہوگا

کہا جو ہم نے کہ ان لگیے ہمارے سینے سے اس دام میں اے جاں
تو سُن کے اس نے حیا کی ایسی کہ آیا مُنہ پر وہیں پسینا

اُس نے جب آنکھیں لڑا کر ہنس دیا
ہم نے بھی نظریں ملا کر ہنس دیا

ترے مُنہ کے جو ہر دم روبرو لے کو کہتا ہے
ذرا آئینہ لے کر مُنہ تو دیکھیے آفتاب اپنا

سُن کے یہ میرا عرضِ حال یار نے یوں کہا نظیرؔ
نہ چل بے زیادہ اب نہ بک تونے تو سر پھرا دیا

نظیرؔ یار سے کیوں دردِ دل نہیں کہتا
سُنا نہیں ہے وہ تونے کہ سانچ کو کیا آنچ

آج اس کی فہم میں کیا جانے کیا آیا نظیرؔ
جو ہمارے لگ گیا چنچل گلے سے دوڑ کر

ہنس کر نظیرؔ واں سے ٹھوکر لگا ہٹا دی
کی اس نے یہ ہماری تصویر پر نوازش

پڑا جو ہاتھ نظیرؔ اس کے سینے پر میرا
تو بولی "واہ لگے آگ اس قرینے میں"

صُبح جب بول اُٹھا مُرغِ سحر ککڑوں کوں
اُٹھ گئے پاس سے وہ رہ گیا میں ٹڑوں ٹوں

ڈر ہم کو بناوٹ کی ادا کا تو نہیں ہے
وہ آن غضب ہے جو خدا داد کوئی ہو

پہلے ہی دیکھنے میں آنکھیں دکھائیں کیا کیا
چنچل نے ہم کو یارو دہلا دیا ابھی سے

باتیں ہمارے دل کی کہہ دیں نظیرؔ اس نے
ہے سچ تو یوں کہ دِل کو ہوتی ہے راہ دِل سے

وہ جب گھر سے نکلے سمٹتے جھجکتے
قدم بھی اُٹھائے جھجکتے جھجکتے

صبح کا کرتا ہے وعدہ وہ تو پھر آتا ہے کب؟
دوسرے دن کا کہیں جب تیسرا پہر آئے ہے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

محمد حسین آزاد نے ایک مقام پر آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "نظیر کے بعض اشعار میر سے پہلو مارتے ہیں"۔ ضرور ہے کہ بعض کلام نظیر کا واقعی انھوں نے میر کے کلام سے مقابلہ کیا ہوگا اور کوئی مناسبت پائی ہوگی۔ واقعی میں نے بھی دونوں شاعروں کے کلام کا موازنہ کیا تو آزاد کی رائے کو صحیح پایا۔ کہیں کہیں نظیر کے کلام میں میر کی جھلک پائی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر جیسے اس غزل میں:۔

شور افگنِ جنوں ہے جس جانگاہ کرنا
رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبطِ آہ کرنا
جانا بھی آگے اس کے اکثر پے نظارہ
باعث بھی بہرِ اخفا پھر رُو بہ راہ کرنا
ملنا بھی اس روش سے جس میں گمانِ اُلفت
گر کچھ بھی ہو تو ذو نہیں دور اشتباہ کرنا
کیا کیا، نظیر، تجھ میں مکر و فریب ہیں جو
اس رمز آشنا سے اس ڈھب کی چاہ کرنا

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک طرح ایسی بھی مل گئی جس میں میر اور نظیر دونوں کی غزلیں ہیں، بلکہ سودا اور انشا نے بھی اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہم پہلے میر کی غزل لکھتے ہیں:۔

دل پہنچا ہلاکی کو نپٹ کھینچ کسالا
لے یار مرے، سلمہ اللہ تعالیٰ

(لہ صـ 266 سے آگے)

لہ اس طرح میں نکہت کی بھی غزل ہے۔ مطلع ہے۔

پیچ و خم میں مو بجو ہر مُو کے اُلجھا جاتے ہے
مانگ کے رستے میں دل ٹھوکر پہ ٹھوکر کھاتے ہے

عارف۔ غالب۔ ذوقی۔ وغیرہ کی غزلیں ان کے بعد کی ہیں۔ (ش)

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر
مسجد میں ہے کیا شیخ، پیالہ نہ نوالا

گذرے ہے کہو واں سرِ ہر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

گر قصد ادھر کا ہے تو ٹک دیکھ کے آنا
یہ دیر ہے زہّاد، نہ ہو خانۂ خالا

جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش
واں چادرِ مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا

ق

دشمن نہ کدورت سے مرے سامنے ہو جو
تلوار کے لڑنے کو مرے کیجو حوالا

ناموس مجھے صافیِ طینت کی ہے، ورنہ
رستم نے مری تیغ کا حملہ نہ سنبھالا

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پرخشم سے وہ میرؔ
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

اس زمین میں سوداؔ کی جو غزل ہے وہ میری رائے میں میرؔ سے بڑھی ہوئی ہے۔ سوداؔ کے عمدہ اشعار اس غزل میں یہ ہیں:۔

میں دشمنِ جاں ڈھونڈ کر اپنا جو نکالا
سو حضرتِ دل سلّمہ اللہ تعالیٰ

جب مست چمن سے ہو چلا گھر کو وہ لالا
غنچے نے صراحی لی اٹھا، گل نے پیالا

مانگا جو میں دل کو تو کہا "بس یہی اک دل
جلنے ہی کو چاہے مرے کوچے سے اٹھالا"

اے غنچہ سبب کیا ہے کہ آتے ہی چمن میں
گل پھاڑے ہے دامن، تو نے کلی کو سنبھالا

اتنا ہی تو یوسف سے مشابہ، کہ عدم کے
پردے میں چھپا اس کے تئیں تجھ کو نکالا

فتنہ ہی اٹھاتے ہو گئی پشت فلک خم
ہرگز نہ کسی گرتے کو ظالم نے سنبھالا

انشا نے عشق کو عشق حقیقی کی طرف کھینچ کر عارفانہ رنگ میں اپنی غزل کو چمکایا ہے۔ دو شعر اس غزل کے اچھے ہیں۔ باقی تبرک۔

اے عشق، مجھے شاہد اصلی کو دکھالا
قم، عذبیدی، و فعلک اللہ تعالیٰ

اتنا تو پھرا وادیٔ وحشت میں، کہ میرے
ہے پائے نظر میں بھی پڑا اشک کا چھالا

اب سب سے اخیر میں نظیر کی غزل لکھی جاتی ہے۔ میری رائے میں میر، سودا، انشا سب سے اس کی غزل بڑھی ہوئی ہے۔ زبان میں سادگی ہے اور روانی۔ مضمون آفرینی کے لیے مبالغے کا دامن زبردستی نہیں کھینچا گیا۔ نہایت عاشقانہ گہرا رنگ ہے۔ ہر شعر میں زبان اور خیالات کی گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ بسم اللہ تعالیٰ کو میر سے بہتر سودا چمکا چکا تھا۔ اس میں گنجائش نہ تھی۔ نظیر نے بہ تبدیل ضمیر ترجمہ کر کے کچھ لطف پیدا کیا ہے۔ انشا نے ایک نیا فقرہ لیا۔ نظیر نے بھی مطلع میں ایسا ہی کیا ہے۔ دونوں کے مطلع لطیف ہیں:-

پھر اُن کے منت سے ملا ہم سے وہ لالا
المنت للہ تقدس و تعالےٰ

کر قتل مجھے تو نے ہمیشہ کو جِلایا
ظالم، تجھے جیتا رکھے اللہ تعالےٰ

دیکھو اب تو مجھے ہر کوئی کہتا ہے یہی، آہ!
"پھر قبر سے اللہ نے مجنوں کو نکالا"

"مرمر" مجھے کہتا تھا سو مرتا ہوں میں یارو
اب لاؤ کہاں ہے وہ مرا کوسنے والا ؟
بن تختۂ گل آخرش اس خاک چمن سے
نکلا مرے قاتل کے شہیدوں کا رسالا
قاصد، تو مرا نام تو لیجو نہ ولیکن
کہنا، کوئی مرتا ہے ترا چاہنے والا
کیا خاک اُڑانے کو چلیں، آہ! چمن میں
نہ یار، نہ ساقی، نہ صُراحی، نہ پیالا
جیسا کہ وہ ہو مجھ سے خفا روٹھ چلا تھا
اللہ ہی نے کیوں جب ہی مجھے مار ڈالا
شاید وہی بن ٹھن کے چلا ہے کہیں گھر سے
ہے یہ تو اُسی چاند سی صُورت کا اُجالا
لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں
صدقے ترے، پھر ایک نظر مجھ کو دکھالا
صحرا میں مرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا
گر پھوٹ کے رویا تو مرے پاؤں کا چھالا
اوروں کو جو گرتے ہوئے دیکھا تو لیا تھام
ہم گر بھی پڑے تو بھی نہ ظالم نے سنبھالا
ہم تجھ سے اِسی روز کو کہتے تھے، نظیرؔ، آہ!
کیوں تُو نے بھی پڑھا عشق و محبّت کا رسالا

اس غزل پر خود نظیر کو بھی ناز تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ جواب اس سے اچھا بنا ہے، اس کی مقبولیت کے صلے میں اس کو زیورِ خمسہ سے بھی آراستہ کیا ہے۔

رُباعیوں پر رائے

مجھے ہنسی آتی ہے کہ میں نظیرؔ کی رُباعیوں پر رائے لکھنے بیٹھا ہوں حالانکہ نظیرؔ کے کلیات میں ایک رُباعی بھی موجود نہیں۔ البتہ اس کے فارسی کلام میں چند رُباعیاں ہیں، وہ بھی کُل ایک وضع کی ایک ہی مضمون پر۔ پھر میں رائے دوں تو کیا دوں۔

رُباعی کا اُستاد شعراء کے نزدیک اب وہی شخص خیال کیا جاتا ہے جو عمر خیامؔ سے بڑھ جائے لیکن اس نے اپنا خیمہ اس قدر بلند قائم کیا ہے کہ کسی شاعر کے قلم و کاغذ کا ایک چوبہ اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اُردو میں اساتذۂ قدیم کی رُباعیاں تو محض تبرک ہیں۔ ذوقؔ نے ادھر کچھ توجہ کی تھی مگر اس کے اکثر کلام کے ساتھ رُباعیاں بھی تلف ہو گئیں۔ متاخرین میں انیسؔ و دبیرؔ اور ان دونوں خاندان کے شعراء نے کثرت سے رُباعیاں لکھی ہیں اور اکثر کام کی لکھی ہیں۔ تشبیہات و استعارات اور خاص عقائد سے قطع نظر، حکمت و اخلاق کی بہت سی رُباعیاں نہایت قابلِ قدر ہیں۔

میں نظیرؔ کو چند رُباعیوں سے نہ عمر خیامؔ بنا سکتا نہ دردؔ نہ ذوقؔ نہ انیسؔ نہ دبیرؔ۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس گُر سے واقف تھا کہ رُباعی میں تان کی جان ہے چوتھا مصرعہ۔ اسی میں لے ہونی چاہیے اور اسی کو تفتیش۔ سامعہ تخلیہ عقل سب کو فریفتہ کرنا چاہیے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس فن میں اساتذہ نے اس کثرت سے طبع آزمائی کی ہے کہ تازہ مضامین اور مقبول مضامین نکالنے اس میں مشکل ہیں۔ اس لیے وہ اپنی قدرتِ ایجاد سے کوشش کر کے ایک نئی راہ نکالتا ہے، اور گو مختصر ہی لکھتا، مگر ایسا لکھتا ہے کہ ذہن پر اس کا دیرپا اثر رہتا ہے۔ وہ اپنی مشہور طرز مسدّس و مخمس کے مطابق یہاں بھی بندش کی لڑی میں رُباعیوں کو پرو کر ایک دلچسپ واقعہ بنا لیتا ہے۔ اس پردے میں وہ اپنی ایک بڑی صنعت یہ بھی دکھاتا ہے کہ مصرعے پر مختلف طور پر کتنے مصرعے لگائے جا سکتے ہیں۔ سلاست و روانی اور بے تکلفی اس کے یہاں بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ چونکہ رُباعیاں اس کی حکم عنقا رکھتی ہیں، اگر یہاں نقل کی جائیں تو غالباً ناظرین پر بار نہ ہوگا۔ رُباعیاں جو ذیل میں نقل ہوتی ہیں، وہ ہیں جو اس نے ایک اپنی طرز کے پسند کرنے

والے دوست کی خاطر سے لکھی تھیں اور ایک سخن فہم دوست کے مطالعے کو خط میں لکھ کر بھیجی تھیں۔ اس میں کسی قدر ایجاد کی جھلک ہے جس سے حضرت امیر خسرو نے اپنی رُباعیوں سے چکایا تھا۔

1

دل بُرد زمن چوں نازنینے زیبا
پُرحیلہ و پُر فریب و پُرنازو ادا
گفتم کہ دلم وہ بہ تبسم فرمود
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

2

چوں روز دگر باں صنم عشوہ نما
گفتم کہ نشد وعدۂ دیروز وفا
بشنید و بخندید و بفرمود امروز
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

3

چوں بعد دو پاس پیش آن مہ لقا
حاضر شدم و بگفتم اے حیلہ گرا
حالا چہ بخاطر است۔ گفتا بدہم
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

4

چوں بعد زپاس زود مانند صبا
نوشش رفتم و گفتمش کہ اے مہر فزا
اکنوں چہ قرار۔ گفت نہ خواہی مافیت
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

5

چون بعد زساعتی برفتم آنجا
گفتم کہ چنیں دیر مفرما۔ گفتا
اندیشہ مکن کہ دل بدستت آید
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

6

ہم بعد ز لحظہ رفتم و باغوغا
گفتم کہ چنیں نیست و لعل تا بکجا
فرمود کہ بیش ازین تعقل نشود
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

7

ناچار ز روئے عجز گفتم اورا
آن لحظ بفرما کہ چہ باشد، گفتا
چندان طلبی نظیر خواہم بتو گفت
البتہ مگر تو بعد یک لحظہ بیا

(قدر متین رقعہ نمبر 126)

قصیدوں پر رائے

ہم نظیر کو نہ خاقانی و انوری سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو ولایت میں قصائد کے استاد تھے، نہ امیر خسرو اور فیضی سے جو ہندوستان میں اس فن میں مسلّم الثبوت تھے۔ نہ سودا سے جو اردو میں اس فن کا امام ہے۔ نہ انشا سے جو بقول آزاد اُردو کا امیر خسرو ہے۔ نہ ذوق سے جو بقول ظفر خاقانیِ ہند ہے۔ اگر اس فن میں اس کی کسی سے تشبیہ ہو سکتی ہے تو وہ حضرت شیخ سعدی ہیں۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ وہ تعلق دربار کے سبب کبھی کبھی گونا مصاحانہ پیرائے ہی میں کیوں نہ ہو مدح امراؤ سلاطین پر مجبور ہوتے تھے اور اس کو کبھی ایسی مجبوری واقع نہ ہوئی۔

قصائد جو اس کے میسّر ہیں وہ تعداد میں بہت قلیل ہیں لیکن ایسا سمجھنا کہ اس نے اپنی عمر بھر میں صرف اُتنے ہی کہے ہوں گے غلطی ہے۔ جس طرح اس کا اور بہت سا کلام ضائع ہوا قصائد بھی معرض تلف میں آئے پھر بھی جس قدر باقی ہیں وہ اس کی استادی کے ثبوت کو کافی ہیں۔

قصائد میں بڑی اُستادی ہے۔ گُریز جس کو حسنِ تخلص بھی کہہ سکتے ہیں، مگر گریز ہے لازمۂ مدح اور یہاں اس کے قصائد میں سرے سے مدح ہی نہیں، پھر لطفِ گریز کہاں سے پیدا ہو۔ البتہ حسنِ خاتمہ کی لطافت ہر جگہ موجود ہے اور اسی وجہ سے اس کے قصائد پر زیادہ تر قطعے کی تعریف صادق آتی ہے۔

طولِ مبالغہ، شدّتِ تشبیہ، دقّتِ استعارہ، مشکل صنائع کا التزام، الفاظ کی دھوم دھام یہ باتیں بھی لازمۂ مدح ہیں۔ یہاں صرف تشبیب ہے اور بس۔ مخاطب عقلِ سلیم ہے نہ سلطانِ[1] ہفت اقلیم۔ پیش کش برگ سبز ہے، نہ لعل زمرد۔ سرے سے تاج ہی نہیں تو لعل و یاقوت کے لیے یمن و بدخشاں کی کیوں خاک چھانی جائے۔ اور دیہیم[2] ہی نہیں تو گوہر و مرجاں کے

---

[1] مراد ایران ہے۔ (م)

[2] کلغی، مکٹ۔ (م)

پیے قلزم و عمّاں میں کیوں غوطے لگائے جائیں۔ نصیحت کی دُکان ہے، گو دکان میں بہت زیادہ آرائش کی چمک دمک نہیں ہے۔ مگر جتنے جواہرات ہیں سچے قدرتی نور سے پڑے چمک رہے ہیں۔ راستی کا جوہری بے پروا بیٹھا ہے۔ نہ بہت لمبی چوڑی باتیں بناتا ہے نہ مال کے دکھانے میں کوئی کرتب کرتا۔ سچا مال ہے بے لاگ دکھاتا ہے اور بے کھٹکے دام مانگتا ہے۔ جی چاہے لیجیے جی چاہے نہ لیجیے۔ نظیر کے قصائد میں ہنس نامہ بھی شامل ہے مگر شہرت کی ہوا میں خدا جانے یہ کب سے اُڑ رہا ہے اس کو تکلیف دینے کی حاجت نہیں — دو قصیدے البتہ نئے ہیں۔ غلام محمد رہاؔ نے ذکر کیا۔ باطنؔ نے سُنائے۔ ایک تو میرؔ کے اس قطعے کی شرح ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُرغرور تھا

دوسرا اُستاد کے اس شعر کی۔

پردہ داری مے کند بر قصرِ قیصر عنکبوت
بُوم نوبت مے زند بر کنگرِ افراسیاب

خاقانیؔ نے کسی زمانے میں مدین کے ویرانے کی سیر سے اثر لے کر وہ مشہور قصیدہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

زرّیں ترہ پرویز خسرو و تُرنجِ زر
زرّیں ترہ کو برخوان گو کم ترکو اُبر خوان

نظیرؔ کو دُور جانے کی حاجت نہ تھی۔ مدین اس کے گھر ہی میں موجود تھا۔ رقّت جو آئی تو کسی دن عبرت کی آنکھوں سے یوں آنسو بہا دیے۔

یہ بظاہر خانۂ دُنیا جو ہے باآب و تاب
اہلِ صورت کا ہے دریا اہلِ معنی کا سراب
وہ مُطلّا قصرِ رنگیں وہ منقش بام و در
جن کی رنگینی سے تھا قصرِ ارم کو پیچ و تاب

وہ عظیم الشّان مکاں دیتی تھیں جن کی رفعتیں
ہنس کے طاقِ آسماں کو طاقِ ابرو سے جواب
صحن میں بُستاں سدا ایسے پُر از غلمان و حُور
جن کی انہاروں میں جائے آب وگل خالص گُلاب
ان میں تھے وہ صاحبِ ثروت جنھیں کہتی تھی خلق
کیقباد و قیصر و کیخسرو و افسر اسیاب
مہر وشِ بہرام صولت بدر قدر و خرچ رخش
مشتری ہمّت ثریا بارگہ کیواں جناب
وہ تجمّل وہ تموّل وہ تفوّق وہ غرور
وہ تحشّم وہ تنعّم وہ تعیّش وہ شباب
ہر طرف فوج بتاں ہر سو، ہجوم گل رُخاں
جن کے عارض رنجِ ماہ و رشک روئے آفتاب
چشمک و آن و اشارات و ادا و سرکشی
طنز و تعریض و کنایت غمزہ و ناز و عتاب
صبح سے لے شام تک اور شام سے لے تا بہ صبح
مشغلہ رقص و سرود و پے بہ پے جام و شراب
ساقی و مُطرب ندیم و مستی و میخوارگی
ساغر و مینا و گل عطر و مے و نقل و کباب
کثرتِ اہل نشاط و جوشِ نوشا نوش مے
از زمیں تا آسماں شور نے و چنگ و رباب
وہ بہاریں وہ فضائیں وہ ہوائیں وہ سرور
وہ طرب وہ عیش کچھ جس کا نہیں حد و حساب
یا تو وہ ہنگامہ تنشیط تھا یا دفعتہً
کر دیا ایسا کچھ اس دورِ فلک نے انقلاب

جو وہ سب جاتے رہے دم میں حباب آسا مگر
رہ گئے عبرت زدہ وہ قصر ویران و خراب
تھا جہاں وہ مجمعِ عالی وہاں اب ہے تو کیا
نقشِ ستم گوریا کہنہ کوئی پترِ عتاب
ہیں اگر دو خشت باہم تو لبِ افسوس ہیں
اور جو کوئی طاق ہے تو صورتِ چشمِ پُر آب
خواب کہیے اس تماشے کو نظیرؔ اب یا خیال
کچھ کہا جاتا نہیں واللہ اعلم بالصواب

دوسرا قصیدہ مسجّع :-

کیا کاسۂ مے لیجیے اس بزم میں اے ہم نشین
دورِ فلک سے کیا خبر پہنچے گا لب تک یا نہیں
یہ کاسۂ فیروزہ گوں ہے شیشہ بازِ پُر فنوں
جتنے چھل ہیں اور فسوں سب اس کے ہیں زیرِ نگیں
کل دامنِ صحرا میں ہم گزرے جو وقتِ صبح دم
اِک کاسۂ سر پُر الم آیا نظر اپنے وہیں
بولا بصد فریاد و فغاں کیا دیکھتا ہے او میاں
تھے ہم بھی سر بر آسماں گو اب پڑے زیرِ زمیں
گُل برگ سے نازک بدن سرو سے رشکِ چمن
زرّیں و سیمیں پیرہن دلکش مکانوں کے مکیں
دن رات نازو نعمتیں مہ طلعتوں سے صحبتیں
عیش و نشاط و عشرتیں ساقی قراں مطرب قریں
باغ و چمن پیشِ نظر بزمِ طرب شام و سحر
ہر سو بکثرت جلوہ گر حسنِ بتانِ نازنیں

اِک آسماں کے دور سے اِک گردشِ فی الفور سے
اب سوچیے گا غور سے در لحظہ آں در لمحہ ایں
سُنتے ہی کیا ٹھہرا گیا رُخسار پر اشک آگیا
دل عبرتوں سے چھا گیا خاطر ہوئی بس سہمگیں
اس میں سر اپنا ناگہاں ہر مو ہوا مثلِ زباں
بولا نظیرؔ آگہ ہو ہاں من نیز روزے ہمچنیں

تصانیفِ نثر پر رائے

فہم قرین:

دستور الصبیاں کی وضع کی ایک مختصر سی کتاب فن انشا میں ہے جس میں مبتدیوں کے لیے کچھ رقعات معمولی آسان عام فہم عبارت میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ گمان ہوسکتا تھا کہ شاید یہ اصلی رقعات ہوں لیکن اندرونی شہادت اس کے خلاف ہے۔ باپ کے نام جو رقعے ہیں ان میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "بھائی دہلی میں ہیں۔ ان کی لڑکی کی شادی ہے۔ لناچہ مجھے بھی بُلایا ہے۔ صراحتہً آپ کو بھی بُلاتے ہیں ——" (دیکھو رقعہ 9) دوسری جگہ لکھا ہے کہ "چھوٹے بھائی کی نسبت کے لیے جو روپیہ لیا گیا ہے اس کا سخت تقاضا ہے۔" (دیکھو رقعہ 10) دونوں جگہ بھائی کا مذکور ہے لیکن نظیرؔ کے بھائی کہاں؟ ایک رقعے میں کہ وہ بھی باپ ہی کے نام ہے لکھا ہے کہ "چار مہینے سے تنخواہ نہیں ملی۔ لالہ رام چند کے نام رقعہ جاتا ہے۔ چالیس روپے اس سے لے کر سرِدست کام چلائیے ——" (دیکھو رقعہ 11) ممکن ہے کہ نظیرؔ اپنے باپ کی زندگی میں نوکر ہو گئے ہوں لیکن نہ ان کو ان کی مدد کی حاجت نہ ان کو ضرورت خانہ داری سے اس کی صلاحیت —— رقعہ 26 میں کہ وہ ماں کے نام لکھا ہے کہ "ڈیڑھ سو روپے جاتے ہیں سو روپے بہن کی شادی میں صرف کیے جائیں۔ باقی اور امور میں۔" اور یہ معلوم ہے کہ جس طرح نظیرؔ کے بھائی نہ تھے بہنیں بھی نہ تھیں۔ غرض ان قرائن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رقعے ترہیتی اور فرضی ہیں۔

عبارت معمولی اور عام فہم ہے۔ کُل رقعے قلم برداشتہ بے فکر و رویّت لکھے گئے ہیں۔ صرف ایک رقعے (رقعہ 23) میں کسی قدر رنگینی ہے۔ یہ رقعے مرشد، باپ، چچا، خالو، ماموں، پھوپھا، بھائی، ماں کے نام ہیں۔

مقصود ان سے یہ ہے کہ مُبتدی طالب علموں کو معمولی خط و کتابت کا سلیقہ آ جائے۔ معمولی باتیں جو عموماً پیش آتی ہیں، مثلاً تلاشِ نسبت، تلاشِ روزگار، تقاضائے خرچ، ارسالِ زر، طلبِ خیریت، معذرت ان کے اظہار سے عاجز نہ رہیں۔ مختلف درجے کے رشتہ مندوں اور بُزرگوں کے آداب و القاب معلوم رہیں۔ خط کیوں کر شروع کرتے ہیں، کیوں کر ختم کرتے ہیں اور پھر بیچ میں تمہید مطالب کس عنوان سے ہوتی ہے یہ باتیں مشق ہو جائیں۔

نظیر کے لطائف

میاں نظیر کو پن گھٹ کا سین خاص طور پر مرغوب تھا۔ چنانچہ عالم پیری کے بیان میں ایک جگہ تاسف کے ساتھ ارشاد کرتے ہیں۔

پن گھٹ کو ہماری اگر اسواری گئی ہے
تو واں بھی لگی ساتھ یہی خواری گئی ہے
سنتے ہیں کہ کہتی ہوئی پنہاری گئی ہے
لو دیکھو بڑھاپے میں یہ مت ماری گئی ہے
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

سیر تو روز فرماتے تھے مگر ایک دن کچھ زندہ دل پنہاریوں کے جھرمٹ میں گھر گئے۔ سب نے مل کر کہا میاں صاحب ہم تو تم کو جانے نہ دیں گے جب تک کوئی شعر نہ سُنا دو۔ کوئی اور شرط کرتیں تو شاید انھیں دقّت بھی ہوتی۔ شعر تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چھوٹتے ہی ذہن میں آگیا۔ پنہاریوں سے کہا ذرا تم صف باندھ کر کھڑی ہو جاؤ تو میں سُناؤں۔ پنہاریاں ہنستی ہوئی کھڑی ہوگئیں۔ تب انھوں نے ایک مضحک شعر پڑھا۔ پہلے مصرعے پر ایک خاص تیور سے اپنے خاص حصّۂ جسم کی طرف اشارہ کیا اور دوسرے مصرعے کے ہر ٹکڑے پر ہر ایک پنہاری کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے جاتے تھے۔ آدھی تو پہلے ہی مصرع کو سُن کر چل دیں۔ باقی جو ذرا ڈھیٹ تھیں ان کو دوسرے مصرعے نے بھگایا۔ شعر ختم نہ ہوا تھا کہ سب جھینپ جھینپ کر گالی دیتی ہوئی بھاگیں وہ شعر یہ ہے ؎

جس وقت کھڑا ہوتا ہے یہ آ۔۔۔۔۔د
کہتا ہے اسے۔۔۔اسے۔۔۔اسے۔۔۔۔

لطیفہ نمبر 2 :

ڈپٹی تراب علی صاحب کی روایت ہے کہ ایک دفعہ جناب حکیم سیّد افتخار علی مرحوم جو

ڈپٹی صاحب موصوف کی برادری سے بہت نامی ذی علم اور راجہ صاحب بھرت پور کے طبیب اور موضع سید پورہ کے جاگیردار تھے، آگرے میں تشریف لائے اور میاں نظیرؔ مرحوم کی ملاقات کو گئے۔ باہمدگر بہت اخلاق کی باتیں رہیں۔ آخر کو چلتے وقت حکیم صاحب ممدوح نے فرمایا کہ میاں صاحب آپ نظیرؔ کیا بلکہ بے نظیرؔ ہیں۔ جواب میں مسکرا کر فرمانے لگے کہ بے نظیرؔ فرمائیے خواہ لے نظیرؔ —— یہ لطیفہ ہو کر دونوں صاحب خوشی بخوشی جدا ہوئے۔

لطیفہ نمبر 3 :

یہ بھی ڈپٹی صاحب ہی کی روایت ہے کہ میاں صاحب بڑے پرہیزگار تھے مگر لوگوں کے خوش کرنے کو بعض مرتبہ مضحکے کو کوئی بات فرما دیتے تھے۔ جیسے کسی نے پوچھا کہ میاں صاحب آپ لبیں نہیں لواتے۔ فرمایا کبھی صافہ بھنگ کا نہیں ہوتا تو بے چھنی ہوئی بھی ان کی آڑ میں پی لی جاتی ہے۔

نظیر کے صنائع

باطنؔ جہاں نظیرؔ کے کلام کی قسمیں گنواتے ہیں وہیں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ نظیرؔ نے اپنے مختلف الاقسام کلام میں کل صنعتیں شاعری کی ختم کی ہیں۔ یہ ایک مجمل جملہ ہے جس کی تفصیل بہت تطویل چاہتی ہے۔ باطنؔ کے زمانے میں شاید لال بجھکڑ بکثرت تھے جو ایسے ہر نقشِ قدم میں آہوے مضمون کو پانو میں چکی باندھ کر چوکڑیاں بھرتے دیکھتے تھے۔ اب کوزوں میں دریا بند کرنے کے دن گئے۔ ع

آں قدح بشکست واں ساقی نہ ماند

اب تو ضرورت ہے کہ قطرے کو دریا بنائیں اور دریا جو کوزوں میں بند ہیں ان کو جگمگاتی لہروں کی زر میں اور اچھلتے کودتے مینڈھوں کے خود پہنا کر عقل کی چوٹی سے فہم کے دامن تک پہنچائیں۔ کُل صنعتیں شاعری کی ختم کیں۔ اس کے ایک معنی تو ہو سکتے ہیں کہ جتنی صنعتیں شاعری میں متداول ہیں ان سب کا برتاؤ اعلا وجہ الکمال کیا۔ دوسرے معنی یہ کہ مثالیں ہر صنعت کی کلام میں موجود ہیں گو بعض کم ہیں بعض زیادہ۔ اگر کُل کو معنی میں اکثر کے لے لیں۔

واللہ کُشر حکم الکل

تو تیسرے معنی یہ کہ گو بعض صنائع متروک بھی ہوں مگر اکثر موجود ہیں۔

نظیرؔ کو شاعری میں، میں نے جو کیرکٹر دیا ہے اس کے لحاظ سے یہ بالکل خلاف ہے کہ ان تینوں معنوں سے کسی ایک معنی میں بھی یہ جملہ اس کے کلام پر صادق ہو۔ میں نے جہاں تک اس کا کلام دیکھا ہے اور اس کے صنائع لفظی و معنوی پر غور کی ہے۔ کہیں بھی اس کا اہتمام نہیں پایا جاتا ہے کہ وہ کسی خاص صنعت کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ وہ از روئے اپنے اصول کے اس کو ایک بیہودہ بات جانتا تھا کہ خواہ مخواہ صنائع کا برتاؤ کیا جائے۔ وہ معانی اور خیالات میں اس قدر منہمک ہے کہ بعض اوقات وہ غزل کے قواعدِ زبان کا پابند نہیں رہتا۔ صنائع تو امرِ آخر ہے، مگر شعراء کی انجمن میں جاتا تھا۔ گو خود انکسار سے نہ سمجھتا ہو مگر لوگ اکثر جلسوں میں اس کو صدر انجمن خیال کرتے تھے۔ شاگرد لوگوں کی چوٹیں سُن کر فریاد کناں آتے تھے۔ آدمی ہی تو تھا خود بھی کبھی غیرت جوش میں آجاتی تھی۔ غرض ان اسباب

سے کبھی کبھی اس کو اپنے کلام کو صنائع کے زیور سے آراستہ کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے خیال کا اتنا پکّا تھا کہ ضرورت سے زیادہ اس نمائش و نمود کا سامان نہ کرتا تھا اور جس قدر سامان کرتا وہ اس قدر کم اور غیر قابل اعتبار ہوتا کہ کسی کو خبر ہوتی کسی کو نہ ہوتی۔ اس کے کلام کے صنائع سے آراستہ ہونے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی نازنین فرنگ کانوں میں کوئی زمرّد کا آویزہ لٹکائے یا گلے میں ہیرے کا نیکلس پہن لے یا ہاتھوں میں سونے کے کڑے ڈال لے۔ حُسنِ ذاتی کو ہجوم زینت سے ڈھالکا نہیں جاتا بلکہ موقع کی آرائش سے مختصر مفید مطلب طور پر چمکایا جاتا ہے۔

غزلوں کی بحث میں لکھ آیا ہوں کہ اس نے ایک غزل صنعتِ واسع الشفتّین میں لکھی ہے۔ کہا نہ جائے تو شاید پڑھنے والے کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئے کہ اس میں کوئی صنعت ہے۔ ذرا سا تھیوا[1] مختصر سا حلقہ حُسن کی بدولت نازنین نمائش سے مستغنی۔ آپ کو کیا خبر انگوٹھی کس اُنگلی میں پڑی ہے۔ اس غزل کے برعکس غزل نمبر 5 ہے دیوالی کے بیان میں جس کا مطلع ہے:۔

دوستو کیا کیا دیوالی میں نشاط و عیش ہے
سب مُہیّا ہے جو اس ہنگام کے شایاں ہے شے

اس میں ہر شعر میں بلکہ ہر مصرع میں ایک نہ ایک حرف شفوی موجود ہے۔

ہنس نامے سے زیادہ نظیرؔ کی کوئی نظم مشہور نہیں مگر شاید یہ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ اس میں ترک حروف کے متعلق یہ ایک خاص صنعت ہے کہ شروع سے آخر تک ث اور ظ کا کہیں پتہ نہیں۔ اور پھر اس پر نظم اس قدر بے تکلف کہ کہیں آورد کی ہوا بھی تو نہیں لگتی۔

غزلیں بھی بہت سی ایسی دکھادی جاسکتی ہیں جن میں بجنسہا یہی صنعت موجود ہیں مگر مثالیں بڑھانے سے کیا فائدہ خصوصاً جب کہ ترک حرف کوئی بہت بڑی صنعت نہیں، اور اگر ہو بھی تو محض لفظی ہے۔ اختیار حرف کی مثال میں یوں تو ہر غزل پیش کی جاسکتی ہے کہ حرف آخر ردیف سے کوئی شعر خالی نہیں۔ اصل مثال وہ ہے کہ جس میں اس صنعت سے کوئی لُطف خاص بھی پیدا ہو مثلاً نسبت والی نویں دسویں غزل جن میں سین اور دوسرے حروف صفیرین ہر شعر میں بکثرت اور بالالتزام موجود ہیں۔ اور نسبت کا سہانا سماں سلسلۂ صفیرین دکھا رہے ہیں۔ یا یہ مصرع پلکوں کی جھپک دکھلا دل چھل لیا اک پل میں، جس میں بجلی کے حروف بجلی چمکا رہے ہیں صنائع معنوی میں ابہام حضرت امیر خسرو کو بہت پسند تھا اور نثر میں وہ نسبت یعنی رعایت بدرجہ کمال ملحوظ رکھتے تھے۔ رعایت لفظی میں دجو

---

[1] انگوٹھی کا نگینہ

دوسرا نام تلازمے کا ہے، ضمن اللفظ بھی داخل ہے ــــ ایہام اور رعایت لفظی کے ملنے سے ضلع جگت پیدا ہو جو آج تک جیتا جاگتا ہے ــــ شعرا طبقہ اوّل و دوم میں اس کا بہت چلن تھا اور چوں کہ نظیر بھی داخل متقدمین ہے، کہیں کہیں اس سکے کو وہ بھی رائج کرتا ہے ــــ زبانی ضلع جگت کی مثالیں اس سے کہیں زیادہ ہوں گی جو کتابوں میں ہیں مگر ہمارے ڈاکٹر جانسن کے لیے باسویل کہاں سے آتے۔ ہارے درجے ورق گردانی قائم مقامی کرتی ہے اور اوسوں پیاس بجھاتی ہے۔

پیش جاتی نہیں ہرگز کوئی تدبیر نظیر
کام جب آن کے پڑتا ہے زبردستوں سے
ایک عالم کو ہکن کی طرح سر پھوڑے گا اب
گر اسی صورت رہی شیریں زبانی آپ کی

حسن بازار نظیر کی ایک کتاب ہے۔ اُس میں بزاز کی صفت میں کچھ فقرے اُس نے لکھے ہیں۔ ضلع جگت کی بانگی دکھانے کو کچھ بُرے نہیں ــــ

نشقن بزاز در کان بحسن ممتاز و بر جامہ زیبی خود در ناز اقسام اقمشہ چیدۂ بلباس پسندیدہ از تن زیب فزا و برشک گل بدن زینت شبنم نما طرز رمز فہمی چنانکہ مائل باریک بافتہ[1] و طور رنگیں بیانی ہماں کہ خواہندۂ تافتہ[2] رُخ نہ از بہا تافتہ نوع شیریں ازیں بکثرت مطلوب کہ بخندد وار ز خاصہ[3] ازاں بخوبی محبوب کے نرنجد گز بہر گرہ از پیمایش گز نیہ درحاز واز ہیمون پرنیاں منقش و دیبائے زرکش بے قرار، رتبہ تر اندام بلطف اندام نزاکت انتما و قدر مخمل بملایمت کف پا، از لیز نگی ناز و ادا جو لی جنس دو رو، و بہ نرمی تکلم دل ربا گرمی خرید شال مو بمو زیبالی میاں ایں چنیں کہ از کشاد بستہ کمر زریں میان کاغذ زود نشیں و اظہار قیمت دارائی[4] باں دل آرائی کہ بہر قسم فرحت قریں مدعائے اطلس[5] گرفتہ از نگہداری زربفت و قفہ گزینی و مطلب بیلام خریدہ بتوصیف

---

[1] بافتہ ایک قسم کا ریشمی کپڑا۔ (ش)

[2] تافتہ ایک قسم کا ریشمی چمک دار کپڑا۔ (ش)

[3] خاصہ ایک قسم کے کپڑے کا نام جو سفید سوت کا ہوتا ہے متوسط کپڑا۔ (ش)

[4] دارائی ایک قسم کا ریشمی کپڑا جسے اردو میں دریائی کہتے ہیں ساٹن۔ فالس لکھتا ہے ایک سرخ ریشمی کپڑا۔ (ش)

[5] اطلس ایک قسم کا ریشمی کپڑا جیسے ساٹن وغیرہ۔ (ش)

کہ درنشینی، بحسن تقریر طلب حریر متجاوز التحریر و بمشاہدۂ آں خواہش افزائش پزیر، متاع بے پردہ بالمشافہہ بہتر بود در پردہ تماشا تے دیگر۔۔۔۔

تقریر کیا ہے خاصی بزاز کی دکان ہے ۔۔۔ تن زیب، گل بدن، شبنم، بافتہ، تافتہ، شیریں، خاصہ گزی، گاڑہا، دیبا، تراندام، مخمل، دورو دگورخا، شال، ٹپکا، دلائی، اطلس، پیلام، حریر، الوان سبھی موجود۔۔۔ پھر اس پردے میں مشاہدہ بھی ہو رہا ہے۔ خریداروں کا کیوں اسی ایک دکان پر ہجوم ہے۔ جو خرید چکے ہیں وہ جلد ٹلتے کیوں نہیں ۔۔۔ خواہ مخواہ قیمت دینے میں کیوں دیر لگا رہے ہیں۔ چیز جب خرید چکے تو اب بیٹھ کر اس کی گھنٹوں خوبیاں جتانے سے حاصل۔

نظیر کے باغ طبع سے ایک جگہ کچھ پھل پھول بھی جمع کر دیے گئے ہیں ۔۔۔ رعایت لفظی کی بہت مثالیں وہاں بھی ملیں گی۔ بیر کی تعریف میں نزاکتِ بے ریا۔ آموں کی رسید میں اشفاقِ عام، طبع نیاز رس۔

پتنگ کی رسید میں بھی صنعت نے لفاظی دکھائی ہے۔ عبارت کے کنکوے نے ضلع جگت سے دریائی پائی ہے، خالی از تفریح نہیں اس لیے میں بھی ڈھیل دیتا ہوں۔

زِ حُسنِ پتنگ اے رعایت پسند   پری خانہ شد خانۂ خاطرم

بلطف پتنگ دوباز از پرواز ہوش دل بوفور سرور گُلاہ بہوا انداخت، وطائرِ شوق با بنساط موفور چوں کاغذ باد دربال کشائی پرداخت، شوخی روئے ہوائش پری رابرخصت کار پرواز وارتباط قیام مائل گرداند و سرعت چپ وراست گردشِ چشم بتاں را تماشا رساند طرز بالاروی دل ربائی بالا بالا بغمزۂ نازنیاں آموز دواز یہی حال اس نظم کا بھی ہم جس میں کنکوے اور پتنگ تعریف کی ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ (دیکھو کلیات)

لفظی صنائع میں تجنیس بھی ایک بڑی چیز ہی اور موقع سے بعض وقت اس کا استعمال خالی از لطف نہیں۔ مگر از بس کہ کثیر الاستعمال ہے۔ اس کا وجود کوئی بڑے فخر و امتیاز کی بات نہیں۔ جس طرح اور شعراء کے کلام میں اس صنعت کا وجود ہے نظیر کو اس کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔

مثالیں

پیتے تھے لسا بسا پھولوں میں ہم بسا بسا

شوخ بغل میں ناز سے کھولے تھا زلفیں کالیاں
جوش ہو گلے لپٹ لپٹ دیتا تھا میٹھی گالیاں
جو آج دیوے گا یہاں ویسا ہی وہ کل پاوے گا
کل دیوے گا کل پاوے گا، کلپاتے گا کل پاتے گا
چپ کے بھی وصف کرنے میں چپکا رہوں میں کیا
شرمندہ ہو کبوتر چپ جس سے دائما

الٹریشن ایک شعبہ تجنیس کا ہے۔ تجنیس تام میں تمام حالتیں یکساں ہوتی ہیں۔ اس میں فقط اوّل حرف یکساں ہوتا ہے لہٰذا اگر اس کو تجنیس الرؤس کہیں تو کچھ بے جا نہیں۔ جس طرح انگریزی ادب کو ترقی ہو رہی ہے، عجب نہیں کہ تھوڑے دنوں میں یہ داخل صنائع مروّجہ ہو جاتے۔

قافیہ جس میں حرف آخر کی رعایت ملحوظ رہتی تھی، اب رفتہ رفتہ اٹھتا جا رہا ہے عبارت میں انگریزی شان پیدا ہو رہی ہے۔ لامحالہ اسی کی طرح رؤس الفاظ کو تاج صنائع پہنائے جائیں گے۔ عربی کی تو نہیں کہہ سکتا، مگر قافیہ فارسی میں بھی ایک امر تکلفی تھا۔ قافیہ سے پیشتر اس زبان میں الٹریشن کا فطری قانون کثرت سے متحد الرؤس دو لفظوں کا جوڑا ملا کر فصاحت کا ایک پائیدار نتیجہ پیدا کیا کرتا تھا جیسے ہوش و ہنگ نام و ننگ مہر و ماہ خیمہ و خرگاہ شاخ و شانہ چک و چانہ ڈھونڈو گے تو اس قسم کے لفظی جوڑے فارسی میں بہت ملیں گے۔ اردو کی بھی بھی ان جوڑوں سے خالی نہیں۔ گالی گلوچ ڈھول ڈھپا، جھک جھوری، چھیڑ چھاڑ، چھیل چھبیلی، رنگ رنگیلی، گانٹھ گٹھیلی، یہ جوڑے آخر نظیر کی نظر سے گذرتے تھے، اور گزرتے تھے تو آخر اپنی زیب و زینت بھی ثابت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ہم اس کے کلام میں بھی اس قسم کی مثالیں پاتے ہیں۔

خد و خال خوبی آگیں لب لعل پان سے رنگیں
نظر آفت دل و دیں مژہ صد حضرت افزا
مکتب کے بیچ گل کی طرح سے کھلے رہے
ناز و نیاز کیا ہی گھلے اور ملے رہے

کچھ بس سکا نہ جب تو ہوئی ان کو بے بسی
چھٹ پن کی تھی جو چاہ تو ہرگز نہ چھٹ سکی
لوگوں میں چرچے ہونے لگے اس کے ہر گھڑی
لچاہت کی گل کی بو نہ رہی آخرش چھپی
کثرت میں عشق تھا جو بت گل عذار کا
اک جوشش تھا جنوں کے چمن کی بہار کا
تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی
رات دن شمس وقمر شام وشفق روشن ہوتے
روکھی ہی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد شیر

میں نے موسیقی کی بحث میں دکھایا ہے کہ نظیر کا مذاق موسیقی کس قدر لطیف تھا اور اس اعتبار سے اس کا کان کیسا سچا اور اس میں ڈوبا ہوا تھا۔ جہاں کہیں آواز سے اثر پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے وہ بہت کامیاب ہوتا ہے۔ اس کا اس قسم کا کلام پڑھیے تو ختم کلام پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ابھی ستار بجا کر ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ گوگت بج کر موقوف ہوگئی مگر زمزمے کانوں میں ہنوز گونج رہے ہیں۔ موسم برسات کے بیان میں صفحہ 32 پر جو نظم اس کی ہے۔ اسی وضع کی ہے۔ بلکہ یہی کیوں اس کے قبل اور بعد چاندنی رات اور جام بہار کے بیان میں جو دو نظمیں ہیں ان میں بھی یہی لطف ہے۔ ان تینوں نظموں میں طور عکس ورزی آمد تیر پرتابی حسرت اندوزد اگر پیش کشی بسماجت نپر وازد بکنگ تا رشعاعی زیب خورشید آہنگ معانقہ سازو بقطع تکل حریفان چناں تیز روکہ شاہین بشکار کبکاں واز ہیبت دہر اس آں کنکوہ وچچکہ نحوی گریزاں کہ زاغ وزغن از تیر وکماں پروانہ بہناحی از گرجی نشاط خنداں وپیچک رستہ بسبب لازمی رشتۂ خود بگوے ماہ رسان۔

(قدر متین رقمہ 29)

نظیر کے سلیقۂ موسیقی نے بغیر مخصوص طور پر کثرت سے الیٹریشن کی رعایت کی ہے۔ جن صاحبوں کو لطف اٹھانا مقصود ہو کلیات اٹھا کر دیکھ لیں۔ میں یہاں صرف ایک بند پر اکتفا کرتا ہوں۔

روز مرّوں سے رات کو برسے تھا مینھ جھمک جھمک
بوندیں پڑیں ٹپک ٹپک پانی پڑے چھپک چھپک
جام رہے چھلک چھلک شیشہ رہے بھبک بھبک
یار بغل میں بانمک عیش و طرب تھے بے دھڑک
ہم بھی نشوں میں خوب چھک لوٹتے تھے بہک بہک
کیا ہی سماں تھا عیش کا اتنے میں آہ یک بیک

ابر کھلا ہوا گھٹی بوندیں تھمیں سحر ہوئی
پہلو سے یار اٹھ گیا سب وہ بہار بہ گئی

یہ فقط الٹریشن کی مثالیں ہیں۔ الٹریشن کے علاوہ اس میں صنعتِ تسجیع بھی ہے صنعتِ تکرار بھی پھر سلیقہ شاعرانہ نے بہت سے الفاظ یہاں ایسے بھی جمع کر دیے ہیں جو الفاظ نہیں ہیں بلکہ روزمرے ہیں۔ فصاحت کے شرارے بلاغت کے چمکارے[1] الٹریشن کی مثال وہ بھی خاصی ہے جس میں چڑیاں پڑی چہک رہی ہیں۔

وقت سحر کی روحیں کیا کیا ہُوں ہُوں ہُوں ہُوں کرتی ہیں
ہُوں ہُوں ہُوں ہُوں کر کر ذکر کن اور فیکوں کرتی ہیں
مُرغے بولے ککڑوں کوں کوں مُرغیاں کوں کوں کرتی ہیں
طوطیاں بھی سب یاد میں اُس کی بھتوں بھتوں کرتی ہیں
سانجھ سویرے چڑیا مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں

اس عارفانہ مثال نے ایک مضحک مثال بھی یاد دلائی۔

صبح جب بول اٹھا مُرغ سحر ککڑوں کوں
اٹھ گئے پاس سے وہ رہ گیا میں ٹُٹڑوں ٹوں

---

[1] کہیں انھی لفظوں کو میں نے الفاظِ شاعرانہ قرار دیا ہے یعنی وہ الفاظ جن میں مشکل مفاہیم شاعرانہ بند ہیں۔ واضع نے ان کو وضع نہیں کیا بلکہ فطرت نے شاعری کی ہے۔ (ش)

صنائع معنوی کا پھاٹک تشبیہ ہے اور قلعہ استعارہ — الیگری[1] اسی قلعے کی ایک آرٹ گیلری ہے جس میں رمز اور تمثیل کے بہت سے خیال کو بلندی اور اخلاق کو پاکیزگی دینے والی تصویریں خوش نما اور مطلا لفظی چوکھٹوں میں شیشۂ معنی سے جلوہ گر ہوتی ہیں —

لوگوں کو تعجب ہوگا کہ نظیر انگریزی تو جانتا نہ تھا، پھر اُس نے انگریزی صنائع کی رعایت کی تو کیوں کر کی۔ یہ صحیح ہے لیکن آخر وہ اپنے ہاں کے قواعد بدیع سے تو واقف تھا۔ فن بدیع نے اس کو ایک پاس دے رکھا تھا جس کے ذریعے سے وہ کبھی کبھی اُس خیالی قلعے میں آیا جایا کرتا تھا۔ کسی دن اُس گیلری کی طرف بھی جا نکلا۔ الیگری کا لفظ گو ہماری زبان میں رائج نہیں، نہ اس کا کوئی مترادف لفظ۔ مگر پھر بھی عملاً اِس کے معنی سے ہمارے ہاں کے اساتذہ فارس و عرب واقف نظر آتے ہیں — مولینا ئے رومی کی مثنوی میں الیگری کی بہت مثالیں ہیں۔ جب تک استعارہ لفظوں میں محدود ہے استعارہ ہے، جب لفظوں سے گزر کر پورے مضمون پر پھیل گیا تو وہی الیگری ہے، جس کو تمثیل رمز مجاز جس لفظ سے چاہیے تعبیر کر لیجیے۔ نظیر کی نظموں میں یہ چند نظمیں کھلی کھلی الیگری ہیں۔

ہنس نامہ، آندھی، چوہوں کا اچار، آئینہ، کورا برتن، ریچھ کا بچہ، بھنگ، اژدہے کا بچہ۔

ہنس اصل میں عبارت ہے رُوح سے۔ جس شہر سے آیا تھا اُسے عالم اطلاق سمجھیے۔ صحرا سے عالم تعین مراد ہے۔ پیڑ قالب انسانی ہے — طیور جو اِس پیڑ پر رہتے تھے ان سے یا تو تمام افراد مشارک فی النوع مراد ہیں یا جسمانی قوائے۔ قصدِ سفر سے ظہور آثار پیری اور پیام اجل مراد ہے۔ سفر موت ہے۔ پہلی منزل قبر۔

آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا۔ حسن القطع کی ایک عمدہ مثال پیش کرتا ہے اور سعدی کے اس قصیدے کو بڑے زور سے یاد دلاتا ہے۔ جو یوں شروع ہوتا ہے۔

روزے کے زیر خاک تنِ ماں نہاں شود

چوہوں کے اچار میں الیگری کا چٹخارا سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ مگر خدا نے جن کو مذاق سلیم عطا کیا ہے وہ غالباً بیان سے بیشتر مزہ لے رہے ہوں گے۔ اگر دنیا کو شہر فرض کریں اور اس

---

[1] وہ قصہ یا مضمون جس میں صریح اور لفظی معنے اصلی و مقصود بالذات نہ ہوں، بلکہ معنیِ اصلی و مقصود بالذات لطافت اور قوت کے لیے تشبیہ و تمثیل کے پیرائے میں بیان ہوئے ہوں۔ (ش)

میں جو لوگ مصروف معاملات ہیں، اُن کو خوانچے والا تو اکثر حالتوں میں یہ بات ثابت ہوگی کہ ان کو بحث حلال و حرام مطلق نہیں۔ بلکہ باوجودیکہ تمام قسم کے جعل و فریب دغابازیاں، مکاریاں ہر معاملے میں شریک ہیں مگر ہر شخص اپنی شے کی تعریف کر رہا ہے اور ہر ایک شخص کو اسی کی چاٹ دلا رہا ہے — وکیل سے لے کر ذلیل مختار تک اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے لے کر ادنا جج تک اور پارلیمنٹ کے اعلا ممبر سے لے کر بے شعور ووزیر تک اور کمانڈران چیف سے لے کر ادنا سولجر تک خلاصہ یہ کہ تمام اعلا وادنا ، جو منہمک فی الدنیا ہیں دین و مذہب فقط ان کی نوک زبان پر ہے، ورنہ دل میں ہر قسم کی بے ایمانیاں بھر رہی ہیں۔ اسی قسم کے ایک بے نظیر پکّے دنیا دار کی نظیر نے آپ اپنے تئیں ایک مضحک خوانچے والا بنا کر دھجیاں اڑاتی ہیں۔

نظیر کے اچار کے مصالح قریب قریب وہی ہیں جو شیکسپیر کے تین مشہور جادو گروں کے میکبتھ میں ایک ترک کی زبان تو نہیں ہے اور وہ ایک ترک کی زبان سے ہو بھی نہیں سکتی تھی ورنہ سبھی کچھ ہے۔

چوہے، گھوس، چھچھوندر، چھپکلی، مینڈک، کچھوے، بچھو، کالے ناگ، مکڑیاں، مکھیاں، جوئیں، لیکھ، مچھر، پسو، کھٹمل، دیمک، چیونٹی، چمگادڑ، ابابیل کی بیٹ، اُلّو کے پر، گدھ کی پشم، کوؤں کے سر، چیل کی آنتیں، گوبر کی ڈلی، مہری کی کیچڑ، غور کر کے دیکھیے تو یہ مصالح نہیں ہیں مگر حرام کی تمام چھوٹی بڑی قسمیں۔

بند ذیل میں چالیس برس کی قید ایک گہرے مشاہدے کو دکھاتی ہے۔ واقعی جب تک اس عمر کو نہیں پہنچتا آدمی پکّا دنیادار نہیں ہوتا ——

اوّل تو چوہے چھانٹے ہوتے قد کے بڑے ہیں
اور سیر سوا سیر کے مینڈک بھی پڑے ہیں
چکھ دیکھ مرے یار یہ اب کیسے کڑے ہیں
چالیس برس گزرے ہیں تب ایسے سڑے ہیں
کیا زور مزے دار ہے اچار چوہوں کا

بند ذیل اس مضمون کی ایک مثال ہے کہ حرام میں بڑی رونق ہے اور لوگوں کو اس طرف شدت سے رغبت۔ جعل سازوں دغابازوں کے گھر مینہ پڑا ہن برس رہا ہے اور دیانت دار کوڑیوں کو محتاج۔

آگے تھے کتی اب تو ہمیں اک ہیں چوہے مار
مدّت سے ہمارا ہے اس آچار کا بیوپار
گلیوں میں ہمیں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں خریدار
برسے ہے پڑی کوڑی رو پے پیسوں کی بوچھار
کیا زور مزے دار ہے آچار چوہوں کا

جس طرز بیان پر یہ نظم مبنی ہے اس کو انگریزی میں آئرنی اور عربی میں تعریض کہتے ہیں۔ تعریض کی تلخی کو کچھ تو بات کو ہنسی میں ڈال کر اڑا دیا ہے کچھ اس طور پر کے ساری ملامت اپنے سر لے لی ہے۔

روزی تو ہماری یہ اتاری ہے خدا نے
دن رات پڑے ہم کو یہ آچار بنانے
اور پیٹ کے بھی واسطے دو پیسے کمانے
لذّت کو نظیر اس کو جو کھاوے سو ہی جانے

آندھی کی رمز بہت روشن ہے — آندھی سے مراد ہے۔حرص و ہوا کا زور، دنیا وی لالچوں اور لذّتوں کا شور۔جن لوگوں کے نفس صالح ہیں گو اوّل وہلہ[1] میں فطری کم زوری کے سبب ان کا دل بھی کسی قدر ڈانوا ڈول ہوتا مگر آخر وہ حرص و ہوا پر غالب آتے ہیں اور قناعت کے بالاخانے میں شاہد صدق وصفا سے ہم کنار ہوتے ہیں۔رقیبوں سے شیاطین مراد ہیں یا اخوان الشیاطین۔

نظیر آندھی میں کہتے ہیں کہ اکثر دلیو ہوتے ہیں
میاں ہم کو تو لے جاتی ہیں پریاں گھیر آندھی میں

کورا برتن اصل میں وہ قلب صافی ہے جس کو گناہوں کی ہوا نہ لگی ہو اور صلاحیت ازلی لے کر آیا ہو۔پانی کی بوند عبارت ہے بادۂ محبت الٰہی سے اور پنہاری مرشد کامل سے۔

خاک سے جب کہ ان کو گڑھتے ہیں
بندگی سے یہ اپنی بڑھتے ہیں

---

[1] وہلہ پہلی مرتبہ (م)

کوروں پر پھول ہار چڑھتے ہیں
حورو غلماں درود پڑھتے ہیں

تازگی جی کی اور تری تن کی ـــــــ الخ

بندِ ذیل کا چوتھا مصرعہ شاہد ہے کہ یہ محض کورے برتن کی تعریف نہیں ہے، بلکہ پیرائے رمز میں انسانِ خاکی سرشت کی ازلی آب وتاب دکھاتی ہے۔

جس صراحی میں سرد پانی ہے
موتی کی آب پانی پانی ہے
زندگی کی یہی نشانی ہے
دوستو یہ بھی بات پانی ہے

تازگی جی کی اور تری تن کی ـــــــ الخ

ریچھ کا بچہ اصل میں نفس شریر انسانی ہے اور قلندر انسان۔ اس کی تعلیم سے مراد ہے ریاضتِ نفس۔ بندر سے مراد ہے عالمِ طفولت جس میں قوت تقلید بڑھی ہوتی ہوتی ہے۔ ہاں چھوڑ دیا بابا انھیں جنگل کے اندر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایامِ طفولت گزر گئے۔ بےفکری کے دن گئے۔ جواب دہی کے دن آئے۔ نفسِ شریر کو اب رام کرنا چاہیے۔ جب نفسِ شریر کی تعلیم پوری ہوجاتی ہے اور زیورِ صدق وصلاح سے آراستہ ہوتا ہے تو خلایق خواہ مخواہ جھکتی ہے اور اظہارِ عقیدت وگرویدگی کرتی ہے پھر نذور وفتوح کی کچھ کمی نہیں رہتی۔

یوں تو پڑتے روپے پیسے کہ آندھی میں گویا بیر
سب نقد ہوتے آکے سوا لاکھ روپے ڈھیر

ذیل کے بند میں نہایت گہرا صوفیانہ نکتہ ہے کہ ہرچند کوئی کتنا ہی بڑا مرتاض زاہد کیوں نہ ہو مگر نفس کی مخالفت اخیر عمر تک جاری رہتی ہے۔ پس پکا اور سچا صوفی وہی ہے جو کسی وقت اُس کے حملوں سے غافل نہ رہے۔

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا
للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اُسے گہ اس نے پچھاڑا
اک ڈیڑھ پہر ہوگیا کشتی کا اکھاڑا
پر ہم بھی نہ ہارے نہ تھکا ریچھ کا بچا

اژدہے کے بچے سے نفسِ زاہدِ ریائی مراد ہے اور اس کے بیچنے سے تعلیم روحانی کی اشاعت کی آڑ میں کسب دینا۔ پرانے اژدہے سے وہ نفس مراد ہے جس نے خالصاً لوجہ اللہ ریاضت کی ہو اور درجۂ کمال کو پہنچا ہو۔ ایسے لوگوں کے پاس سچائی کی وجہ سے یقیناً لوگوں کا ہجوم رہتا ہے، اور چونکہ روپے پیسوں کی انھیں پروا نہیں ہوتی۔ روپے پیسے کیا دن رات جواہرات برستے ہیں، لیکن یہ مقام مزلتہ الاقدام ہے۔ اکثر نفوس رجوعِ خلائق سے فریب میں آجاتے ہیں شیطان تو ہر وقت تاک ہی میں بیٹھا ہوا ہے۔ موقع پاکر اس طرح پٹخ دیتا ہے کہ عمر بھر کو کنوٹے[1] سے ہو جاتے ہیں۔ مرد وہی ہے جو ہر حال میں خدا پر نظر رکھے۔ کیوں کہ رجوعِ خلق سے گو دنیا میں عروج ہو وہ عروج چند روزہ ہے۔ اصل عروج وہی ہے جو اس جہان میں سر بلندی دے۔

اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا
سچ ہے نظیرؔ آخر اجگر کے رام داتا

آئینے کی جوانی کی بحث میں شرح ہو چکی ہے، رہ گئی بھنگ۔ میرے نزدیک اِس سبزی میں حافظ شیراز کے بادہ ارغوانی کی سرخی جھلکتی ہے۔ بھنگ کی تعریف میں ایک نہیں تین تین نظمیں ہیں مگر جس نظم کو پڑھ جائیے باوجود بندش کی رندانہ آزادی اور بھارت کی قلندرانہ لفاظی کے اس میں معرفت کی کیفیت چھائی ہوئی ہوگی۔

پہلی نظم:

پی عاشقوں میں آکر دو بھنگ کے پیالے
جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے پھیر ہالے

یعنی صوفیوں کی بزم میں نشہ معرفت سے سرشار ہو پھر دیکھ یہ دنیا جس کو تو اپنا گھر سمجھ رہا ہے اور جس میں تیری غفلت نے چھاونی چھا رکھی ہے کس طرح متزلزل نظر آتی ہے۔

گر دیکھنے ہیں تجھ کو کچھ عیش کے جھڑاکے
تو جھاڑ اپنے پنجے اور سر کو جھڑجھڑا کے
پی عاشقوں میں آکر دو بھنگ کے پیالے

---

[1] شرمندہ۔ ذلیل۔ (م)

یعنی دنیا سے آستین جھاڑ اور عاقبت کا ہوش کر

دوسری نظم کا پہلا ہی مصرعہ ہے۔

کیوں عبث بیٹھا ہے ڈالے کان میں غفلت کا تیل

گویا غفلت جو امورِ دین کی طرف سے لوگوں میں عام ہے اس سے چونکاتا ہے اور کہتا ہے آنکھیں کھول اور عرفان کے اکھاڑے میں ذرا پھیر دیکھ کیا کیا قدرت کے کھیل نظر آتے ہیں۔

کونڈی ٹھنکے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

خضر جن کی تصویر بند ذیل میں ہے اور جو بنگ پینے کی ہدایت کرتے ہیں یقیناً مرشد کامل ہیں۔

کل مجھے دریا اُپر خواجہ خضر جو مل گئے
سبز پیراہن گلے میں ہاتھ میں اعصا لیے
کم خوراک اور ناتوانی کے گلے جب میں کیے
تب تو وہ منہ دیکھ میرا ہنس کے یوں کہنے لگے
کونڈی ٹھنکے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل

اس کے بعد جتنے بند ہیں سب فقر کے رنگ میں ڈوبے ہیں، یہاں تک کہ خاتمہ اس مصرعہ پر ہے۔

یہ وہ سبزی ہے جسے پیتے ہیں یاں آکر فقیر

تیسری اور آخری نظم کا پہلا ہی مصرعہ یہ ہے۔

دنیا کے امیروں میں یاں کس کا رہا ڈنکا

پہلی نظم کی طرح عاشق کا اس میں بھی شروع ہی سے ذکر ہے۔

کونڈی کے نقارے پر ٹھنکے کا لگا ڈنکا[1]
نت بھنگ پی اور عاشق دن رات بجا ڈنکا

---

[1] چوب۔ نقارہ بجانے کی لکڑی، نقارہ، دھونسا۔ (ش)

بند تو اس نظم میں یہ لکھا ہے ـــــ واقعی زمرد کا ٹکڑا ہے۔

الفت کے زمرد کے یہ کھیت کی بوٹی ہے
پتوں کی چمک اس کے کمخاب کی بوٹی ہے
منہ جس کے لگی اُس سے پھر کا ہے کو چھوٹی ہے
یہ تان ٹکورے[1] کی اِس بات پہ ٹوٹی ہے
کونڈی کے نقارے پہ خنکے کا لگا ڈنکا ـ الخ

فقیر کی مستی کا سماں ذیل کے بند میں چھایا ہوا ہے۔

ہیں مست وہی پورے جو کونڈی کے اندر ہیں
دل ان کے بڑے دریا جی ان کے سمندر ہیں
بیٹھے ہیں صنم بت ہو اور جھومتے مندر ہیں
کہتے ہیں یہی ہنس ہنس عاشق جو قلندر ہیں
کونڈی کے نقارے پہ خنکے کا لگا ڈنکا ـــ الخ

پرسونیفکیشن استعارہ بالکنایہ کی ایک قسم ہے جس کو استعارہ بالتشخص کہہ سکتے ہیں۔

---

[1] ٹکورا ـ ڈنکا ـ نوبت کی آواز۔

وفا سے وعدہ دیدار جاناں ہے جو محشر پر
تو نفخ صور اسرافیل نوبت کا ٹکورا ہے

(مغفور)

ہر ٹکورے پہ ہے نوبت کی طرح دل ہلتا
اب تو نوبت سے لگا کرنے یہ نوبت پنکھا

(ظفر)

ٹکوروں میں نوبت کی شہنا کی دُھن
شگوفہ سننے والوں کو کہتی تھی سُن

(میر حسن)

(ش)

اس میں بے زبان اشیا اور غیر ذوی[1] العقول چیزوں کو بلکہ بعض اوقات محض خیالی امور کو بھی ایک تشخص ذاتی دیتے ہیں اور ان کو تمام لوازم عقل و نطق و حیات سے آراستہ کرکے تھوڑی دیر کے لیے حیوان ناطق بنا لیتے ہیں۔ یہ تو کہنا محض غلط ہوگا کہ قدیم شاعری میں اس کا رواج نہ تھا مگر اتنی بات البتہ ہے کہ انگریزی کے رواج نے اس کو صنائع میں اب کسی قدر نمایاں اور مقبول کر دیا ہے۔ اب کوئی عبارت ایسی نظر سے نہیں گزرتی جس میں یہ صنعت نہ ہو۔ یہ صنعت چوں کہ اب انگریزی سے اُردو میں لی گئی ہے اس لیے اگر اس کو استعارۂ فرنگ بھی کہیں تو بجا ہے۔ اس استعارۂ فرنگ نے اب ایسی مسیحائی کی ہے کہ اکثر بے جان خیالی جمادات میں جان آگئی ہے اور وہ عبارت کی انجمن میں عقل کے لب و لہجے سے گفتگو کرتے پھر رہے ہیں۔

نظیر اولاً تو اس زمانے کا آدمی نہیں دوسرے اُس کو صنائع سے زیادہ رغبت نہیں، پھر کیوں کر اُمید کی جا سکتی ہے کہ یہ صنعت جو گویا مخصوص بفرنگ ہے، اس کے ہاں زیادہ پائی جاتے گی۔ لیکن چونکہ سچا شاعر ہے، سلیقہ فطری اس کو جہاں اور سچے صنائع شاعرانہ میں ماہر دکھاتا ہے وہاں ایک خاص اعتدال کے ساتھ اس صنعت میں بھی مشغول رکھتا ہے۔ گو اس کو اس صنعت کا چنداں اہتمام نہیں، مگر جہاں بے تکلفی کے ساتھ بعض برجستہ فقرے نکل آتے ہیں تو اس لطف سے آتے ہیں کہ جو لوگ خاص اسی صنعت پر مٹے ہوتے ہیں اُن سے بھی عمر بھر ایسا فقرہ نہ نکلے۔

نگہ لڑائی ہے اُس نے جس دم جھنک لیا جھپ تو دل کو میرے
ادا ادا نے ادھر دلوچا پلک پلک نے اُدھر اچھالا

چلا جب گھر سے اک دل بر دلوں کو حُسن سے چھلنے
عرق کو رُخ کے پلکوں کی جھپک پنکھا لگی جھلنے
لگے تسخیر کے سو نقش اور تعویذ ہیکل نے
لگایا دام زلفوں کی شکن نے پیچ نے بل نے
بنایا پان نے رنگ اور سنبھالا سحر کاجل نے

---

[1] غیر ذوی العقول — ناسمجھ، مالکان غیر عقل۔ (م)

نہ آیا رحم اس کو بہت میں نے سماجت کی
نگہ نے سامنے آتے ہی سینے میں سناں جڑ دی
کمند زلف پر خم نے بھی گردن دل کی پھر جکڑی
لگے غمزے لگانے تیر ادھر دکھلا کے سو پھرتی
ادھر سے تیغ ابرو کی بھی پھر کیا کیا لگی چلنے

ادھر آن و ادا لیٹی کرشموں نے ادھر گھیرا
اُدھر پلکوں کی نوکوں نے چبھویا دل میں نشتر سا
ادھر انداز نے سج کے کیا دیوانہ و شیدا
اُدھر آنکھوں کے جادو نے بنایا باولا کیا کیا
ادھر کین پھرتیاں کیا کیا نگاہوں کی بھی چھل بل نے

سُدھ لے گئی بالے کی جھمک صبر کرن پھول ---------- اور عقل کو بندے
بالی کی گئی جھوک لگا سینے میں اک ہول ---------- دل لے گئے جھمکے
اور جی کے تیتیں لے گئی زنجیر طلائی ---------- زنجیر پنہا کر

کاجل کی کھچاوٹ نے کیا دل پہ یہ طوفاں ---------- جو ہوش اڑا یا
مستی کی دھڑی نے وہ کیا ظلم نمایاں ---------- جو غش پہ غش آیا
ہاتھوں نے بھی تک آگ سی سینے میں لگائی ---------- مہندی کو دکھا کر

چوٹی کی گندھاوٹ کہیں دکھلاتی ہے لہریں
رکھتی ہے کہیں زلفِ پریشان تماشا

خوشی یہ بولی تمہاری میں گرد خاطر ہوں
ادھر سے عیش پکارا کہ میں بھی حاضر ہوں

میری نظر بھی دوڑ کے اس کی نظر سے واں
ایسی لڑی کہ خوب لڑی خوب ہی لڑی

پھانک بیجوں کی بھری لے ہے وہ جب منہ سے لگا
تب لپٹ جاتا ہے کیا پیار سے ہنس کر تربوز

اندھیری رات میں اسی صنعت کے ستارے جگمگا رہے ہیں:۔

ٹالے ہے سب آتی ہوئی آفات اندھیری
کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

جاڑے کے اکھاڑے میں اسی صنعت کا پہلوان خم ٹھونک رہا ہے:۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا کبھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلا خم ٹھونک اُچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

برسات کے صحن میں بھی اسی کی پھسلن ہے۔

لاٹھی کو ٹیک کر جو سنبھلتوں ہے کھڑا تو کیا
چھجا گرا منڈیرے کا پتھر پھسل پڑا

سب سے زیادہ ہولی نے اس صنعت کو رنگا ہے۔ یوں تو ہولی کی ہر نظم میں یہ رنگ اچھلا ہے مگر اس نظم میں جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

جُدا نہ ہم سے ہو اے خوش جمال ہولی میں

رنگ دھواں دھار ہے گو پچکاریاں چل رہی ہیں مگر معلوم ہوتا ہے ہنری مارٹینی[1] کی بازی لاڑھیں ہیں نظیر نے سفید اور زرد کو دو صاحب ملک و مال قرار دیا ہے۔ انہی دونوں کے آپس

---

[1] غالباً (Henry Martini) سے مراد کوئی سنگ دل فرنگی ہے جو عہد شہباز میں غیر معروف نہ تھا۔ (م)

میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ دو پادشاہ در اقلیمے نہ گنجند۔ ایک کہتا ہے ملک چھوڑ دے۔ دوسرا کہتا ہے میں تو نہیں چھوڑ نے کا۔ تو لڑ دیکھ۔ دونوں طرف سے فوجی طیاریاں ہوتی ہیں۔ پھر لڑائی کا بازار گرم ہوتا ہے۔ عین جس وقت میں لڑائی کا بازار گرم ہے ایک شوخ نازنین سیر کو آتا ہے مستفسر احوال ہوتا ہے اور بیچ میں پڑ کر صلح کروا دیتا ہے۔ از بس کہ اس نظم کا مفہوم خیالاتِ فرنگ کے مطابق ہے لہٰذا اگر اس کے اشعار یہاں نقل کیے جائیں تو غالباً ناگوار طبع اہنا ئے زماں نہ ہوگا۔

سبھوں کے عیش کو پھاگن کا یہ مہینا ہے
سفید و زرد میں لیکن کمال کینا ہے
طلا کا زرد لیے سر بسر خزینا ہے
سفید پاس فقط سیم کا دفینا ہے
ہر ایک دل میں ہے رستم و زال ہولی میں

کہا سفید سے آخر کو زرد نے یہ پیام
کہ اے سفید تو اب چھوڑ دے جہاں کا مقام
میں آیا اب تو مرا بندوبست ہوگا تمام
تو مجھ سے آن کے مل چھوڑ اپنی ضد کا کلام
وگرنہ کھینچے گا تو انفعال ہولی میں

ملے گا مجھ سے تو میں تجھ کو پھر بڑھاؤں گا
بنا کے آپ سا پاس اپنے لے بٹھاؤں گا
کہا سفید نے میں مُطلقاً نہ آؤں گا
تجھی کو بعد کئی دن کے میں بھگاؤں گا
تو اپنا دیکھیو کیا ہوگا حال ہولی میں

یہ سن کے طیش میں آ زرد کا سپہ سالار
چڑھ آیا فوج کو لے کر سفید پر اک بار
ادھر سفید بھی لڑنے کو ہو کے آیا سوار
صفیں مقابلہ دونوں کی جب ہوئیں طیار
ہوا کرخت جواب و سوال ہولی میں

پلا ادھر سے سفید اور ادھر سے زرد بہار
گھٹائیں رنگ برنگ فوجوں کی جھلکیں سرشار
پکھالیں مشکیں چھٹیں رنگ کی پڑی بوچھار
تھی چار طرف سے پچکاریوں کی مار لمار
اڑا زمیں سے زماں تک گلال ہولی میں

یہاں تو دونوں میں آپس میں ہو رہی یہ جنگ
ادھر سے آیا جو اک شوخ بارُخ گل رنگ
ہزاروں نازنیں معشوق اور اس کے سنگ
نشے میں مست کھلی زلف جوڑے رنگ برنگ
کہا کہ پوچھو تو کیا ہے یہ حال ہولی میں

کہا کسی نے کہ اے پادشاہ مہ رویاں
سفید و زرد یہ آپس میں لڑ رہے ہیں یہاں
یہ سن کے آپ وہ دونوں کے آگیا درمیاں
ادھر سے سقا بنا آ سے اور ادھر سے اس کو کہا ں
تم اس قدر نہ کرو اختلال ہولی میں

کہو تمھاری خصومت کا ماجرا کیا ہے
کہا سفید نے نا حق یہ زرد ہے لڑتا
یہ سن کے اس نے وہیں اپنا اک منگا جوڑا
پھر اپنے ہاتھ سے جوڑے کو چھڑکو ان رنگوا
کہا کر دونوں رہو شاملِ حال ہولی میں

پھر اپنے تن میں جو پہنا وہ خلعتِ رنگیں
سبھوں کو حکم کیا پہنوں تم بھی اب یوں ہی
ہزاروں لڑکوں نے پہنے وہ جوڑے پھر وہیں
پکاری خلق کہ انصاف چاہیے یوں ہی
ہوا پھر اور ہی حسن و جمال ہولی میں[1]

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ٹرینسفرآف اپیتھٹ[1] بھی ایک قسم کا استعارہ بالکنایہ ہے جس کو استعارہ بالاوصاف کہہ سکتے ہیں اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اوصاف جو کسی شے کے ساتھ مخصوص ہیں ان کو اس شے سے منتقل کر کے دوسری کسی ایسی چیز کی طرف منسوب کرتے ہیں جس سے ان کو کسی طرح کی مناسبت نہیں ہوتی اور یوں بالکنایہ اس چیز کا اُس شے سے استعارہ کرتے ہیں جو واقع میں ان اوصاف کی مستحق ہے۔ انگریزی میں اس صنعت کا بہت رواج ہے لیکن اردو میں مجھ کو اس کی مثالیں بہت کم ملی ہیں۔ انہی معدودے چند میں نظیر کے یہاں کی یہ مثالیں بھی ہیں جہاں نظیر نے کورے برتن کی تعریف کی ہے وہاں ایک مصرعہ یہ لکھا ہے ؂

سوندھی سوندھی ٹھٹھولیاں باندھیں

ٹھٹھولیاں سوندھی نہیں ہوا کرتیں۔ سوندھی مٹی ہوتی ہے۔ سوندھے برتن ہوتے ہیں۔ یہاں شاعر نے نہایت لطافت سے اپنے لطیفوں کا کورے برتن سے استعارہ کیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ میرے لطائف، لطائف نہیں ہیں بلکہ ندرت کی وجہ سے کورے برتن جس میں آب داری کی بوند پڑ کر لطافت کی سوندھی سوندھی خوشبو پیدا کر رہی ہے۔

چوہے کے اچار میں مصرعہ ذیل بھی اس مذاق میں ہے۔

اور چیرپڑی[2] مہری کی بھی کیچڑ ہے ملائی۔

چیرپڑی اصل میں مرچ پارائی یا اسی قسم کے اور تیز مسالے کی صنعت ہے۔ کیچڑ کو اس صنعت سے موصوف کرنا گویا بالکنایہ اس کو گرم مصالح قرار دینا ہے۔ ایہام کی صنعت بھی ایک لطیف صنعت ہے اور اس کا قدما میں بکثرت استعمال ہے۔ امیر خسرو کے نزدیک اس صنعت کی بڑی وقعت ہے اور انھوں نے اپنی قوتِ ایجاد سے اس کی خوبی کے نئے نئے رستے نکال

ت[1] ص 300 کا

ت جس طرح اس ہولی میں زرد و سپید کی لڑائی ہے، ایک جگہ جوانی اور بڑھاپے کو بھی لڑایا ہے اور دھیڑپن کو بیچ میں ڈال کر صلح کرادی ہے۔ (ش)

ت[1] (Transfered epithet) دیکھو صفحہ 299 پر۔ (م)

ت[2] چیرپڑا۔ تند۔ چٹ پٹا۔ چٹخارے کا۔ گرم۔ سوزاں۔ (ش)

دیے ہیں۔ متاخرین میں صاحب واسوخت امانت نے اس کو اچھی طرح برتا ہے۔ مشہور حاجی مرثیہ گو مشیر[1] کے یہاں بھی اس کا برتاؤ کسی قدر پایا جاتا ہے اور جس قدر ہے شوخی کے ساتھ ہے۔ میر انیس کے خاندان نے اس میں کسی قدر لطافت پیدا کی ہے مگر اب موجودہ زمانہ اس پر زیر لب ہنسنے لگا ہے۔ ایسی صورت میں نظیر کا یہاں اس کا برتاؤ جس قدر کم ہو اس کے ہوا خواہوں کے لیے ایک خوشی کی بات ہے۔

باطن نے اپنے تذکرہ میں ایہام کی مثال میں یہ اشعار لکھے ہیں:۔

کجوری چوٹی ادائیں موٹی جفا میں لمبی، وفا میں چھوٹی
ہے اس سے کھوٹی کہ دل ہر اک کا ہر اک لٹک میں لٹک رہا ہے
وہ نیچی کافر سیاہ پٹی نہ دل کے زخموں پہ باندھے پٹی
پڑھی ہے جس نے کہ اس کی پٹی وہ پٹی سے سر پٹک رہا ہے

اس مثال میں صنعت تسجیع کی مثال بھی آگئی اور پہلے شعر میں استعارہ فرنگ بھی کس قدر ہے۔

اور مثالیں:۔

تیرِ نگہ کو راہ ادھر دیکھ بھال دو
لکڑی سے پہلے تاڑنے والوں کو ٹال دو
ڈالی سمیت گل کو اٹھایا تو ہے ولے
پہنچے میں نازکی کی ہے بس اب اس کو ڈال دو
تلوار اس کے ابرو نے کھینچی میاں نظیر
دل تم بھی دو بدو ہی کے سانچے میں ڈھال دو

کچھ مثالیں مجھ سے لیجیے:۔

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہیں تو آدمی چرخے کی مال ہے
وہ جو پانی کی کوری گولی ہے
وہی آنے کے مول گولی ہے

---

[1] مشیر۔ گوہر علی مشیر، شاگرد دبیر۔

کیا ہی ٹھنڈی دوا کی گولی ہے
کیا کہوں گولی گولی گولی ہے
تازگی ــــــ الخ

یہ جو گولی کی بولیاں باندھیں
ہم نے پانی کی گولیاں باندھیں
سوندھی سوندھی ٹھٹھولیاں باندھیں
دل نے پھولوں کی جھولیاں باندھیں
تازگی ــــــ الخ

کورا پنہاری کا جو ہے مٹکا
اُس کا جوبن کچھ اور ہی مٹکا

پھبتی تشبیہ اور پھبتی دونوں گویا ایک چیز ہیں، لیکن اب استعمال میں پھبتی زیادہ تر اس تشبیہہ کو کہتے ہیں جس میں پہلوئے ظرافت ہو۔ پھبتی ایک زمانہ میں ہمارے سوسائٹی میں بہت رائج تھی۔ کوئی شخص اس وقت تک کہ اس فن کا اس کو کمال حاصل نہ ہو علم مجلس میں کامل سمجھا ہی نہیں جاتا تھا۔ نظیر جس سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا تھا اس میں دن رات اسی کا چرچہ تھا۔ اس کی چلبلی شوخ طبیعت نے یقیناً نئے گل پھول تراشے ہوں گے مگر افسوس وہ گل میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ تلاش کی گل چینی سے جو ملے ہیں وہ حاضر ہیں۔

(پہلی پھبتی) جوانی کو ہرے اوکھے تشبیہہ دی ہے اور بڑھاپے پر اس پیڑ کی پھبتی کہی ہے جس کو نہ فقط پت جھڑ کا صدمہ پہنچا ہو بلکہ سلب رطوبت سے جڑ بھی سوکھ گئی ہو۔

بیٹھے تھے پرند آن کے جب تک تھا ہرا روکھ
اب کیا ہے جو پت جھڑ ہوا اور جڑ بھی گئی سوکھ

(دوسری پھبتی، بوڑھے آدمی پر لنڈورے مرغے کی۔

اب آکے بڑھاپے نے کیے ایسے ادھورے
پر جھڑ گئے دم اڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے

(تیسری پھبتی، داڑھی پر مکڑے کی جالے کی۔

داڑھی کو پکڑ کر کھینچ کوئی جھاڑے ہے مکڑی

(چوتھی پھبتی، بڑھاپے کی سیر دریا پر خضر کی ملاقات کی۔

دریا کے تماشے کو اگر جائیں تو یارو
کہتا ہے ہر ایک دیکھ کے جاتے ہو کہاں کو
اور ہنس کے شرارت سے کوئی پوچھے ہے بدخو
کیوں خیر ہے کیا خضر سے ملنے کو چلے ہو

(پانچویں پھبتی، جسم پر جھونپڑے کی۔

اپنا نہ مول کا نہ اجارے کا جھونپڑا
بابا یہ تن ہے دم کے گذارے کا جھونپڑا

(چھٹی پھبتی، جسم پر ڈربے کی۔

اس میں ہی سب پرند اسی میں چرند ہوتے
شا جھونپڑا ابھی اسی ڈربے میں بند ہیں

(ساتویں پھبتی، دنیا پر ٹھگوں کی بستی کی۔

ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

(آٹھویں پھبتی، شہدا کے سروں پر تربوز کے ڈھیر کی۔

اس طرح سر کا شہیدوں کے پڑا تھا انبار
جیسے بازار میں تربوز کے اوپر تربوز

کچھ پھبتیاں ککڑی پر بھی کہی ہیں۔ مزے کی ہیں۔

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں
گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی تکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں

کیا خوب ——— الخ

ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے
سیدھی سو وہ یارو رانجھا کی بانسری ہے

تشبیہ۔ تشبیہ کے بغیر تو شاعری ہو ہی نہیں سکتی مگر مجھے اس ذیل میں صرف یہ دکھانا ہے کہ نظیر نے نہ تو ملٹن کی طرح لمبی لمبی تشبیہیں اختیار کی ہیں جو تشبیہیں نہیں ہیں بلکہ خیالی پینورما[1]۔ متاخرین شعرائے ہند کی طرح تشبیہ میں خیالی موشگافیوں سے کام لیا ہے کہ مفہوم موئے کمر کی طرح نقطۂ موہوم بن گیا ہو۔

ہوش کی طرح اڑا۔ نشے کی طرح چڑھا۔ ضبط کی طرح سمٹا۔ رنگ کی طرح جما۔ یہ بھی کوئی تشبیہ ہے تعریف بالمجہول۔

نظیر کے یہاں تشبیہیں ہیں مگر اعتدال کے ساتھ۔ وہ کبھی کبھی تشبیہوں میں اپنا خاص رنگ بھی بھرتا ہے جو اکثر چٹکیلا ہوتا ہے۔ مثلاً۔ جان کی پودنے سے۔ جب تن سے ہوا ہو گئی وہ پودے سے جان پر اڑنے مرغ روح میں اس پودنے سے نئی جان آگئی ہے۔

جاتا تھا سرخ جوڑے میں تن یوں جھمک دیکھا
گویا شفق میں آن کے بجلی چمک پڑی

استعارہ۔۔۔ اس کی اور قسمیں تو اوپر بیان ہو چکیں اس میں اور تشبیہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ صرف حرف تشبیہ کی دوری حد فاصل ہے۔ حقیقت میں استعارہ بھی تشبیہ ہے مگر بالکنایہ۔ استعارے کی یوں تو نظیر کے کلام میں بہتری مثالیں ہیں مگر مجھے صرف ان استعاروں سے غرض ہے جو کسی اور سے مستعار نہیں۔

بنجارہ نامے میں یہ چند استعارے نظیر کے خاص ہیں۔

اجل کا قزاق:۔

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا

---

[1] (Panorma)

مرگ کا ہانکنے والا، بدن کا بیل۔

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا

رُوح کا نایک۔

جب نایک تن سے نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے

اجل کے چند استعارے اس نظم میں خاصے ہیں جس میں عارفانہ رنگ میں بے ثباتیِ دنیا کی تصویر کھینچی ہے:

اجل کی توپ۔

جب توپ نے اجل کی آمورچہ لگایا
سب اُڑ گئے ہوا پر کوئی نہ کام آیا

مرگ کا شیر خاں اور قضا کا پنجہ۔

پنجہ اٹھا قضا کا جب اے شیر خاں جی
پھر کس کے سر خاں جی کس کے وزیر خاں جی

اجل کا تیس مار خاں۔

آیا قدم اجل کے جب تیس مار خاں کا
خر بھی کہیں نہ دیکھا پھر شہسوار خاں کا

قضا کا راج۔

جب راج نے قضا کے کرنی بسولی ٹانکی
ایک اینٹ بھی نہ باقی ہر گز کسی مکاں کی
ڈھاتے تھے وہاں مزدور تو تن کی محل سرا
پھر گھر بنا رہے تھے دوالے اٹھا اٹھا
اِس میں قضا کا راج جو کوٹھے پہ آ چڑھا
شہتیر سا وہ قد تھا سو خم ہو کے جھک گیا
گرنے لگی کڑی پر کڑی تب خبر پڑی

اجل کا فوجدار۔

لے کر سند اجل کا جب فوجدار آیا
اک دن میں حکم و حاصل سب ہوگیا پرایا

اجل کا یکہ تاز اور اس کا کٹک:۔

آیا کٹک اجل کے جب یکہ تاز خاں کا
سر بھی کہیں نہ پایا پھر سرفراز خاں کا

قضا کا مردہا:۔

آیا قضا کا مردہا جس دم چھڑی اٹھاکر
کتوالی اور صدارت سب اڑگئی ہوا پر

قضا کا بانکا:۔

جب گھور کر قضا کے بانکے نے آکے جھانکا
ٹیڑھا رہا نہ ترچھا گنڈا رہا نہ بانکا

اجل کا دیو:۔

جب دیو کا اجل کے سایہ ہوا مقابل
ملّا رہا نہ سیانا عالم رہا نہ فاضل

قضا کا ترسول اور وقت کا مہادیو:۔

ترسول لے قضا کا جب وقت سر پہ آیا
نے بالکے کو تھاما نے آپ کو بچایا

کچھ استعارے ضمناً اور بھی بیان ہوتے۔ مثلاً پلکوں کا استعارہ پنکھے سے یا کوندی نیکے کا نقارے اور ڈنڈے سے۔

بڑھاپے کی شراب:۔

آئی شراب اس میں بڑھاپے کی خواہ مخواہ
پہلے کے جام میں نہ ہوا کچھ نشہ تو آہ
دل بر نے دی جب اُس سے کڑی خیریت خبر پڑی

تبسّم کی شکر:۔

نہ بولا منہ سے ہرگز دیکھ کر وہ خوش دلی میری
مگر کچھ کچھ تبسّم کی شکر لب سے لگا ملنے

عشرت کا باز جرّا:۔

چاہے اگر اڑانا عشرت کا باز جرّا
تو پہن ہار بدّھی اور سر پہ رکھ کے طرّا
پی عاشقوں میں ـــــ الخ

اشک کی شیشی:۔

پھنکی نکلتی ہیں اشکوں کی شیشیاں یارب
ہمارے سینے میں کس شیشہ گر کی بھٹّی ہے

کنایہ ـــــ یوں تو کنایہ ہر جگہ ہے۔ تشبیہ[1] میں کنایہ، استعارے میں کنایہ، ضلع میں کنایہ، جگت میں کنایہ، پھبتی میں کنایہ، الیگری میں کنایہ، ٹرینسفر آف اپیتھٹ میں کنایہ، غرض وہیں کنایہ ہے جہاں کوئی بات ذرا بھی پردے میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہاں میری غرض صرف اس کنایے سے ہے جو نہ لفظی گل اندام بلکہ کسی خاص شاہد مطلب یا واقعے کو خوشنما چلمن کی آڑ میں بیٹھاتا ہو۔ مثالیں سے یہ مطلب زیادہ روشن ہوگا۔

مثالیں:۔

صبح ہونے کا کنایہ:۔

جب آنکھ سے سورج کی ڈھلا رات کا کجرا

لطف وصل کا کنایہ:۔

گل سا ملا وہ مجھ کو نیا گُدگُدا بدن
رگ رگ میں میری چھٹ گئی عشرت کی پھلجھڑی

مبالغہ ـــــ بالغ نظر جانتے ہیں کہ مبالغہ نظیر کی طرز سے کس قدر دور ہے مگر پھر بھی شاعری کا ایک زیور ہے اور قیمتی زیور ہے، ہاتھ سے کیوں کر دے سکتا تھا۔ زیادہ تر تو بے پروائی

---

[1] دیکھو صفحہ 293 پر۔

کے بکس میں بند پڑا رہتا ہے ۔مگر نمایش کے بیسیوں مو قعے ہیں، کبھی نکل بھی آتا ہے ۔شاہد معنی کا ماتھا چومیئے جس کے صدقے میں یہ جگمگاہٹ ہماری نظر میں بھی ہے ۔

پڑھ علم ریاضی جو مجسّم ہوتے دھومی
پیشانی محو زہرہ وبرجیس کی چومی
آواز سے واقف ہیں اشارے سے خبر ہیں
پرواز میں ہم شہ پر عنقاتے نظر ہیں
اور ہے دودھارے کی بھی کچھ اور آن بان
حیران ہو جس سے تیغ نگاہ پری رخاں
اڑنا پہاڑیے کا بھی ہے اس قدر بلند
اکھڑے تو پھر فلک پہ ہو پانا پتنگ کا
سو بار حریر اس کا مسکا نگہ گل سے
شبنم سے کب اے بلبل پیراہن گل مسکا
نام سے اس گل کے ہیں لب زیر شہد
خُلد کے حوران شکر خاک لب

سچا مبالغہ:۔

عشق میں اس گوہر نایاب کے
آج تلک خشک ہیں دریا کے لب

قافیہ:۔ قافیہ کے متعلق نظیر کے یہاں کتنی صنائع ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ مردّف طرحوں میں ردیف قافیہ کو ملا کر ایک کر لینا۔ جیسے کاجل نے اور آنچل نے کی طرح میں چلتے اور ٹلنے کا استعمال۔

(۲) دوسرے اس بات کا لحاظ رکھنا کہ قافیے چست ہوں اکثر ان شگفتہ زمینوں میں جن میں قافیے بہت ہیں مشکل قافیوں کا اختیار کرنا۔

(۳) اکثر ان قافیوں کو اختیار کرنا جو فقط مشکل ہی نہیں بلکہ گنتی میں بھی کم ہیں، جن کو ایک بند میں باندھنا گویا امیر خسرو سے بہتر انملیاں بنانا ہے۔

(۴) اکثر قافیوں میں اس پہلو کو اختیار کرنا کہ سامع پر ایک اچھا اثر پڑے یعنی قافیوں میں اصول

موسیقی کی رعایت ۔

(۵) اکثر مبتذل قافیوں کو اپنی بندش کی تہذیب سے مہذب اور معزز بنانا ـــــ پہلی صنعت کوئی بہت بڑی صنعت نہیں۔ کم و بیش ہر شاعر نے اس کا استعمال کیا ہے۔ دوسری صنعت کا بھی علیٰ ہذا یہی حال ہے مگر باقی تین صنعتیں نظیر ہی کا حصہ ہیں۔ اس سے بہتر ان صنعتوں کا کسی نے آج تک استعمال نہیں کیا۔ بعض جگہ یہ اس قدر گاؤزوری کر جاتا ہے کہ قافیے گنتی میں پورے چار بھی نہیں کہ بند کو کافی ہوں مگر خواہ مخواہ اپنی پر طبیعت آزماتا ہے۔ بعض جگہ زبردستی کے قافیے بنالیتا ہے اور بعض جگہ ہارے درجے معمولی قافیوں سے کمی پوری کرتا ہے۔ اسی وجہ سے بعض بندوں میں پہلے شعر کے قافیے اور ہیں اور دوسرے کے اور مثلاً

چمگادڑ ابابیل کی ڈاٹھیں بھی پڑی ہیں
الّو کے پر اور گدھ کی انبٹھیں بھی پڑی ہیں
سر کوؤں کے اور چیل کی آنیٹھیں بھی پڑی ہیں
گوبر کی ڈلی بیٹ کی کھاتیں بھی پڑی ہیں
کیا زور ـــــ الخ

موسیقی اثر قافیوں کی مثالیں نظیر کے مذاقِ موسیقی کی بحث میں بھی دی گئی ہیں اور کچھ اس بحث میں ضمناً اوپر بیان ہوئی ہیں ـــ

جنگ نامۂ خیبر پورے کا پورا دقّت قافیہ کی ایک اعلا مثال ہے۔ ہم یہاں صرف اس کے ایک بند پر اکتفا کرتے ہیں۔

تھیں شاہ کی جراءت کی یہاں تک تو ترنگیں
سب کانپ گئیں قلعۂ خیبر کی النگیں
کتنے تو وہاں بھاگ گئے مار چھلنگیں
اور کتنے گئے بھول وہاں آن کے جنگیں
ہر گبر کو پھر تپ سے چڑھا آن کے جاڑا

خوفِ طوالت مانع ہے ورنہ ہم ہر ایک کی مثال جدا جدا لکھ دیتے۔ جن صاحبوں کو تصدیق منظور ہو کلیات کی طرف رجوع کریں۔ اکثر نظمیں میرے بیان کی کافی شہادت دیں گی۔ ایک لطف قافیہ کا یہ بھی ہے کہ شعر تمام کرنے سے پہلے قافیہ ذہن میں آجاتے۔ ایسے قافیوں کو بولتا ہوا

قافیہ کہتے ہیں۔ اگر یہی صنعت ردیف میں ہو تو اس کو پکارتی ہوتی ردیف کہیں گے۔ علی بن ہرارون اس صنعت کا موجد ہے اور اس نے اس کو تسہیم کا خطاب دیا ہے۔ اردو کے شعرا میں ذوق کے ہاں یہ صنعت بہت زیادہ خوبی کے ساتھ برتی گئی ہے۔ کچھ مثالیں نظیر کے ہاں بھی موجود ہیں۔

جب سے ہوا ہے کوہکن کرتے ہیں اس کا غم صدا
کوہ سے کوہ جو ہے جو سنگ ہے سنگ سل ہے سل

صنعت لف ونشر و تقسیم و طوالی صفات ـــــ یہ تینوں صنعتیں نظیر کی اس غزل میں موجود ہیں جس میں ایک ہی ساتھ سعدی عبدالواسع جبلی اور امیر خسرو سب کا جواب ہے۔ سعدی کی وہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

بربود دلم درچمنے سرو روانے
زریں کمرے سیم برے موتے میانے

اس میں صفوں کی لڑی اس تسلسل کے ساتھ پروئی گئی ہے کہ ہر جوہری کی اس پر نظر پڑتی ہے۔ نظیر نے اس کو خمسے کے زیب گلو کر کے ایک لڑی خود بھی پروتی۔ اچھی ہے یا بری اس کا فیصلہ جوہر شناس کر لیں میں یہاں صرف نقل کیے دیتا ہوں۔

کل نظر آیا چمن میں ایک عجب رشک چمن
گل رخ[1] و گل گوں قبا و گلعذار و گل بدن
مہر طلعت زہرۂ پیکر مشتری رُوح مرجبیں
سیم بر سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن
نازنیں ناز آفریں نازک بدن نازک مزاج
غنچہ لب رنگیں ادا شکر دہاں شیریں سخن
تیر قد نشتر نگہ مژگاں سناں ابرو کماں
برق تازو رزم ساز و نیزہ باز و تیغ زن
بے مروت بے وفا بے درد بے پروا خرام
جنگ جُو قتال وضع و سرفراز و سر فگن

---

[1] یہ مصرعے ایر پیشی کی مثال بھی پیش کرتے ہیں۔ (ش)

زلف وکاکل خال وخط چاروں کے یہ چاروں غلام
مشک تبت مشک چیں مشکِ خطا مشک ختن
دوش وبر دندان ولب چاروں سے یہ چاروں خجل
نسترنِ برگِ سمن در عدن لعل یمن
سختی وبے رحمی وجور وجفا سرکار کی
معتمد مومی علیہ ومستشا روم و تمن
مبتلا ایسے ہی خوش وضعوں کے ہوتے ہیں نظیر
بے قرار و دل فگار وخستہ حال و بے وطن

لف ونشر کی یہ مثال بھی اچھی ہے۔

تمھارے ہاتھ نے مہندی نے انگشتوں نے ناخن نے
گلستاں کی چمن کی باغ کی گلزار کی راکھی

ایک اور:۔

کفوں میں انگلیوں میں لعل لب میں چشم مے گوں میں
حنا آفت ستم فندق مسی جادو فسوں کا جل

صنعت مکالمہ:۔

نظیر کی ایک غزل صنعت سوال وجواب میں بھی ہے جس کو میں صنعت مکالمہ سے تعبیر کرتا ہوں یہ ایک عمدہ صنعت ہے اور اگر وسعت کے ساتھ اس کا برتاؤ کیا جائے تو اردو کی نظم میں ایک خاص ہوشل لب ولہجہ پیدا ہوسکتا ہے۔

کہا جو ہم نے ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو
کہا کہ اس لیے تم یاں جو غل مچاتے ہو
کہا لڑاتے ہو کیوں ہم سے غیر کو ہمہ دم
کہا کہ تم بھی تو ہم سے نگہ لڑاتے ہو
کہا جو حال دل اپنا تو اس نے ہنس ہنس کر
کہا غلط ہیں یہ باتیں جو تم بناتے ہو

کہا جتاتے ہو کیوں ہم کو زر و ناز و ادا
کہا کہ تم بھی تو چاہت ہمیں جتاتے ہو
کہا کہ عرض کریں ہم پہ جو گذرتا ہے
کہا خبر ہے ہمیں کیوں زباں پہ لاتے ہو
کہا کہ روٹھے ہو کیوں ہم سے کیا سبب اس کا
کہا سبب ہے یہی تم جو دل چھپاتے ہو
کہا کہ ہم نہیں آنے کے یاں تو اس نے نظیر
کہا کہ سوچو تو کیا آپ سے تم آتے ہو

گو لوگوں نے نہیں گنا مگر میرے خیال میں ایرا والا مثال بھی ایک طرح کی صنعت ہے یہ گویا شعبہ ہے اقتباس اور تلمیح کا ۔ اقتباس میں کوئی فقرہ قران یا حدیث کا لیا جاتا ہے اور تضمین کیا جاتا ہے ۔ تلمیح میں غالباً فقرہ اپنا ہوتا ہے، مگر زبان اور مثلاً اردو میں عربی فارسی کا فقرا یا فارسی میں عربی اردو کا فقرہ، ایرا والا مثال تضمین ہے ضرب المثل کی ۔ اقتباس اور تلمیح کی مثالیں کچھ غزلوں میں موجود ہیں ۔ کچھ انشا کی بحث میں درج ہوئیں ۔ ایرا والا مثال کی مثال نظیر کی کتاب الامثال سے جتنی چاہیے لے لیجئے ۔ تضمین میں گویا ایرا والا مثال، تلمیح اقتباس سب داخل ہیں ۔ مگر اب زیادہ تر اس کا اطلاق اس صنعت پر ہوتا ہے جو اور اساتذہ کے اشعار کو قطعہ مخمس مسدس وغیرہ کے جو کھٹے میں جڑ کر دکھاتی ہے ۔ اس سے نظیر کا سارا کلیات بھرا پڑا ہے ۔ سب سے عمدہ مثال اس کی جوگی نامہ ہے جس میں استاد کے اس شعر کی نہایت رنگین تضمین ہے ۔

اشتیاق کہ بدیدار تو دارد دل من
دل من داند و من دانم و داند دل من

اب ہم اس بحث صنائع کو ختم کرتے ہیں مگر قبل ختم یہ کہہ دینا بہت ضروری ہے کہ ایسا گمان نہ ہو کہ سوائے ان صنائع کے جن کا ذکر اوپر ہوا نظیر کسی اور صنعت کا برتاؤ جانتا ہی نہ تھا ۔ جتنی مثالیں اوپر دی گئیں ہیں وہ اس بات کے دکھانے کو کافی ہیں کہ وہ علم معانی و بدیع میں بھی کامل دستگاہ رکھتا تھا ۔ گو وہ اکثر اس کا برتاؤ نہیں کرتا مگر جب کرتا ہے، استاد کامل و ہنر ور ماہر نظر آتا ہے ۔ صنائع جو نظیر کے کلام میں نہیں ہیں، یہ ہیں ۔

(1) ترصیع (2) مقلوب مستوی (3) صنعت مہملہ (4) صنعت منشاری (5) صنعت رقطا ۔

(6) صنعتِ رقشا (7) صنعتِ مقطعات (8) صنعتِ دورو (9) ایہام ذوالوجوہ (10) ایہام لسانین (11) صنعتِ توشیع (12) صنعت منقوط۔

بہتر ہو کہ اس بحث کو حسن خاتمہ پر جس کو حسن القطع بھی کہتے ہیں تمام کیا جاتے۔ میرے خیال میں اس قدر عمدہ مثال حسن خاتمہ کی مشکل سے ملے گی۔

واں کوئی آیا لیے ایک مرصع پنجرا   لال دستار، دوپٹا بھی ہرا جوں طوطا
اس میں ایک بیٹھی وہ مینا کہ ہو بلبل بھی فدا   میں نے پوچھا یہ تمھارا ہے رہا وہ چپکا
نکلی منقار سے مینا کی صدا "پیسے کا"

باب 6

کلامِ نظیر کے عیوب

نظیرؔ کے زمانے سے آج تک زمانے نے بہت ترقی کی ہے اور یہ بات کوئی ہماری زبان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہر زبان میں ترقی کی رفتاریں ہی واقع ہوئی ہے۔ بہت سی ترکیبیں جو اس وقت عام تھیں اب بالکل معیوب ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ آتا ہے اور جاتا ہے کی جگہ اسی وقت آتے ہے اور جاتے ہے، ہر شاعر کی زبان پر تھا ——— تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوقؔ اور غالبؔ کے ہاں بھی اوائل میں یہ روزمرّہ موجود ہے۔

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکاتے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلاتے ہے (ذوقؔ)

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جاتے ہے (غالبؔ)

کچھ اور مثالیں:-

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکاتے تھا
تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آتے تھا (مومنؔ)

سانپ کی سی لہر اک دل پر مرے پھر جاتے ہے
یاد آتے ہے جب اُس کی زُلف ——— بل کھائی ہوئی (شوقؔ)

ٹھہرتے ہی نہیں ہیں آنچ پر سوزِ محبّت کی
رکھے ہیں اس زمانے میں خواص اجزا پارے کا (ظفرؔ)

ٹکے ہے زاہد شراب گل گوں ہوا ہے دِل بھی خراب آدھا
کھلا دے ساقی بلا سے اس کو ڈبو کے تو بھی کباب آدھا

(منشی سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ)

اصلاحِ زبان میں ہی اہلِ لکھنو کسی قدر اہلِ دہلی سے گوے سبقت لے گئے۔ جو اصلاح کہ لکھنو میں ناسخ ہی کے زمانے میں شروع ہو گئی تھی اس پر اہلِ دہلی کو کہیں اب جا کے خیال ہوا ہے۔ اسی واسطے دہلی والوں کے کلام میں ابھی تک بعض الفاظ ہیں جن کو اہلِ لکھنو ساقط الاعتبار جانتے ہیں۔ کبھو کا لفظ میں نے شعراء لکھنو میں سے کسی کے کلام میں ناسخ سے لیکر شعراء موجود تک نہیں دیکھا۔ حالانکہ غالب اور ذوق دونوں کے ہاں موجود ہے۔

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے (ذوق)

طرفہ یہ کہ ہمارے زمانے کے فخر نثاران مولانا نذیر احمد نے بھی بے گانہ خو نہو، تو نہ ہو کی طرح میں کبھو نہ ہو، کسی موقع پر باندھ دیا ہے۔

دولت مدارِ رونقِ باغِ جہان ہے
زر ہو، بلا سے رنگ نہ ہو گل میں بو نہ ہو
دنیا میں مُفلسی مرض لا علاج ہے
اس طرح کے مریض کو محبت کبھو نہ ہو

(مولوی نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ)

وہ نشاں جن کی چمک تھی بے بقا مثلِ شہاب
گہ نظر آتے اٹک پر اور ستلج پر کبھو

(مجموعہ نظم حالی صفحہ ۱۱۵)

غالب علیہ الرحمتہ نے تو کبھو سے گزر کر ایک جگہ کسو بھی باندھ دیا ہے۔ مطلع ہے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدو کی

اس غزل کا تیسرا شعر

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

کیوں کہ کیوں کر کے معنوں میں سوداؔ و میرؔ کے ہاں تو عام ہے — ذوقؔ غالبؔ بھی اس کو کوئی معیوب روزمرہ نہیں جانتے حالیؔ نے بھی اس کو جائز رکھا ہے۔ تلک کے لفظ پر بعض بہت زیادہ صفائی ڈھونڈھنے والے معترض ہیں۔ لیکن اہل دلی اور اہل لکھنو دونوں کے ہاں آج تک موجود ہے۔ سو پر بھی اعتراض ہے لیکن اس نے بھی ابھی تک روزمرے کا دامن نہیں چھوڑا —

اصلاح ہر چند عمدہ چیز ہے، لیکن بعض وقت بہت زیادہ نفاست بھی اچھی نہیں۔ گو اب دہلی اور لکھنو دونوں شہر کے فصحا کے نزدیک یہ ترکیب معیوب ہے کہ جمع موصوف کے لیے صفت بھی بصیغۂ جمع ہی لائی جائے۔ لیکن اساتذہ کے کلام میں یہ ترکیب ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ بعض مقام پر واقع ہوتی ہے کہ اس کا بہ سبیل جواز قائم رکھنا مناسب ہے۔

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں
دل لے کے بولتا ہے جو اب تو یہ بولیاں (سوداؔ)

ایک صیغہ جمع مونث کا ہے کھولیں، پڑیں، ملیں، گڑیں، اور دوسرا صیغہ ہے گڑیاں، ملیاں، پڑیاں، کھولیاں، میری رائے میں جواز اس صیغے کو بھی قائم رکھتا تھا۔

ہنوز آئینہ گرد اُس غم سے اپنے منہ کو ملتا ہے
خدا جانے کہ کیا کیا صورتیں اس خاک میں گڑیاں
چھری تلوا دہمدیگر گل و بلبل ہیں گلشن میں
تمھاری سچ کہو دونوں میں کس سے انکھڑیاں لڑیاں
گھتی نکلی ہیں لخت دل سے تار اشک کی لڑیاں
یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں

حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دی پھر کبھو
آنکھیں جب آرسی نے ترے منہ پہ کھولیاں

(سوداؔ)

بارہا وعدوں کی راتیں آتیاں
طالعوں نے صبح کر دکھلاتیاں (میرؔ)
عشق میں ایذائیں سب سے پاتیاں
رہ گئے آنسو تو آنکھیں آتیاں
اس مژہ برہم زدہ نے۔ بارہا
عاشقوں میں برچھیاں چلواتیاں
ایک بھی چشمک نہ اس مہ کی سی کی
آنکھیں تاروں نے بہت چمکاتیاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
مری آہ نے برچھیاں ماریاں

درویشوں سے تو اُن نے ضدیں نکالیاں ہیں
ایدھر سے ہیں دعائیں اودھر سے گالیاں ہیں
جبہے سے سینے تک ہیں کیا کیا خراشِ ناخن
گویا کہ ہم نے منہ پر تلواریں کھالیاں ہیں
جب لگ گئے جھمکنے رخسار یار دونوں
تب مہر و مہ نے اپنی آنکھیں چھپالیاں ہیں
وہ دردِ دل نہیں تو کیوں دیکھتے ہی مجھ کو
پلکیں جھکالیاں ہیں آنکھیں چرالیاں ہیں

کچھ نگاہیں تری ایسے ہی ہنر سے لڑیاں (انشاؔ)
کہ جھڑیں نور ہی کی قرص قمر سے لڑیاں
وہ جو چلون سے کوئی شخص اُدھر جھانکے ہے
پھر تیاں اُس کی مرے دیدۂ تر سے لڑیاں

کیوں کر نہ گدگداہٹ ہاتھوں میں اُس کے اُٹھے
وہ گوری گوری رانیں جس نے دبائیاں ہوں
ممکن ہے کوئی ہم سے افشائے راز ہوتے
سو بار ٹھنڈی سانسیں گو لب تک آئیاں ہوں
کیوں کر جنوں مجسّم ہو کر نہ دے دکھائی
جب شورشوں نے دل کی دھو میں مچائیاں ہوں
مرجائیے نہ کیوں کر ایسے پہ، ہو بے ظالم!
جس میں اکٹھی اتنی باتیں سمائیاں ہوں
جب ہوئیں پریاں ہوا کھانے کو کھڑیاں باغ میں
خود بخود بجنے لگیں غنچوں کی گھڑیاں باغ میں

کبھی نہ اس رُخِ روشن پہ چھائیاں دیکھیں (نصیر)
گھٹائیں چاند پہ سو بار چھائیاں دیکھیں
خون سے، بھر ان کے رنگیں ہم نے گالیاں دیکھیں
رنگ محلوں میں جنھوں نے رنگ رلیاں دیکھیاں

جمع صنعت کی خوش اسلوبیوں کی مثال میرؔ کے کلام سے بھی لیجیے:۔
اس آفتاب بن یاں اندھیر ہو رہا ہے
دن بھی سیاہ اپنے جوں راتیں کالیاں ہیں
چلتے ہیں یہ، تو ٹھوکر لگتی ہے میرؔ دل کو
چالیں ہی دل بروں کی سب سے نرالیاں ہیں
مولوی نذیر احمد نے بنات النعش میں ایک جگہ یہ فقرہ لکھا ہے۔
بعضیاں خالی پیلی بھی اترا تیاں تھیں۔۔ دہلی کی عورتوں کی یہ ہر وقت کی بول چال ہے،
پھر اس کو یک قلم زبان سے خارج کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔
قاآنی جو زبانِ فارسی کے شعراءِ متاخرین میں مجدد ہو گزرا ہے، اُس نے قدیم شعراءِ فارس
کے تمام محاورے قائم رکھے ہیں۔ اور اُن کو نہایت آزادی کے ساتھ اپنے کلام میں استعمال کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے خیالات وسیع ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر طرح کے خیالات نظم میں ظاہر کریں، وہ کبھی اس کو پسند نہیں کر سکتے کہ خواہ مخواہ زبردستی کے قیود بڑھا کر زبان کو تنگ کیا جاتے۔ غزل گوئی کے لیے شاید تھوڑی وسعت کافی ہے اور اس میں اعلا سے اعلا نفاست کسی قدر نبھ سکتی ہے۔ لیکن قصائد اور مخمس اور مسدّس و دیگر اصنافِ کلام میں جن میں شاعری صرف دو مصرعوں میں محدود نہیں، وسعتِ زبان کو نفاست کے سخت قاعدوں سے تنگ کرنے سے خیالات کی وہ روانی باقی نہیں رہتی اور لطفِ زبان ہاتھ سے جاتا رہتا ہے ـــ لکھنو میں گو ترکیبیں بہت چست اور صاف ہیں لیکن لطفِ زبان نہیں ـــ روانیِ خیالات نہیں ـــ جیسے اُن کے اخلاق، اُن کی اوضاع، ان کی بات چیت میں تکلف بھرا ہوا ہے، ویسے ہی ان کی شاعری میں بھی ـــ لکھنو کے مسلّم الثبوت شعراء کے کلام کو دیکھئے تو زیادہ تر فارسی کے شعراء کے خیالات کا عمدہ شستہ بے عیب ترجمہ معلوم ہوگا۔ لیکن اس میں لطفِ زبان بہت کم ہوگا۔ تکلف کے سبب زبان کے قدرتی چوچلوں کا کہیں اس میں پتہ بھی نہ ہوگا ـــ دہلی میں چونکہ نفاست اس حد تک نہیں پہنچائی گئی، ابھی تک لطفِ زبان باقی ہے۔ اور خیالات میں وہی قدرتی روانی پائی جاتی ہے۔ مجھ کو لکھنو کے شعراء میں مصحفی اور انشا تک پسند ہیں۔ بعد اس کے شاعری نہیں ہے، ترجمہ ہے۔

نظیر کے کلام پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کے محاورات لکھتا ہے۔ یہ اکثر صورتوں میں سچ ہے لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ ان محاورات کا وہ کن موقعوں میں استعمال کرتا ہے ـــ وضع الشی فی محلہ ہے یا نہیں۔ جب کبھی وہ عام لوگوں سے مخاطب ہے، اُنھی لوگوں کا روزمرہ لکھتا ہے۔ جب خواص کی طرف رُخ کرتا ہے اُنھی کے محاورات میں کلام کرتا ہے ـــ غزلوں میں اُس کی وہ روزمرّہ نہیں ہے جو مخمس مسدّس وغیرہ میں ہے۔ اس سے زیادہ کوئی مہمل بات نہ ہوئی کہ وہ جوگی نامہ یا جوگن نامہ مشائخ کی اصطلاح میں لکھتا۔ یا بنجارہ نامہ میں ایران کے ملک التجار کے محاورات سے کام لیتا۔ جس کو لوگ عیب بتاتے ہیں، واقع میں اس کا ایک بہت ہی بڑا ہنر ہے۔ وہ جس طبقے سے مخاطب ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی زبان کا پورا ماہر ہے اور ان کے خیالات میں اس طرح رنگا ہوا ہے کہ اُس وقت خاص کے لیے اُسی طبقے کا ایک شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے تو اس کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں جاتا ـــ کنھیا جی کا جنم یا اور چیزیں ہندوؤں اور مہاجنوں اور نانک شاہیوں کے مذاق کے مطابق لکھی ہیں اُن کو پڑھ کر کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ کسی مسلمان شاعر نے لکھا ہے۔ ایک مسلمان شاعر کے لیے ہندوؤں کے خیالات اور زبان سے اس قدر واقف ہونا شاعری نہیں

کرامت ہے۔

غزل میں نظیرؔ بہت ہی سلجھے ہوتے ہیں — ترکیبوں میں متانت، بندش میں صفائی، تعقید سے دُور، زیادہ تر شستہ اور پاکیزہ الفاظ اور سامعہ نواز دل چسپ محاورے، عاشقانہ مضامین کے لیے سراپا موزوں، ہاں کہیں جو اس میں آزادوں کا لہجہ شامل کر دیتے ہیں تو وہ شوخیِ طبع کا تفنن ہے اور خالی از لطف نہیں —

لیلیٰ مجنوں جوان کی نظموں میں نہایت مقبول نظم ہے، اُس کی شیرینیِ زبان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ چونکہ دل میں درد پیدا کرنے والا حسرت زدہ اور اُداس افسانہ ایک عاشق صادق کی محرومی کا ہے، کس طرح اس کو اسی درد پیدا کرنے والے اُداس اور غم زدہ لہجے میں بیان کیا ہے اور کس طرح شروع سے آخیر تک، باوجودے کہ ظرافت اس کی طبیعت کا جبلی جوہر ہے، متانت کو قائم کیا ہے۔ اسی طرح جو نظم لکھی ہے اُس نے مضمون کے رعایت سے اُس کی زبان اور لہجے کا فیصلہ کیا ہے۔ پس جو شخص اِس نظر سے نظیرؔ کے کلام کو دیکھے گا اس کی آنکھ میں وہ اعتراض (کہ عام محاورے اس کے کلام میں بہت ہیں) آپ سے آپ اُٹھ جائے گا۔

اب شاعرانہ حیثیت سے جو اعتراضات ہوتے ہیں ان کا جواب ملاحظہ کیجیے۔ اب بڑا اعتراض تو یہ ہے کہ بعض حرف جس کا تقطیع میں گرنا استادوں نے ناجائز رکھا ہے مثلاً ہے۔ ے عین اس قسم کے حروف اس کے کلام میں تقطیع سے گر جاتے ہیں:-

(الف) اسقاطِ ع۔

(1) ایسی نہ شب برات نہ بقرعید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے اس عید کی خوشی

(2) کسی وقت مکتبِ عقل میں بہت علم ہم نے بھی تھا پڑھا
ہر اک سے حجت و بحث تھی سو اُس علم کا یہ کمال تھا

(3) اس خواب میں مجھے اک عمارت نظر پڑی

(4) ہم تو پھرتے ہیں نظیرؔ عشق میں اب خانہ بدوش

(5) کیا کیا میں کہوں اس کی اب عیاری کا مذکور
بوسے کی طلب کی تو کہا ناز سے چل دُور

(6) اسی سے یہاں نظیرؔ عزت اسی سے واں شفاعت ہے

(7) کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی
تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
(8) گڑھ توپ دہکلا توپ قلعہ کیا سیسہ دار وکیا گولا
(9) دیکھ عقدِ ثریا ہمیں انگور کی سوجھی
کیوں بادہ کشو ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی
(10) بینی اور نتھ کا وہ عالم کہ چھدے دل جس سے
نُور چنّی کی جھلک، گوہر غلطان پری
(11) خوشی کی دھوم سے ہر گھر میں رنگ بنوائے
گلال عبیر کے بھر بھر کے تھال رکھواتے
(12) بہار چھڑکوان کپڑوں کی جب نظر آتی
ہر عشق باز نے دل کی مراد بھر پاتی
(13) کیا غصے میں منہ اک بار سُرخ عیّار اچپل نے
(14) جب منہ اجل کا دیکھا پھر کچھ بھی بن نہ آیا
یکتا شجاع بہادر صفدر ہوا تو پھر کیا
(15) ہم بھی ہوا کی لہر میں پیتے تھے بڑھا بڑھا
دیکھ ہمیں اس عیش سے سینہ فلک کا پھٹ گیا
(16) کمخاب تاش مشروع تن زیب خاصہ ململ
(17) ملتا نہیں کنار کچھ عشرت کے بحر کا
(18) جوڑے چمن بہار ہیں پہنے کے واسطے
گہنے مرصع کار ہیں پہنے کے واسطے
(19) فلک پر تاروں کی کیا کیا مرصع کاری کی
پھر اُن میں زیب فزا کہکشاں نگاری کی
(20) ہے یہ نظیرِ عصیاں قریں جانے ہے صدق و یقیں
ہوگی ترے ہی فضل سے ہماری کھوٹی کھری

(21) کھانے کو ملا کم تو اُسی کم میں رہے خوش
جس طور کہا اس نے اُس عالم میں رہے خوش

(22) اُن کے تو جہاں میں عجب عالم ہیں نظیر آہ
اب ایسے تو دنیا میں ولی کم ہیں نظیر آہ

(23) پہنا کسی نے خوب لباس عطر کا بھرا
یا چیتھڑوں کی گدڑی کوئی اوڑھ کر پھرا

(ب) اسقاط ح۔

(1) فرمایش اگر ہو کوئی تو ہم سے وہ فرماؤ
ہم سب طرح حاضر ہیں ذرا ہم سے نہ شرماؤ

(2) یا بالکوں میں اس طرح بیتا بیاں کروں

(3) اُس نے جب گل کی طرح ہنس دیا اور مجھ سے کہا
"مہرباں مجھ سے یہ تم پوچھو ہو کیا، جیسے کا"

(4) پھر اپنے ہاتھ سے جوڑے کو چھڑکواں رنگوا
کہا کہ دونوں رہو شامل حال ہولی میں

(ج) اسقاط ہ۔

(1) پی عاشقوں میں آکر دو بھنگ کے پیالے
جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے چھپّر ہالے

(2) اُس گلبدن کے دل میں چھپا ہجر کا جو خار
مکتب میں جاتی وہ جو کچھ ہوتا تھا اختیار

(3) بہتا ہے کوئی کسی سے اے دل رُبا ہٹیلے
ایک جام گلابی مے کی ہاتھوں سے میرے پی لے

(4) میاں پھر تو جنوں کی بندھ گئیں واں اسقدر جا ہیں
کہ ٹھٹھے ٹھٹھ ہوئے خلقت کے اور بند ہو گئیں راہیں

(د) اسقاط ر۔

جو پاسا پھینکے بنا بنا کر اور داؤں کتنے ہی دل میں ٹھانے
جو چاہتا ہے اٹھارہ آویں تو اس کو پڑتے ہیں تین کانے

(الف) عین کے اسقاط کی تیئس مثالیں تو اوپر موجود ہیں ـــــ عبیر کے عین کے اسقاط کی دو ایک مثالیں اور تھیں جو میں نے قصداً چھوڑ دیں۔ شاید دو چار اور ہوں ـــــ اس کثرت سے ان مثالوں کا پایا جانا سہو کاتب پر توٹالا جا نہیں سکتا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ نظیر جیسا استاد اِس عیب سے واقف نہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظیر جس زمانے میں تھا اس میں عین کا اِسقاط شعراء میں معیوب نہ تھا۔ شاید عیب نہ سمجھنے کی وجہ یہ ہو کہ تقطیع میں زیادہ تر تلفظ کا خیال کیا جاتا ہے ـــــ اردو میں عین کا تلفظ الف سے جداگانہ نہیں ہے۔

عید، علم، عمارت، عبیر وغیرہ الفاظ گو عین سے لکھے جاتے ہیں لیکن تلفظ ان کا اید، الم۔ امارت، ابیر کا سا ہے۔ پس تلفظ کو اصل قرار دیکر قدیم شعراء اردو نے اس کو جائز رکھا ہے۔

بقر عید کو نظیر نے شاید اسی لحاظ سے بقرید لکھا ہے۔ بعض لوگ بکرید بھی کہتے ہیں۔

قلعہ بول چال میں قلا ہے ـــ عین کی حرکت لام کو دیکر اُس کو تلفظ سے ساقط کر دیا ہے۔

مثال نمبر 10 میں وہ عالم کا دو طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ عین تلفظ میں الف ـــ ہے، دوسرے وہ تلفظ میں دو ہے چنانچہ شعراء نے وہ بھی باندھا ہے۔ خود نظیر کہتا ہے۔

خفا ہو ان دنوں کچھ روٹھ بیٹھی ہے جو ہم سے وہ
تو اُس کے غم میں جو ہم پر گزرتا ہے سو مت پوچھو

جو دیکھی میں نے وہ اُس کی خوبی مری زباں سے ہو کب ادا وہ
وہ زلفیں اس کی سیاہ پر خم کہ ان کے بل اور شکن کو یارو

نہ پہنچے سنبل نہ پہنچے ریحاں نہ پہنچے ناگن نہ پہنچے کالا
تھا ایک دن وہ دھوم کا نکلے تھا جب اسوار ہو

ہر دم پکارے تھا نقیب "آگے بڑھو" "پیچھے رہو"
یا ایک دن دیکھا اُسے تنہا پڑا پھرتا ہے وہ

غالب فرماتے ہیں :۔

ہمیں پھر اُن سے اُمید اور انھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو

اسباب ہے جہاں کے کچھ اب پاس گو نہیں
یہ فکر تو نہیں کہ یہ ہے اور دو نہیں (سودا)

پس دو کی ہے کو تلفظاً داو سمجھنا چاہیے:-
سوداؔ کے کلام میں ہم کو اسقاط عین کی مثالیں مل گئی ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں۔

اس عقدے کو کیجیے گا ہم پر بھی صاف
کہ وضع جہاں سے یہ بر خلاف
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ
نیت قطعہ تہنیت خان زماں ہے
عجیب زاویوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پر ہے جس کا قدم تلک ہے طویل
گریباں چاک گرد اس کے اک عالم
کرے تھا نوحہ و فریاد و ماتم
سوداؔ تجھے کہتا ہوں نہ خوباں سے مل اتنا
تو اپنا غریب عاجز و دل بیچنے والا
خرید عشق نے جس روز کی متاع چمن
جو نقد جہاں پڑی قیمت تو دل بیعانا تھا
سودا ہوتے جب عاشق کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دوانے جب دل دیا تو پھر کیا
کون سا مجھ سے حسن تردد عمل میں آیا تیرے حضور
دل کو غارت کر کے میری جاں کو کیوں پیغام کیا
شیخ ہے دل پہ ترے بس کہ تعین کی نشست
اس سبب سے ہے تری ریش دراز عقل ہے پست
کہیں رکھ ناک پر عینک، مطالعہ کر کے وہ اس کو
بدقت میتواں ــــــ الخ

کچھ سیم سٹلو[1] ہی نہ گا دیں گی بجا ڈھول
ڈنکا ہے دمادے کا کہ یہ مصرع ہے انمول
روتی تو ——————— الخ

سودا کا ایک شاگرد کہتا ہے۔

گزرا ہے وہ عالم میں اک استاد زبردست
کیا کیا کروں اوصافِ سخن اُس کے میں تحریر

پھر یہی شاگرد مصحفی کا یہ شعر نقل کرتا ہے اور مزہ یہ ہے کہ عین کے گرنے پر اعتراض بھی کرتا ہے۔

مصرع سے بصد خونِ جگر مصرع کو چسپاں
کرتے ہیں، تو پھر وہ بھی دو پلکے کی ہے تعمیر

اُردو میں اسقاطِ عین کی کچھ اور مثالیں

غافل جہاں کی دید کو تو مغتنم سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اِس عالم کو خواب میں (دردؔ)

کیا جانیے کہ آج کس عاشق کی ہے اجل
کیفی ہوا ہے اب تو مرا یار بے طرح (تاباںؔ)

ہوا داغوں سے ہے مزرعِ مرا کیا چٹ سب عشق نے گھر مرا
کھا کھا کے لختِ جگر مزا یہ کباب کیا مزے دار ہے (منتظرؔ)

یوں پکارا اٹھا ترے در پہ شب مجھے چور کہہ کے وہ بد لقب
ترا آج عس ترا آج عس ترا آج عس ترا آج عس (محکمؔ)

مرا معاف کرنا کہا اور سُنا ——————— (میر حسنؔ)

اِس عزت کا باعث ہو تم چار بھائی
لڑو لڑو نہ آپس میں زنہار بھائی (ارشدؔ، دافع الوساوس)

گئے نہ سوئے حرم کسی دن نہ کام دیرِ مغاں سے رکھا
سلامتی بس اِس عشق کی ہو یہیں سے دونوں کو بندگی کی (تسلیمؔ)

---

[1] سٹلو — بیہودہ عورت۔ بے سلیقہ عورت۔ پھوہڑ عورت۔ احمق عورت۔ (ش)

خادم اب ان کو اک نئے کمرے میں لاتے ہیں
تعظیم اور تواضع سے لاکر بٹھاتے ہیں (ارشد۔ مرقع حکمت)
اب اس کے دل سے بخل کی جڑ تک اکھڑ گئی
نیکی اور تواضع کی خو اس میں پڑ گئی (ارشد مرقع حکمت)

سوداؔ کے دو اور شعروں سے ثابت ہوتا ہے کہ عین کو تلفظ کے اعتبار سے الف مانا گیا ہے۔

لے مرے دل کو دے کے اپنا دل
سنگ کے مول یہ بکے ہے لعل

جس غزل کا یہ شعر ہے اُس کا مطلع ہے۔

کھینچ شمشیر، چاؤ دل سے نکال
آج در پر ترے پڑا ہوں نڈھال

دوسرا شعر یہ ہے۔

جب سینے لولیوں سے یہ طعنے
تب تو دل بیچ ہو کے کھسیانے

باوجودے کہ اسقاطِ عین کی اس قدر مثالیں سوداؔ کے کلام میں خود موجود ہیں، پھر بھی جہاں اس نے میرؔ کے ایک مرثیے پر مخاصمانہ نظر کی ہے، وہ اس خطا سے چشم پوشی نہ کرنا عین صواب جانتا ہے۔ اِس مخدوش مرثیے کے سوا مجھے میرؔ کے کلام میں اسقاطِ عین کی مثالیں نہیں ملیں)۔

انتخاب نقص میں مولوی عبدالغفور رجان نساخؔ نے بہت سے شعر انیسؔ اور دبیرؔ کے بھی نکال دیئے ہیں جن میں عین تقطیع سے گر جاتا ہے۔

غلام علی آزادؔ نے اِس اسقاطِ عین کو اپنی کتاب تذکرۂ حسن ادانۂ عامرہ میں عاقل خاں شاہجہاں آبادی کے حالات میں بہت شد و مد کے ساتھ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نہ فقط شعرائے ہند دریں غلطہ گروہ اند بل پائے مردم عردم ولایت ہم درگلابۂ ایں عین نغزیدہ است۔ اس کے ثبوت میں خواجہ باقر عسرت شیرازی کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

مرا پند خردمنداں بحال خود نمی آرد
بہ ایں افسانہا مجنونِ عشق عاقل نمی گردد

مثنوی[1] ناخدا ایک شیرازی کی میری نظر سے گزری۔ اُس میں اکثر اشعار میں عین گر جاتا ہے شعرائے فارسی کے کلام سے اسقاطِ عین کی کچھ اور مثالیں :۔

(1) عاقل خان شاہ جہاں آبادی

ناتوانی تختہ بندیک مقام عاقل مباش
خاک بر سری کند در خانۂ آئینہ آب

اے بہ نقاب عارضت شعلۂ بالِ نگاہ
عکس تو در آئینہ یوسف مصری بہ چاہ

(2) ناصر علی سرہندی

اے رگ جان بہاراین ہمہ بے رحمی چیست
خاک از مقدم تو خوں شدن عادت دارد

(3) غنی کشمیری

پیرہن گل تن گل عارض گل لب دلدار گل
باغبان صنع بستہ دستۂ زیں چار گل

(4) ظہوری ترشیزی

بدستم دہ آن رشکِ یا قوت را
کہ سازم علاج عقل فرتوت را

(5) قاآنی شیرازی

یک روز چو بگذشت برہ دختر کے دید
مانند سگ عو عو زد و آہنگ قمر کرد

(6) صاحب :۔ ترا ہجدہ ہزار عالم بود در کشورِ حیواں

پس جب کہ اس کثرت سے اسقاطِ عین کی مثالیں شعرائے فارس و ہند دونوں کے ہاں موجود

---

[1] شاید انیس العارفین اُس مثنوی کا نام ہے۔ میں نے یہ مثنوی (قلمی) مولوی سید محمود آزاد کے کتب خانے میں دیکھی تھی۔ ابتدائے کتاب میں ایک تقریبی قطعہ بھی خود مصنف کے قلم سے لکھا ہوا تھا۔ دیکھا تو اس مختصر قطعے میں بھی بعض جگہ عین گرتا تھا۔ (ش)

ہیں تو پھر اس کو عیب قرار دینے کی وجہ ـــــ اولویت اور چیز ہے اور عیب شے آخر ـــــ اولیٰ ہے کہ الفاظ جو جس زبان کے ہیں، اُسی طرح اُردو میں ادا کیے جائیں، لیکن اگر اور طرح بندش میں آئیں تو خواہ مخواہ معیوب نہیں کہہ سکتے۔ طرفہ یہ ہے کہ خود عرفی میں بہت سے اشعار میری نظر سے گزرے ہیں جن میں عین کو تقطیع میں جگہ نہیں ـــــ سوا اس کے کہ اُس کو ہمزہ قرار دیں اور ساقط کر دیں۔

(ب) ح کے ساقط ہونے کی مثال بھی سوداؔ کے کلام میں موجود ہے ـــــ

دنیا نہیں اے یار تلاشِ اپنی سے منظور
کرتا ہوں اِس حجت کو میں اتمام جہاں پر
اور ان کے حُسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے لیجیے جو مول

سوداؔ کے ایک شاگرد لکھتے ہیں:۔

بہتر تھا کہ دیتا کرارا دے کی تو اپنے
اس شعر کے ساتھ حاشیے میں شرح بھی تحریر

(ج) اسقاط ہ

"ایک ہی" کا جواب یہ ہے کہ یا تو ہے مخلوط ہو کر کاف کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، جیسے کبھی، سبھی، ابھی وغیرہ میں یا ہی کی ہے۔ کہیں ہے، ہے، کہیں ہمزہ۔

سوداؔ کے ہاں ہے کے اسقاط کی مثال بھی موجود ہے:۔

تب وہ ناچار ہو کے جب ہارا
کہ یہ بات ہاتھ ہاتھ پر مارا
غرض عجب کچھ ہیں درہاتے سفتہ حافظؔ
بر آسماں چہ عجیب گزر گفتہ حافظؔ
سماعِ زہرہ برقص آورد مسیحا را
لیجیے یہ بھی دل اپنے میں نہ رکھیے ارمان
لیکن ہوتا نہیں کچھ تم سے لیا میں نے جان
پس ہمت کے نزدیک ہے کیا بھلا
کہ میں اور پر ٹالوں اپنی بلا

بے کفن بے گور ہے خیمے اندر وہ پڑا
جس کی صورت تھی بلا تشبیہ پیمبر سائیاں

(انشا) رہ فضیحت نہ ہو چلوں تو مجھے چھوڑنے دے
دیکھ یہ جاگہہ ہے بے پردہ، مرے ہونٹ نہ چوس

سودا اور انشا کی سند سے اگر تسکین نہ ہوئی ہو تو حضرت نظامی کا شعر لیجیے:۔

یا بُنَد ہیچ کس از بادہ پرستاں بیدار
یا چو من مست بُدند ہیچ کس ہشیار نہ بود

ہیچ کی تاویل تو ہو سکتی ہے کہ اہیچ ہے ہشیار کا کوئی جواب نہیں۔
عرفی اور قاآنی بھی تائید کو موجود ہیں:۔

پیشِ عرفی مدہ از دست عناں، کایں اُستاد
خویش را ابلہ نمودہ است، ولے ابلہ نیست

(عرفی شیرازی)

پند مرا بجاں شنو، دل بنہ بر نہالِ نو
تن بسلا شود گر درد سر عشق یار دوں

(قاآنی)

سلام علیکم سلام علیکم
بحمد اللہ بھائی مسلماں ہیں ہم تم

(مولوی نذیر احمد لکچر منظوم)

ذکا اللہ صاحب کے دیکھو رسائل
ہے کیا اُن کی تحقیق و تدقیق کامل

(اشہری۔ شہر لندن کا فوٹو)

ہر اک شان میں خوشنما دلرُبائی
تعالے اللہ خود زور تیری خدائی

(ارشد۔ واقع الوساوس)

وہ عرض تو پھر ہوگی مگر یہ تو بتاؤ
بسم اللہ جو اِس بزم میں آتے ہو تو آؤ

(ارشد — چندہ نامہ)

جب تک ہوویں نہ یار ہولی میں
اپنی آنکھوں میں خار ہولی ہے

(منشی سید احمد دہلوی)

وحدت کے سوا ہیچ سمجھتے تھے ہر اک شے
معنی الہ کھول دیے شکل میں لا کی

(ارشد — تضمین ارشد)

چھیر ہارے میں ایک تو اسقاط ہا ہے — دوسری ترکیب یہ ہے کہ چھیر کو ابر کے وزن پر پڑھیں۔

(و) اسقاط ر —

اور کی مختلف صورتیں تلفظ کے اعتبار سے :-

اور کی رے گرنے کا جواب یہ ہے کہ اور کتنی طرح سے تلفظ میں آتا ہے۔ کہیں تو اور بروزن قول کہیں ار بروزن زر شیمام خمۃ — کہیں باسقاط را بروزن ضو — کہیں باسقاط را بروزن لو۔ کہیں فقط واو مضموم۔ یہ جتنی صورتیں ہیں سب اور کی ہیں، لیکن یہ لکھا صرف دو ہی طور سے جاتا ہے اور یا و۔ اِس مقام میں و[1] لکھنا تھا مگر چوں کہ تلفظ کے مطابق لکھنا اس قدر رائج اس

---

[1] واو ماطقہ ہندی:-

تجھ سے گالی و جھڑکیاں کھائیں
الغرض لے گیا بسر اوقات (مسافر)

ہم چور و چیز سنتے تھے سو آپ کو دیکھا
دیں گالیاں اور مجھ سے ہوتے آپ ہی برہم (رنگین)

(بقیہ اگلے صفحے پر)

زمانے نہ میں تھا، اِس لیے تلفظ کچھ مقصود ہو مگر لکھا وہی ایک طور سے جاتا تھا۔ ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "کر" سہوِ کاتب ہے۔

اب یہاں پر کسی قدر غلط العام فصیح کے قاعدۂ کلیہ کی بحث بھی بہت ضروری ہے۔ اوائل عہد شاعری میں تصحیح الفاظ کا نصاب جداگانہ تھا ــــ اُس وقت زیادہ تر اس بات پر نظر رہتی تھی کہ بول چال میں وہ الفاظ کس طرح رائج ہیں۔ مثلاً طرح کہ گو لغتہً بسکونِ اوسط ہے لیکن بحرکتین زبان زد ــ کبھی تخفیفاً تلفظ میں "ح" بھی ساقط ہو جاتی ہے۔ گو تسبیح بروزن تصحیح ہے لیکن تلفظ میں تسبی، اسی لیے اس کی جمع عموماً زبانوں پر تسبیاں۔ ایسے الفاظ کی نسبت شعراء کی رائے یہ تھی کہ اگر روزمرّے کے مطابق بندھ جائے تو وہی افصح ہے۔ لیکن اگر کوئی تصحیح لغت کے ساتھ باندھے تو اس میں بھی مضایقہ نہیں ــ رفتہ رفتہ کُل جدیدٌ لذیذٌ کے لحاظ اور کسی قدر

باقی ص 331 سے آگے

لے جاتے ہیں وہ جس راہ سے ہے خارستاں
نہیں تالاب و کنوئیں کا کسی منزل میں نشاں

(سودا)

کر چرخہ و پونی جو میں پیدا کروں چونی
کھا جاوے ہے یہ کھوک رکھے بیل سے دونی
کھڑواؤ منخرہ و مچھندر ہے ان کا نام
نتھ ناک میں ڈال اور پہنا ساڑی و لہنگا
بکواؤں گی اِس بھڑوے سے کوّے ہی پکڑوا
چمن دل میں عشق بویا تھا
داغ و شعلہ ہوا گُل و بوٹا

(سوداؔ)

گانا بڑی تعلیم بجانا ہے بڑا گن
بس اڑتا ہے لنگڑہ وسا رنگ شب و روز

(ارشد۔ تضمین ارشد) (ش)

اظہارِ علمیت و امتیاز کے خیال نے اُن روزمرّہ کے مستعمل فصیح لفظوں کو شعرا کی لفظی انجمن سے خارج کردیا۔ اِس قسم کے غلط العام نظیرؔ کے ہاں بہت آزادی کے ساتھ مستعمل ہیں۔ سوداؔ کے کلام کو میں بطورِ سپر پیش کرتا ہوں تاکہ جتنے ناروا حملے نظیرؔ کے کلام پر اس خصوص میں ہوتے ہیں رد ہو جائیں۔

سوداؔ فرماتے ہیں :-

(جواہر بفتح ہا)

اِس نصائح کی سند بجز کلامِ عرفی　　لا کے وہ میرے لیے بہ زجواہر اشعار
لگے فرمانے کہ استاد انھوں کا سن کر　　ویسے شعروں کو کہے تھا نہ کہہ کر اشعار
کتی دین و مذہب کے ہیں یہ جواہر　　کہو آپ کی جا انھیں تو تو جا کر

(ارشد دافع الوساوس)

مسلا مسائل کہا حضرت نے سن کر تم ہو گم راہ
نہیں مسلہ مسائل سے کچھ آگاہ
انتظاری لیکن اب دل کی بے قراری ہے
وصل کے دن کی انتظاری ہے

(قاآنی)

ذوی الاحترام بدہر آصف الدولہ جس کا ہے نام
سلیماں شکوہ وذوی الاقتشام
رخش تو بنی عم براق است، ازیراک
میداں ہمی از چرخ کندگاہ تگ و دو

(قاآنی)

بیگانہ

دیکھو یارو عجب زمانہ ہے　　بیٹے سے باپ کیا بیگانہ ہے

کمیں

کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے کمیں　　پاس سے میرے تم نہ جاؤ کہیں

مُوَرَدْ

یو ہیچ زباں اُن کی سے شعر تو سرزد ہوا　　کاتب بیچارہ مفت لعن کا مُوَرَدْ ہوا

قرض

بنیے کا دیوال بند ایک قرض دار تھا　　اس کے ادا کرنے میں سخت وہ ناچار تھا

بیانہ

خرید عشق نے جس روز کی متاع چمن　　جو نقد حسن جاں پڑی قیمت تو دل بیعانہ تھا

دوانا

جو ذکر بعد مرے ہوگا جاں نثاروں کا　　کرو گے یاد تجھی کو وہ اک دوانا تھا

بگانا، دوانا

اپنے کا ہے گناہ بگانے نے کیا کیا　　اس دل کو کیا کہوں کہ دوانے نے کیا کیا

اعلان نون دین دار

نہ کر وہ کام دلِ دین دار و کافر سے　　کہ پہنچے تا بدر کعبہ و کنشت شکست

فی الحقیقۃ میں

کہتے ہیں نیلم جسے تھا فی الحقیقۃ میں وہ لعل　　ہوگیا ہے رشک سے تجھ لب کے رنگ اس کا کبود

ہم جم

ہے مسلم حسنِ مہ ہر چند پیشِ کائنات　　گر ترے ہم جم ہو بیٹھے تو ہے پہلو کا غدود

خواہ مخواہ.

اسی سے واعظِ احمق کو پست فطرت جان　　ہوا ہے چڑھ کے یہ منبر پہ خواہ مخواہ بلند

اصل السوس

چوبِ[1] اصل السوس و پرسیاوشاں مل کر　　جوں تیر نہ چلنے میں کرے دیر ہوا پر

جدی

دام الفت کو اسیروں کی جدی ہے پرواز　　کہیں اڑتے ہیں ترے بال کہیں میرے پر

غلط العام

لب و لہجہ ترا سا ہے یہ کن خوبان عالم میں　　یہ غلط العام[ش] ہے جگ میں کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں

---

[1] سعالِ مزمن فلفل بھلا ہو دفع کس ڈھب سے
پپستاں ہے نہ زوفا ہے نہ اصل السوس شیشے میں　　دشہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہم شہری

شوقِ زبان تک ہم شہریوں کو بھولا — نامہ جو اُس کو پہنچا اُن بے مروتوں سے
کھولا اُسے تو ہرگز اک لفظ بھی نہ سمجھا — قاصد سے پوچھے معنی رو رو اشارتوں سے

آمان

امن و آمان سے گزرے بجہان عالم کو — دلوں کو چاہیے آرام ہو جانوں کو چین

مطالا

اگر اک ورق اس کا ہاتھ میں جا مولوی کے دو — کہیں رکھ ناک پر عینک مطالعہ کر کے وہ اس کو

مرض

یہی مرض الموت تھا قسمت ہیں میری یا نصیب — حاصل اِس تدبیر سے کیا کرنے میں طبا جیب

ترکیب فارسی و ہندی

غرض جب بات چلنے ہی پہ ٹھہری — نمازِ ظہر پڑھ وقت سپہری
بنا دیں سبحہ جو اتنے ہی لے کے مروارید — کبھو تمام نہ ہووے وہ ڈورۂ تسبیح
عالم تمہارے پیچ میں آوے گا آج جاں — تم نے سجا ہے چہرۂ بل دار بے طرح

(تاباں)

تحریک ساکن کی مثالیں :-

قبر بالفتحتین

ترے در پہ ہم آکے پڑے ہیں صنم نہ سفر کے رہے نہ وطن کے ہوتے
ترے ہجر میں بانیٔ ظلم و ستم نہ قبر کے رہے نہ کفن کے ہوتے

(محکم)

عمرو متحرک الاوسط

اک کوڑی کو نہ لیجے جو فروشندہ کہے — ہے بکاؤ کوئی زنبیل عمر لیتا ہے

بقیہ صفحہ 334 سے آگے

غلط العام فصیح ہے جہان میں معروف
غلطی کیا ہے ان اشعار کے ناخونوں میں معروف (ش)

زنبیل ہے شمس کی دل فکر خیز یہ　　اس کو کسی طرح سنزنہار توڑ یے
(انشاؔ)

در معنی سے مراصفحہ لقا کی داڑھی　　غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل
(غالبؔ)

عمرو ساکن الاوسط

آدھ سیر آٹے کا خدا ہے کفیل　　پیٹ اِس کا ہے عمرو کی زنبیل
(سوداؔ)

خضر بفتح ثانی

صد مرتبہ گر دو بتر از زہر ہلاہل　　گر ز آنکہ فتد عکس تو در آب خضر بر
(قاآنیؔ)

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار　　اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
(حالیؔ)

شمر بفتح ثانی

دل ایسے شخص کو مومن نے دیدیا کر وہ ہے　　محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا
(مومنؔ)

نذر = نذرؔ

میراں وہ خامہ گھی کے ترے گلگلے تلوں میں　　بھینسا تو ایک کیا ہے دیوتی نذر کروں میں

قالبوت۔ کالبد

میراں سے اُس کی جو روتب کہنے لاگی رو رو
جو قالبوت تم سے پیروں کا بن رہا ہو
کھودے تمہارے آگے یوں اس کی آبرو کو
جو تم میں کچھ کرشمہ ہووے تو یہ سزا دو
آنکھوں سے ہووے اندھا کوڑی ہو اس کی کایا

ضاحک کے پیچھے پہنچا اس طرح ہو کے مبہوت　　سوجھا نہ آنکھوں آگے یہ... ہے کہ ہے...

سالبوت: ثابت۔ ایسی بنا کے ماری ذرہ رہی نہ سالبوت

طُفانی، طوفانی

کہنے لگی کہ میران بھڑوا ہے یہ طوفانی

حَلُوآ

یوں بھی نہ ہو اس سے تو میں بات اور بتادوں　　دو چیتھڑے رنگ کر حَلُوآ خاتون بنا دوں

خاتون

رنگ چھاپ سے دو حَلُوآ خاتون میں دوں گی　　کہتا پھرے بھڑوا جنیا لال ملوں گی

حَلُوآ، خاتون

ان باتوں سے ہوتے گی نہیں پیٹ کو سیری　　لے کر حَلُوآ خاتون کر لے شہر میں پھیری

طبع

خاموش کر اے سودا تیری طبع ہے عالی　　موقوف کر زبان سے یہ گفتگو رزالی

مُباف، موباف

اُن نے تب اپنی چوٹی سے یہ کھول کر مُباف　　مشکین انھوں کی جڑ کے کہا کیجیے معاف

اصطَبل

جو اصطبل میں کتے گھوڑے ہیں سو کیا امکان　　کہ ہووے گھاس کے پیچھے کان کے آگے نشان

اصطبَل

بدیمن یہ کہ اصطبل او جڑ کرے ہزار

دسخطی و ستخطی

اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری　　سوال دسخطی کو پھاڑ کر کے پنساری

کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

لاحُول

یہ آگے اور چلیں کہہ کے زیر لب لاحول　　(بضم حاکیوں کر تول بول رول کا قافیہ ہے،

جہان آباد

جہان باد تو کب اس ستم کے قابل تھا

عُلما

اور ان کشمیریوں میں جو کہ اب عُلما دیں ہیں گے　　سمجھتے ہیں وہ اپنے تیئں جو کچھ ہیں گے ہمیں ہیں گے

خدع

خدعے سے پھر مکر سے کرتے ہیں گے گریہ وزاری

کسب

اب یہ کہہ تو کہہ ہم کہا جاویں   جو بتادے کسب سو کر کھاویں
نہیں ہرگز سمجھتے حق کو یہ مرغوب ناحق ہیں   ہر اک پیشے کسب میں خوب ماہر او ر حاذق ہیں

مسئلے

گدھی کا... نا مسئلے میں بتلاتے ہیں جلے ہے

بچارا

بہت سید بچارے یہ انھیں تلقین کرتے ہیں

قرم ساق

تب یہ کہتا ہے کیا وہ قرم ساق   دوں اے خندی تجھے اگر میں طلاق

خصم

یوں ہزاروں سے جو رو کیوں نہ ...   لیکن اس سے خصم نہ ہاتھ اٹھاوے

غیور تبلشدید یا

یعنی نواب سلیمان فرد نام آصف جاہ   عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ دکوچک

منہیات بروزن خطرناک

دور میں اس کے ہے یاں تک تو منہیات ذلیل   کش مکش سے پرنے اٹھ، بنگ سلاز یر کنک
حکم صلاح سے ترے اے حاکم جہاں   عرصہ اب اس قدر وہ منہیات پہ ہے تنگ
ہے کش مکش شراب کو جب کیجئے نظر   جس وقت دیکھیے تو ہے خنکوں کے نیچے سنگ

مباحت بمعنی اباحت

بعیش گاہ جہاں خوشش ہو خرمی نے آج   کیے بدل بمباحت منہاہی کے احکام

(سودا)

اغلاط میر:۔

قران بروزن گمان

مت مانیو کہ ہوگا یہ بے درد اہل دیں   گر آوے شیخ پہن کے جامہ قران کا

مساہلہ بمعنی ساہلا

ہوا ہوں خاک پہ دل کی وہی ہے ناصافی　　ابھی اس آئینے کی کرنی ہے جلا مجھ کو
مگر کہ مردن دشوار میر سہل ہے شوخ　　ہلاک کرتا ہے تیرا مساہلا مجھ کو

مسیت بمعنی مسجد

عجب نہیں ہے نجانے جو میر چاہ کی ریت　　سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت
مت ان نمازیوں کو خانہ سازِ دیں جانو　　کہ ایک اینٹ کی خاطر یہ ڈھاتے ہیں گے مسیت

عیب اکفا

اُسی بن میں رہنا اُسی بن میں راہ　　وہیں شام کا حُسن لطف پگاہ
اُسی بن میں وہ جھیل گہری بہت　　ہوئے وہیں صید جری و بحری بہت

اتنی مضبوط اسیر کے بعد اب ہمیں نظیر کے غلط العام سے کچھ ڈر نہیں — عام نہیں بطور خاص ملاحظہ ہو۔

دِوَار

وہ گرد دیوار کو دیں ہم کو ٹھا پھاند جا دیں

دوَال

اچھلیں دوال پا کھے اور پھاندیں چارپائی

اعَصا

کل مجھے دریا اُپر خواجہ خضر جو مل گئے　　سبز پیراہن گلے میں ہاتھ میں اعصا لیے[1]

محلات

یا جھونپڑے دو کوڑی کے یا لاکھ کے محلات

اشَرفی

پیسے روپے اشرفی یا سیم وزر کا پترا

مسَودا

مت چھوڑ قلم، جان، لکھے جا تو مُسَودا

---

[1] میر حسن — لیے سونے روپے کے عاصے تمام۔ (ش)

افیم، افیمی

کھا کر افیم ظالم مت ہوجیو افیمی

داستانہ

داستانہ ہاتھ میں اور پشت کے اوپر سپر

نصیبا

ایسے طالع ایسی قسمت پہ نصیبا کوئی پاتے

خلدِ عدن

اُنھی کے واسطے خلدِ عدن ہے

سند

از یک سخن رواں دو لبش وادہ صد شکست　　تسنیم و کوثر و عدن و سلسبیل را
(قاآنی - پریشاں صفحہ 33)

حضرت زہرا تری اماں نے کیا یہ ماجرا　　پیاس سے مرنے کا فرزندوں کے مطلق نہیں سُنا
کیا عدن میں جا کسی حور و ملک نے نہیں کہا　　اب تلک آئی نہیں زہرا ے اطہر سائیاں
(سودا)

سبکی

جو لے سبکی سے نام مرتضےٰ کو

گمزی

گرد اس کے گمزیاں کبھی چمکتی ہوتی ہیں چند

جنگل

کیا ابرو ہوا کوہ جنگل ارض و سموات

سند اسقاط نون

کہیں بن زنجیر اُسے گھر نہیں　　ذری چین شام و سحر نہیں
خنجر سن اس کو گلے نشہ کے لگ لہو رویا
کٹے گوشوارے سکینے کے　　خنجرِ جفا سے کمینے کے
رنگ کھیلنے کا شادی کے دیکھا یہ عجب طور　　جز خون کی چھینٹوں کے نہ تھا کپڑوں پہ کچھ اور
(سودا)

دوانہ

پھرے دوانہ سا ہر طرف وہ اسی کی چاہت میں ہوش کھووے

ہیولے

آباد ہیں چھپر کھٹ ماچے پلنگ کھٹولے   دلبر کہیں بغل میں امرد کہیں ہیولے

چغد

گِد اور چغد دہاڑے اور پھڑ پھڑاتے اُلو

قرض

کہتے ہیں ہنس کے قرض خواہ سے ہر اک اک بار   جو خالی آتے ہیں وہ قرض لیتے جاتے ہیں

فند

موت آن لتاڑے گی آخر کچھ مکر کرو یا فند کرو   بس خوب تماشا دیکھ چکے اب آنکھیں اپنی بند کرو

بگانہ

اِس میں ہی دشمن اس میں ہی اپنے بگانے ہیں

مُتصدّی

اِس میں وکیل بخشی و متصدّی اور امیر

نفع

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن

زہر

ترکاری ساگ پات زہر امرت اور دوا

بوقلموں

گھڑی بھر بیٹھ کے ہم پاس کر لو عیش بوقلموں

شہر پناہ

ٹوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ

تسبی

یاں حبۂ تسبی دور ہوتے واں ساغر شیشے چور ہوتے

حَسنین

توپھر حسنین کے صدقے سے اُن کو ہم بھی واں دیکھیں

اشتر

جو مانگا اک شتر اُس کو دلایے سینکڑوں اشتر

صلوات

صلوات پڑھ کے یہ بھی سناتا ہے تب نظیر

قرآن

پڑھتے ہیں آدمی ہی قـرآن اور نمازیاں

سـند

مت ملپنو کر ہوگا یہ بے دراہل دیں　　گر آوے شیخ پہن کے جامہ قران کا

(میرؔ)

اسی طور پر حضرت امیر خسروؔ نے بھی باندھا ہے مگر شعر اسوقت یاد نہیں ہے۔

چرپائی

چرپائی بیچ کھائی اور بان کو جلا کر　　روٹی پکائی رورو اور کھاتی آہ بھر بھر

قسم

لیلیٰ کی شکل پھرتی تھی آنکھوں میں ہر قسم

عجوبہ

انسان عجوبہ ہیں تو حیوان تماشا

صحن

باغ میں گھر میں صحن میں پیڑ سبزی کے لگا

صَرف

صرف حرام کی کوڑی کا جن کا ہے بیوپار　　انھوں نے کھایا ہے اس دن کے واسطے ادھار

ذبح

بے جرم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے　　اس ظالم کے بھی لوہو کا پھر بہتا ندی نالا ہے

قطرجات

اُس کے عرق سے جسم کے یہ قطرجات ہے　　　اور اُس کی اُس کے فصل سے یارو بخات ہے

سند

زضو بجات بگردوں شود ز فیر نفسیہ　　　ز دیر جات بگردوں رود غریو وغزن

(قاآنی)

چدر

ماں پیچھے ایک میلی چدر اوڑھے جاتی ہے

مزدر

ڈھاتے تھے واں مزدر توتن کی محل سرا　　　پر گھر بنا رہے تھے دوالیں اٹھا اٹھا

غربا

اور سب غریب غربا دل شاد اپنے گھر میں

یہی چند اعتراضات سخت تھے جن کا جواب کافی طور پر دیا گیا۔

زبان کے تبدل کے سبب اُس وقت کے اور بہت سے محاورے ہیں جو ہم لوگوں کو معیوب معلوم ہوتے ہیں جیسے اضافت[1] اور علامت فاعل کا حذف کرنا۔ بہت سے الفاظ جواب متروک ہو گئے ہیں۔ مثلاً

اب تیں : اب تک کے	کب تیں : کب تک کے	ماٹی : مٹی کے
لاگا : لگا کے	ایدھر[2] : اُدھر	جاگہ : جگہہ
نین : آنکھ	سجن : معشوق	برہن : جدائی کی ماری
برہ : فراق	ہیگا : ہے	ندان : آخرکار
کرکر : کرکے	انہوں کے تیں : ان کے تیں	نت : ہمیشہ
اُپر : اُوپر	دگے ماتی جانا، قافیہ تنگ ہونا (؟) رویا : رو دیا	سین : نین

---

[1] اس برابر (ش)

[2] دنیا ایدھر کی گو اُدھر ہو جاتے　　　بڑے خوجے کی کس طرح خو جاتے

(انشا) (ش)

بٹ مار : راہ زن	ہستی : ہاتھی	سیتی : سے
کوئی ہموزن کی : گئی ہموزن گی	کہوے[1] : کہے	رہوے[2] : رہے
پھیر : پھر	ٹک : ذرا	کے : تنک

یہ الفاظ سوداؔ اور میرؔ کے یہاں بھی موجود ہیں۔ نظیرؔ چونکہ میرؔ کے معاصر ہیں اس لیے ان کے کلام میں اس قسم کے الفاظ کا ہونا کوئی امر ان کے مرتبہ شاعری کا گھٹانے والا نہیں ہو سکتا۔

نظیر کا باغ

باغ سے میری مراد یہ نہیں کہ نظیرؔ کوئی بڑے آدمی تھے۔ واقعی انہوں نے نوابوں اور امیروں کی طرح کوئی بڑا سا باغ لگایا تھا اور اس میں اہتمام کرکے ہر جگہ سے درخت منگاتے تھے۔

بہار کے دنوں میں ہر روش مہک جاتی ہے اور پھل کے زمانے میں ہر شاخ پھلوں سے لد جاتی ہے۔ شعرا گو بڑے آدمی نہ ہوں لیکن خدا کی طرف سے ان کو لطف انگیزی کی وہ آنکھیں ملی ہوتی ہیں کہ باغ لگاتے کوئی مگر واقع میں اس کے مالک یہی ہیں۔ لگانے والوں کو ایک مالی یا باغبان سے زیادہ رتبہ نہیں۔ شعرا کا باغ ان کے صحن خیال میں ہوتا ہے، جس کی وسعت ہر باغ سے زیادہ ہے وہ اپنے مذاق اور پسند کے مطابق روز ہر تھالے میں ایک تازہ پودا لگاتے ہیں اور

---

[1] کہوے۔

اس شاہ کے اگر لب و دندان کی صفا   کہوے کوئی کہ لعل و گہر ہیں یہ بے بہا   (ش)

[2] رہوے

تا ابد رہوے یہاں بھی اور وہاں   حرف رسم خط کتابت درمیاں

یہ محاورہ ذوقؔ اور ناسخؔ کے ہاں بھی موجود ہے۔

آج ان سے مدعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں   پر نہیں معلوم کیا کہویں گے کیا کہنے کو ہیں

(ذوقؔ) (ش)

بوسے کا سائل ہوں کیوں مجھ کو نہ کہوے دور دور   قدر کیا محتاج کی حاجت روا کے سامنے

(ناسخؔ) (ش)

ہر روش پر ایک نیا گل کھلاتے ہیں۔ آرائش روز بروز ترقی کرتی جاتی اور رونق دن بہ دن بڑھتی نظر آتی ہے۔

اس مضمون کو ہمارے مکرم مولوی سید محمود جہانگیر نگری نے اپنے قصیدۂ معراج الخیال کے آغاز کے چند شعروں میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

دلم گل چین اسرار و خیال من گلستانش
فضائے ہر دو عالم گوشہ از یک خیابانش

خوشا باغ کہ طبش باغبان فکرش صبا آمد
قلم گلدستہ بند و صفحۂ قرطاس گل دانش

خوشا باغ کہ رشک خلد شد دامان آگاہی
ز رنگیں جلوہ ہائے دل کش گلہائے الوانش

تعالے اللہ چہ باغ ست ایں کہ ریزد گوہر مضموں
بہ جیب گوش عقل آواز مرغان خوش الحانش

تعالے اللہ چہ باغ است ایں کہ مے خواران معنی را
ضمان مستی جاوید آمد بوے ریحانش

زہے باغ کہ ماند تا قیامت تازہ گلہانش
نہ آں باغ کہ در یک ہفتہ ریزد برگ ریحانش

زہے باغ کہ رہ بنو دور و باد خزانی را
چہ در آرد ے چہ در بہمن بینی تازہ یکسانش

زہے باغ کہ نازک نکتۂ ہوش و خرد افزا
فزوں از خط منقوش ست بر اوراق و اغصانش

زہے باغ کہ معیتہائے رنگیں ست گلہایش
زہے باغ کہ چوں من بلبلے باشد غزل خوانش

نظیرؔ کا مذاق اس خیالی باغبانی میں امتیاز کی خصوصیت رکھتا ہے اس نے طبیعت کے ہرے بھرے باغ میں کوئی اچھا اور عمدہ پودا نہیں چھوڑا۔ جو پیڑ اس کو پسند آیا ہے تیزیٔ نظر کے قلم تراش سے اس نے اس کی قلم کاٹ کر ضرور اپنے جاوید بہار باغ میں لگائی ہے۔ اسی

سے اس کا باغ خیالی نہایت گھنا نظر آتا ہے۔ اس نے اپنے اس باغ کی ایک سچی اور اچھی تصویر بھی ہم لوگوں کی تفریح کے منظر پر کھینچ کر لگائی ہے۔ جس میں رنگ اس عمدگی سے بھرا ہے اور روشنی اور سایہ اس خوبی سے دکھایا ہے کہ کہیں تو ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر نظارے کو راحت کی نیند آتی ہے کہیں دھوپ کی جھلک دیکھ کر آنکھوں کو خود بہ خود سرور حاصل ہوتا ہے۔

آؤ کچھ دیر کے لیے ان کے اس پُر بہار باغ میں گل چینی کریں اور تازہ پھولوں کا گلدستہ بنا کر انتخاب کے گلدان کو زینت دیں۔

بیان عالم بہار:۔

دیکھو یہ پھولوں کا تختہ کس قدر مہک رہا ہے۔

شب کو چمن میں واہ واہ کیا ہی بہار تھی مچی
پھول کھلے تھے پھول پھول غنچے کھلے کلی کلی
بیلا چنبیلی، رائی بیل موتیا جوہی سیوتی
بادِ صبا بھی چلتی تھی عطر و گلاب میں بسی
رات تو کیا ہے عیش کی ٹھہری تھی آ کے انجمن
تارے کھلے تھے سہ رتن پھول کھلے چمن چمن
نرگس و بہار و یاسمن سوسن و طرے نسترن
کبک تدرو خندہ زن بلبل و قمری نعرہ زن

اس تختے سے تو یہ پھول ہاتھ آتے۔ بیلا، چنبیلی، رائی بیل، موتیا، جوہی، سیوتی، نرگس ہزار سنگھار، یاسمن، سوسن، طرہ نسترن سب آگے چلیے۔

تاج گنج کے روضہ کی تعریف:۔

جو صحن باغ کا ہے وہ ایسا ہے دل کشا
آتی ہے جس میں گلشن فردوس کی ہوا
ہر سو نسیم چلتی ہے اور ہر طرف ہوا
ہلتی ہیں ڈالیاں سبھی ہر گل ہے جھولتا
کیا کیا روش روش پہ ہجوم بہار ہے

سرو سہی کھڑے ہیں قرینے سے سبز تن
کوکو کریں ہیں قمریاں ہو کر شکر شکن
رابیل سیوتی نے بکھرے ہیں چمن چمن
گلنار لالہ و گل و نسرین و نسترن
فوارے چھوٹ رہے ہیں رواں جوتے بار ہے

یہ کئی نئے پھول اس تختے میں کھلی ہیں۔

گلنار، لالہ، نسرین۔

پھل پات کہیں شاخ کہیں پھول کہیں بیل
نرگس کہیں سوسن کہیں بیلا کہیں رابیل
(دیدہ بازی صفحہ 258)

یہاں پھر پھولوں کا تختہ ملا۔

بیلا گلاب سیوتی نسرین و نسترن
داؤدی جوہی لالہ و رابیل و یاسمن
جتنے جہاں میں پھولی ہے پھولوں کی انجمن
یہ سب تجھی میں پھول رہے ہیں چمن چمن

موتیا ہے چنبیلی ہے بیلا ہے۔

ہر لحظہ اپنے جسم کے نقش و نگار دیکھ
اے گل تو اپنے حسن کی آپ ہی بہار دیکھ
(نول کشوری صفحہ 93)

داودی اور گلاب دو نئے پھول ہیں

نسرین و موتیا و سمن بھی تجھی میں ہے
(نول کشوری صفحہ 92)

کوئی نیا پھول نہیں آگے چلیے۔

کیا قمریِ دل سوختہ کیا بلبلِ نالاں
کیا باغ چمن تختہ کا کیا زیر خیاباں

سب مل کے یہی بات پکارے ہیں ہر اک آں
گل بھی وہی سنبل وہی نرگس وہی ریحاں
اپنے ہی تماشے کو گلستاں میں آیا
(خمسہ غزل اصغر صفحہ 112 - نول کشوری)

اس میں سنبل اور ریحاں دو تقی چیزیں ہیں۔
وہ دیکھیے میاں نظیر آپ بیٹھے، باغ میں میوے کھلا رہے ہیں۔

میوے ہیں جتنے خشک تر اس باغ میں لگے
بادام پستے واکھ چھہارے و کھوپرے
خربوزے آم و جامن و لیمو چکوترے
نارنگی و انار بہی کولے سنگترے

سب خوبیاں بنی ہیں یہ آدم کے واسطے
اور دم بنا ہے آہ فقط غم کے واسطے

بلدیو جی کے میلے میں میاں نظیر ایک ڈالی میں میووں کی لیے کولے نارنگی سنگترے کھٹے کر رہے ہیں۔

(صفحہ 179 نول کشوری)

پھر ایک کاچھن کے پاس بیٹھے یوں بیر چن رہے ہیں
کوئی کاچھن سے کے چن رہا ہے بیر
میلوں میں اکثر اپنے باغ کا میوہ بیچتے نظر آتے ہیں
میلوں میں آم و جامن سیب و انار بیچے

یہ میوہ دار درخت تو ہندی شان سے لگے ہیں۔ اب باغ کی آرائش ولایتی مذاق سے ملاحظہ ہو اور دیکھیے کہ اس میں کس خوبی سے پھل لگے ہیں۔
پہلے انگور اور امرود لیجیے۔ محبوبے امرود طلب کرد۔ انگور آوردم۔ گفت دلت مے خواستہ گفتم چہ کنم نگاہم تغلبیہ پیراست ۔

ازیں معنی بخندید او بہ طرزے کز دگر دد خجل عقد ثریا

(طرز تقریر 19)

سیب، بہی، شفتالو، فالسہ، سنگترہ ملاحظہ کیجیے۔

نزد نازنینے کہ ذقنش دل آسیب کہ روے بہی نہ بنید ولبش آں قدر خاطر فریب کہ ہوس بوسۂ آں بہی از شفتالو نہ نشنید تشنہ بودم۔ پسند میوہ درمیاں آمد۔ گفت دلم را فالسہ و سنگترہ خوش مے آید۔ گفتم دلم نیز مے رباید۔ گفت چرا۔ گفتم بہ تشبیہ لب نزاکت گرا۔ چوں آں دل بر تبسم برلب آورد۔ دلِ من نیز فرحت یاب گردید — طرز تقریر

شریفے کو ذائقہ فرمایئے۔

شوخ لطیفہ پرواز شریفہ طلبیدہ۔ چوں پیش رسید۔ گفتم شریف تر گردید۔ گفت دلت بکفلیت دوید۔ گفتم جاے کہ بہتر وزود تر رسد مشرف باید گردید۔ وحصول دو فرحت باید گردانید۔ یکے شریفہ ودیگر لطیفہ۔ عنایت کرد گفت دلت خوش گردید۔ گفتم وقتے کہ از دستِ ناز خواہد رسید ؎

چوں زدست ناز ہم آمد بدست گفتم اکنوں خاطر من شاد شد

(طرز تقریر 23)

جامن نوش کیجیے۔

نزد نازنین رفتم و گفتم جامن خوب تر آمدہ است ؎

چہ گویم بے تکلف طرفہ جامن تواں کردن بیانش تا کجا من

گفت بر دمن خوش دارم۔ رفتم وزود آوردم۔ قدرے بمن داد وگفت دیگر۔ گفتم ہمہ ایں جامن۔ چوں خود تناول ساخت دوسہ تخمش برمن انداخت۔ خوش وقت شدم گفتم ؎

ازیں جامن ہمینم آرزو بود زلطفِ نازنین خوباں برآمد

(طرز تقریر 24)

ہر چند آگرے کے آم بہت اچھے نہیں مگر میاں نظیر کے باغ کے ہیں:۔

مضایقہ بنا شد

در فصل انبہ کہ پسند خاطر خاص وعام ہست وشہد وشکر بے قدرے التیام پیش نازنینے رفتم۔ گفتم انبہ ذائقہ قریب دیدہ آمدہ ام۔ گفت چرا نیاوردی۔ گفتم اکنوں چہ درنگ یکر رنج

اما ملِ نزاکت شامل نشود۔ تبسّم کرد و گفت خوب۔ رفتم و زرد آوردم۔ گفت چہ قسم است۔ گفتم ہمہ بترشی درشت۔ گفت اگر برآید۔ گفتم یک مشت۔ سرخ۔ سرخ روئی پسند سرسبزی نگاہ نیاز مند۔ وزرد ہم ایں کہ بخورند و روے گرفتنم زرد نکنند۔ ہنگام تناول ہماں قسم — گفت ہر چہ ازیں خوش آید باید گرفت شیرہ گرفتہ گرفتم گفت چرا۔ گفتم باطاعتِ حکم ہمیں خوش آمد — بخندید — زیادہ مسرور شدم و گفتم ؎

لذّتِ انبہ خوردن ایں طور　　پیش من بر ازیں نمی باشد

(طرز تقریر 28)

اس میوے کو ملاحظہ کیجیے جس کی شان میں ہے نرانجیر نام ست ہر میوہ ۔جنّت کے فواکہ سے ہے۔

پیش محبوبے رفتم۔ دیدم کہ انجیر نہادہ است و زلف گرہ گیر کشادہ۔ بقدرِ تفاوت نشستم گفت اگر دل پذیر چندے ازیں بگیر۔ دانستم بعزم تسخیر۔ گفتم کجا ایں توقیر۔ اگر لطف است ہمیں جا عنایت تاثیر۔ گفت ایں چہ تقریر۔ گفتم از دور انجیر و نزدیک زنجیر۔ ترک انجیر از بیم زنجیر۔ خوش تدبیر۔ گفت چناں۔ گفتم ؎

حیدرم دارد و صیاد فسوں مے خواند　　ہر کسے مصلحت خویش نکو مے داند

(طرز تقریر 29)

بلدیوجی کے میلے میں کا چھن کے ٹوکرے کے بیر تو کھا چکے ہیں۔ ایک بیر اور کھا لیجیے گو ترش ہے مگر ترشی مزے کی ہے۔

از شوخی شکر لبِ اُلفت دست داد۔ چوں مجال بوسہ نداشتم۔ آرزوے دشنام مے کردم۔ از شوخی نمے داد۔ حصول آں بے حیلہ ندانستم — روزے گنار ترشے ہمکنار پیش او بردم گفتم بسیار شیریں است۔ چوں آشناے دنداں کرد دشنام داد۔ مسرور شدم۔ گفت چرا۔ گفتم مراد من ہمیں بود۔ گفت ؎

قدر دشنام از لبِ خوباں　　دل مشتاق باز مے داند

گفتم ہمیں طور تبسّم کرد ؎

وایں تبسّم بر سرے آں کہ فریب　　یاد دارد ز دل فریب بتاں

(طرز تقریر 30)

بلدیوجی کو اور میلے کے سنگترے بھی دیکھ چکے۔ اب نازنینوں کے بزم کے سنگترے سے لطف اٹھاؤ۔

پیشِ نازنینے گلدستہ نہادہ بود۔ گفتم در باغ چین خوبی و دل فریبی کجا۔ گفت آخر مثال ایں گفتم ہمیں کہ یک دوازیں دست نگارین جانب من بغلطانند۔ گفت ناخش بسنگ سترک نہاد۔ گفتم سنگے کہ بر لعل خجلت آرد۔ گفت چساں۔ گفتم بہ لطف دو چنداں۔ گفت آخر سنگ۔ گفتم آرزوے دیوانہ رنگ۔ تبسم نمود ہمچناں کردم

نمودم قد خود چوگاں بہ تسلیم   چناں کز مشق خود ہا گوے بردم

دفتر تقریب ۹۲

لیجیے سیب کھائیے :۔

نزد نازنینے سیبی دیدم رفتم و گفتم سیب خوش رسیدہ است۔ گفت بیار۔ گفتم اگر دستم بہ سیب رسد۔ گفت بے آسیب نخواہد رسید۔ گفتم اگر باغباں نداند۔ گفت پاسبانی زلف اسیر گرداند برائے آں کہ دیدن و چیدن تفاوت دارد گفتم چساں۔ گفت در دیدن سیری در چیدن ابلہی۔ آوردم۔ ہنگام تناول پسند ساخت و دہانم را نیز معطر فرمود۔ مسرور شدم گفتم

خوردن سیب از چنیں خوبی   غیر لطف بتاں نہ می باشد

دفتر تقریب ۹۳

جی چاہے تو گنا بھی حاضر ہے۔

اے کرم فرمائے من پیوستہ شیریں کاریت

باد فرحت بخش یاراں چوں شکر گفتاریت

بستہ نیشکر مذہب سرشت نقد حلاوت در گرہ کمر بہ دل کشائے دستہ رسم شکر ریزی نہاد۔ ہزار فرحت و مسرت دست داد۔ لب و دنداں بجولانگردانی استکراز اشتغال ورزید۔ و دہان از عرق دل جوئے آں سبوئے خود پر گردانید۔ زبان کھولِ تمنا عذب البیان۔ و کام بکام خود رطب اللسان۔ و قدرش از قند بایہ پرسید۔ و مقدارش از نبات باید دریافت۔

پارۂ صفا پذیرفتہ سمن کار دوریزہ عرق گرفتہ نسترن زار

بتوصیف ایں تحفہ شکریں   نے کلک من برآرد انگبیں

دقائق

پیوندی بیر ایسے نہ کھاتے ہوں گے۔

؎ کنار دولت عشرت آباد باد دلم خوشش نمودی دلت شاد باد

پیوندی کنار خوش گوار رسید۔ ذائقہ بحلاوت سیب و انار ہمکنار گردانید۔ نزاکت بیر یا در پوست چناں کہ باتصال سبقت دست تصور در ہراس خراشیدن۔ و بسیارے مغز چندان کہ تخم در اندیشہ بشمار زرسیدن بسرخی و زردی نحوے کہ بعناب و امرود رشک فزاید۔ و شیرینی قسمے کہ لب و دنداں تجویز دوری خستہ نماید ؎

بے تکلف خاطرم رازیں کنار خرمی بار و نمود از ہر کنار

(قدر متین ۱۰)

ایک آم یہ بھی قابل ذائقہ ہی ہے :۔

؎ زالطاف انبہ ز اشفاق عام دلم شاد شد خاطرم شاد کام

از رسیدن انبہ طبع نیاز رس مسرور گردید — و رنگینی آن قطعہ چمنے نظیر رسانید۔ دہن غنچہ آئینیش ہنگام کشایش پیشہ پیشینیہ خود بشگفتین آموخت۔ و کام و زبان از شیرینی ہمانش شکر فشانی بمضامین شیر و شکر اندوخت۔ کثرت شیرہ بے ریشہ آں قدر کہ بفشار نرے از سر انگشتاں تا حد آستین دواں۔ و در حین ارتباط لب از گریبان تا کنار داماں رشک کاغذ زر فشاں — مدام شیریں کام باشید۔ (قدر متین 21)

سنگترہ بھی پھر لیجیے ۔

؎ دلم ز سنگترہ باایں دو لطف خرسند ست
کہ از برون و درون ہم گل ست و ہم قند ا ست

تکمہ سرخ آویختہ بازوے شاخ — و بہ مشت لعلگوں بر پنجہ مرجاں گستاخ ۔ بالیدگی کو کہ بفرحت ہم صورتی ۔ و بزرگی نارنگی بہ نسبت خردی — میوۂ ابتہاج در کف مزاج باد — (قدر متین 28)

سبحان اللہ سنگترے کے ساتھ تو نارنگیاں اور کوے بھی لپٹے ہوتے ہیں۔

یہ خربزہ بھی خاصا ہے اور کیوں نہ ہو آگرے کا ہے۔

؎ لطف بہ حلاوت ہوس انگیز خربزہ کاشانہ ام نمود جو فالیز جزیرہ

رنگش بنظر فریبی نیرنگ دارد و بویش از عطر چنبہ فرق فرسنگ ۔ کوزۂ نبات گرد تقلید شکلے تراشید ۔ بایں نرسید ۔ و قند ہوس مناسبت مکرر گردانید — انفعال کشید — قلم اگر دہ زباں

آرد ــــ بتحریر خوبی ہر قاش رقم عجز نگارد۔ سرسبزی عاشق کشت تمنا باد ـــــ (قدر متین 42)

سب کھا چکے ـــ تہا زر ہا جاتا ہے ـــ ایک قاش اس کی بھی سہی۔

مجھ سے کل یار نے منگوایا جو دے کر پیسا
اس کے ٹانکے جو لگاتے تو وہ کچا نکلا
دیکھ تیوری کو چڑھا ہو کے غضب طیش میں آ
کچھ نہ بن آیا تو پھر گھور کے یہ کہنے لگا
کیوں بے لایا ہے اٹھا کر یہ مرا سر تربوز!
جب کہا میں نے میاں یہ تو نہیں ہے کچا
اور کچا ہے تو میں پیٹ میں بیٹھا تو نہ تھا
اس کے سنتے ہی غضب ہو کے وہ لال انگارا
لاٹھی پاٹھی جو نہ پائی تو پھر آخر جھنجلا
کھینچ مارا مرے سینے پہ اٹھا کر تربوز

؎ بخندۂ شکرین تو بود گرم ہوس   دلم ز تربز شیریں بقدر تسکیں یافت

حلاوت تربز زباں را بشکر رنجی شک رسایند ـــ و عذوبت آں ذائقہ را مانند ہر قاش برانگبیں خندایند ـــ درج زمرد پُراز یاقوت رُمانی۔ و آبگینۂ سبزی کبریز شربت سرور رسانی۔ مرغزار شادابی بفسحت طبیعت بساط طراوت گستر۔ و بہار حضرت ماآبی مانند سیر سبزہ و آب مفرّح خاطر مقوی نظر۔ ؎

بوے برف شیریں پیش ایں ہر لحظہ و ہر دم
بآئین دل فرہاد گوید گرد تو گردم

سرسبزی برآمد مشمول مقاصد باد ـــــ (قدر متین 69)

انجیر کو پھر ذائقہ کیجیے۔

؎ ایں عطوفت کہ نمودی برمن   از تو امید چنیں مے دارم

انجیر عذوبت پذیر۔ انشراح متجاوز التحریر رسانید۔ پوست و مغزش بہ نرمی و نزاکت اتحاد دارد ـــ و خوبانی بادام الفتش اگر ہوس اسیری کند عجب نیارد۔ قند مصری انبار حلاوت نہ بملایمت ـــ و انگور بصحبت گردنا زز ہے منادمت ـــ کام ذائقہ چناں ازلب حاصل کہ

منت دنداں نبرد ـــــ وازاں قسم شیرینی کہ مذاق رانجا موشی ملذ ذگرداند۔ (قدر متین 123)

انجیر کے پیٹ میں خوبانی بادام انگور بھی آگئے۔

انار سلطان الثمار بھی ملاحظہ ہو۔

ع از شیوۂ شیر نیست اے مجمع صد خوبی
شاد است دل یاراں چوں حُسن بہ محبوبی

انار چند از لطف آں طرز رعایت پسند بخوبی رسید ـــ خاطر سرور چوں خلاصۂ بعضے ازاں در پیرہن نگنجید۔ بدعوی سرخی گلبرگ خود سند میا نے ـــ دشاہد آں یاقوتِ رمانی ـــ غدوبت بانبساط جابابی دروں میمند د۔ امرود وشفتالو بحلاوتِ خود خیال ے بند و۔ صرف مذاق بسیار شیریں و سخن طبیعت نہایت شکریں۔ شجر مراد مثمر بو آمد باد ـــ (قدر متین 115)

اب گن تو جائیے کتنے پھل ہوتے۔

آم ایک۔ جامن دو۔ لیموں تین۔ چکوترے چار۔ نارنگی پانچ۔ انار چھ۔ سنگترے سات۔ کولے آٹھ۔ خربوزے نو۔ بیر دس۔ بادام گیارہ۔ پستہ بارہ۔ داکھ تیرہ۔ چھوہارے چودہ۔ کھوپرہ پندرہ۔ امرود سولہ۔ انگور سترہ۔ شفتالو اٹھارہ۔ فالسہ انیس۔ بہی بیس۔ شریفہ اکیس۔ سیب بائیس۔ انجیر تئیس۔ آم چوبیس۔ گنا پچیس۔ خوبانی چھبیس۔ تربز ستائیس۔

اللہ غنی ستائیس بہت ہیں۔ اتنے پھل ایک باغ میں بہت غنیمت ہیں۔ کچھ نظر نہیں آتے شاید اُن دنوں اس قدر عام نہ ہوں

نظیر کا مٹھائی کا پُل

گو نظیر برابر مٹھائی کے پل پر نہ رہا مگر جہاں رہا مٹھائی کا پل قائم تھا۔ اگر اس پل کے کچھ طاق دکھاتے جائیں تو غالباً خیال کے تریاک سے لو لگانے والے بے مزہ نہ ہوں گے۔

پہلا طاق ـــ برنی موتی چور کا

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہے نور نور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور

پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور
ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

دوسرا طاق — برفی، گلابی، جلیبی، تل شکری، امرتی اور دندان مصری کا۔

میٹھی ہے جس کو برفی کہیے گلابی کہیے
یا حلقہ دیکھ اس کے تازی جلیبی کہیے
تل شکریوں کی پھانکیں اب یا امرتی کہیے
سچ پوچھیے تو اس کو دندانِ مصری کہیے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور جس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

تیسرا طاق — تل کے لڈو کا۔

عمدوں نے سو طرح کی باقوتیاں بنائیں
لونگیں ہیں دار چینی شکر میں سے ملائیں
سردی میں دولتوں کی سو گرم چیز کھائیں
اوروں نے ڈال مصری گر پینڈیاں بنائیں
ہم نے بھی گڑ منگا کر بندھواتے تل کے لڈو

چوتھا طاق — پیڑا جلیبی لڈو کا۔

کہتا ہے کوئی پیاری جو کچھ کہو سو لا دیں
زر دوزی ٹاٹ بافی جوتا کہو پنھا دیں
پیڑا جلیبی لڈو جو کھاؤ سو منگا دیں
چیرا دوپٹہ جامہ جیسا کہو رنگا دیں ،
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

پانچواں طاق — مختلف مٹھائیوں کا

ابنار لگاتے پیڑوں کے اور ڈھیر گلابی اور برفی
پھر لڈو بھی تیار کیے دے قند بہت بادام گری

براق مکدا اور خرمی بھی خوشس رنگ امرتی پر ملی[1]
وہ خوب جلیبی اور کھیلے وہ گھیور بالو ساہی بھی

کچھ طاق ٹوٹے ہوتے جی ہیں جن میں گڑ ہے، قند ہے، اولے ہیں، گڑ کی بھیلیاں[2] ہیں، گٹے ہیں، پیڑے ہیں، لڈو ہیں، جلیبیاں ہیں —

یوں خلق دوڑی مکھیاں جوں گڑ پہ دوڑیاں
خالق نے کیا ہی چیز بنائی ہیں کوڑیاں
جو کوئی چیز دیوے نت ہاتھ اوٹھتے ہیں
گڑ بیر مولی گاجر لے منہ میں گھوٹتے ہیں

سر سے تا پا سڑے کچیلے ہیں
آدمی کیا کہ گڑ کے بھیلے ہیں
لدگئی تار تار سب رگ و پے
اس قدر دھوم مکھیوں کی ہے

دال روٹی پہ قہر آتا ہے
اور جو میٹھی چیز کھاتا ہے
اس نے اللہ جانے کھائیں کیا
اس قدر دھوم مکھیوں کی ہے

اُن کی بلا سے گھر میں ہو قند یا شکرنا
جس بات پہ یہ چلے پھر وہی کر گزرنا
ہیں ہزاروں ہی جنس کے ہتّے موتی مونگا و آرسی بنتے
پیڑے لڈو جلیبی اور گٹے
لڈو میں نہ پیڑوں میں نہ اولوں میں مزا ہے — الخ
کوئی اولا کوئی مصری کوئی شکر تربوز

---

[1] خوشبو — (ش)
[2] بھیلی گڑ کی ڈلی جو عموماً پانچ سیر ہوتی ہے — (مؤلف)

نظیر کی عورتیں

نظیر کے کلام میں عورتوں سے کافی طور پر بحث کی گئی ہے اور اس پر اجمالی نظر ڈالنے سے ایک خاص مفہوم عورتوں کا جو نظیر کے ذہن میں تھا حاصل ہوتا ہے۔

(1) سب سے پہلے نظیر کی معشوقیں ہیں۔ اُن کو اس نے مختلف عنوان سے پیش کیا ہے۔ کہیں تو اس نے سر سے پا تک زیورات سے جڑ دیا ہے۔ کہیں زیور کے علاوہ ناز و انداز و نزاکت اور تناسب اعضا اور رفتار و گفتار کا عالم بھی دکھایا ہے۔ حُسن سے قطع نظر اس کے معشوق میں ہمیشہ ایک اعلا درجے کی ذہانت پائی جاتی ہے اور بلا کی بے چلبلی۔ اُس کا معشوق برق کی طرح ابھی یہاں ہے ابھی وہاں، ابھی غائب۔ کسی قدر معشوق ایک خاص قسم کے ظالمانہ تیور بھی رکھتا ہے اور معشوق اس کا غالباً پردہ نشیں عورت نہیں معلوم ہوتی ہے بلکہ امیروں اور بڑوں لوگوں کے پہلو میں بیٹھنے والی طوائف۔ بول چال میں ان کی ایک مردانہ لہجہ رکھتا ہے۔

کہا جو ایک لے بوسہ میں دو لگا لینے
تو ہنس کے کہنے لگے چل بے اب نہ ایک نہ دو

معشوق اس کا زیادہ تر سفاک وضع ہے، فوجی لوگوں کے مذاق کے لائق۔ اسی سے نظیر ہمیشہ ڈر کے پہلو کو چمکاتا ہے۔

نظیر یار سے کیوں دردِ دل نہیں کہتا
سُنا نہیں ہے وہ تو نے کہ سانچ کو کیا آنچ

یہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے جو نام لیجیے کبھی وفا کا

(2) معشوقوں کے بعد ان عورتوں کا درجہ ہے جو گھر گرست کہلاتی ہیں، اور حُسن خانہ داری سے علاوہ بیویاں اور مائیں ہیں اسی قسم کی عورتوں میں مجنوں کی ماں ہے جو اپنے بچے کی پرورش میں پوری طرح شفقتِ مادری صرف کرتی ہے۔ اسی قسم کی عورتوں میں پاربتی کی ماں بھی ہے جو اپنی لڑکی کے لیے ایک عمدہ بر چاہتی ہے۔ مہادیو کے خاص اطوار سے بھیانک ہوتی ہے۔

(3) تیسری وہ عورتیں ہیں جو جنگلوں میں رہتی ہیں۔ اُن کے مدارج ہیں۔ بعض جوانیں ہیں، بعض بوڑھیاں ہیں۔ بوڑھیوں کے ساتھ اس کو جوانوں سے زیادہ ہمدردی ہے۔

(4) چوتھی وہ عورتیں ہیں جو افلاس کے عالم میں باوجود شوق کے اپنا ارمان نہیں نکال سکتیں۔ اور نہایت بے رونقی سے ان کے گھر میں تقریبات ہوتی ہیں۔

(5) ہندوستان کی شریف عورتوں کو نظیر بہت کم پردے سے باہر نکالتا ہے۔

(6) ہندوستان کی شریف عورتیں بھی ہولی کی تقریب سے آتی ہیں مگر زیادہ تر کنجنیاں ہیں۔ ہندوؤں کی شریف عورتیں نظیر کے کلام میں اسی قدر زیادہ ہیں جس قدر کہ باعتبار حالتِ سوسائٹی اور قلت پردہ مسلمان عورتوں سے زیادہ باہر نکلتی ہیں۔

نظیر کی کتاب الامثال

مثل تین حرفوں سے زیادہ نہیں۔ مگر اسی میں دنیا بھر کا فلسفہ بند ہے۔ لوگوں نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں مگر میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی تعریف نہیں۔

فصاحت کا وہ خوش نما شرارہ جو مختلف تجربوں کی رگڑ سے پیدا ہو اور جس سے مختلف واقعاتِ دنیا پر روشنی پڑے۔

مثل حقیقت میں تجربوں کی نوٹ بک ہے۔ عقل نے فصاحت کی شرکت سے ایک خاص شارٹ ہینڈ ایجاد کیا ہے جس کے ذریعے سے ایک شخص کی عمر بھر کے تجربے چند لفظوں میں بند ہو جاتے ہیں۔ اس شارٹ ہینڈ میں نظیر کو بھی ید طولیٰ تھا۔ اور کیوں نہ ہو کہ تجربے ہر وقت ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے تھے اور اس فن کے دونوں موجد اس کے دن رات کے مصاحب و جلیس تھے۔ ہزاروں مثلیں اس کو یاد تھیں۔ اور دن میں سینکڑوں بار اس کو اکثر موقع پر یاد آتی تھیں، اور کبھی کبھی بے ساختہ اس کی زبان سے نکل بھی جاتی تھیں۔ مثلیں یاد تھیں تو نظیر جیسے آدمی کا دماغ انہی پر قانع تو رہ سکتا نہ تھا۔ اُن کی خصوصیات پر غور کی۔ ان کی گہرائی کو ناپا۔ ان کی فصاحت کے معیار قائم کیے۔ ان کے بننے بنانے کے اصول ٹھہرائے۔ پھر اخیر میں اپنی قوتِ اختراع سے اپنے خاص نقش و نگار کے ساتھ چند سانچے طیار کیے جن میں تجربے آسانی سے کھٹا کھٹ ڈھل سکیں۔ حافظے سے کلیات میں کتنی مثلیں آئی ہیں۔ پہلے ہم ان کو گنوائیں گے پھر اس کے خاص کارخانے کی بنی ہوئی مثلوں کی بانگی دکھائیں گے۔

قدیم مثلوں کے نمونے

(1) نیکی اور پوچھ پوچھ

کہا جب نظیر ہم نے یہی دل میں ہم تو رکھتے
تو کہا جو نیکی ہووے تو پھر اس کا پوچھنا کیا

(2) بھنگیاں درباغ بیر گٹھلی سب روا۔

اور نشے کی جھانجھ میں جو ہاتھ لگ جاوے سو کھا
بھنگیاں درباغ رفتہ بیر گٹھلی سب روا

(3) چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ

اب تو مُنہ گل ہے پیارے پھر دھتورا آکھ ہے
آج یہ گلشن کھلا ہے کل کو سوکھا ساکھ ہے
جو اٹھا شعلہ بھبھو کا آخر شش کو راکھ ہے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیرا پاکھ ہے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حُسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

(4) بھوکے بھجن نہ ہو۔

بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو

(5) حلوائی کی دکان دادا کی فاتحہ۔

اور مفلسوں کی ہے یہ تمنا کی فاتحہ
دریا پہ جا کے دیتے ہیں بابا کی فاتحہ
بھٹیاری کے تنور پہ نانا کی فاتحہ
حلوائی کی دکان پہ دادا کی فاتحہ

یاں تک تو آن پہ لاتی ہے ناچاری شب برات

(6) اجگر کے داتا رام

آگے تو گھر بگھر تھے اکثر تمام داتا
سیمرغ پالتے تھے کرنے کو نام داتا

اپنے تو کوئی ہرگز آیا نہ کام داتا
سچ ہے نظیر آخر اجگر کے رام داتا
سب بیچتے ہیں یارو چیتے کھرے کا بچا
ہم بیچتے ہیں یارو لواڑد ہے کا بچا

(۷)

مکھی آن مدھ گری پنکھ رہے لپٹا ئے
ہاتھ ملے اور سر دھنے کہ لالچ بری بلا ئے
یہ شہد برا ہے لالچ کا اس میٹھے کو مت کھا پیارے
یہ شہد نہیں ہے زہر نرا اس زہر آپر مت جا پیارے
جو مکھی اس میں آن پھنسی پھر پنکھ رہے لپٹا پیارے
سر دھنکے روتے ہاتھ ملے ہے لالچ بری بلا پیارے
جب اُمانتا دور ہوئی اور آئی گت سنتو کھ بھری
سب چین ہوتے آنند ہوتے ہم شکر بولو ہری ہری

(۸) اے میری الفتی کے سننے والے مانگا نیچے دیا اوپر۔

رکھ بوجھ سر پہ نکلا اشتر ملا تو ایسا
گھیرا خرابیوں نے لشکر ملا تو ایسا
بڑھ گئے جو بال سر کے افسر ملا تو ایسا
مفلس کا زرد چہرا جو زر ملا تو ایسا
آنسو جو غم سے ٹپکا گوہر ملا تو ایسا

(۹) مفلس کی جورو سب کی بھابھی

چولھا توا نہ پانی کے مٹکے میں آبی ہے
پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نے رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے
مفلس کی جورو سچ ہے کہ ہاں سب کی بھابی ہے
عزت سب کے اس کے دل کی گنواتی ہے مفلسی

(10) آدھے اساڑھ دشمن کے گھر برسے

ورشید گرم ہو کر نکلا ہے اپنے گھر سے
لیتا ہے مول بادل کو کر تلاش زر سے
آئی ہوا بھی لے کر بادل کو ہر نگر سے
آدھے اساڑھ تو اب دشمن کے گھر بھی برسے
آیار چلکے دیکھیں برسات کا تماشا

(11) موتوا قبل ان تموتوا

مرنے سے پہلے مر گئے جو عاشقانِ زار
وہ زندۂ ابد ہوئے تا حشر برقرار
کیا کاتبانِ اہل قلم خوش نویس کار
جتنی کتابیں دیکھتے ہو لاکھ یا ہزار
کوئی لکھ کے مرگیا کوئی لکھوا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مرگیا

(12) چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

کوئی کھوئی چابتا ہے کوئی موٹھ اور مٹر
جسم دم فضا نے ہاتھ میں لی تیغ اور سپر
کام آئی کچھ فقیری نہ کچھ تخت اور چھتر
یہ خاک پر مُوا وہ مُوا تخت کے اُوپر
تھی جس کی جیسی قدر وہ بتلا کے مرگیا
جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مرگیا

(13)

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا
ستارِ عیوب وقاضی الحاجاتی
کتنے تو زر کو نفس طلسمات کہتے ہیں
اور کتنے زر کو کشف کرامات کہتے ہیں

کتنے خدا کی عین عنایات کہتے ہیں
کتنے اسی کو قاضی الحاجات کہتے ہیں

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

(14) زر بر سر فولاد نہی نرم شود

زر کے دیے سے پیر اور اُستاد نرم ہو
زر کے سبب سے دشمن ناشاد نرم ہو
جو شوخ سنگ دل ہے پری زاد نرم ہو
زر وہ ہے جس کو دیکھ کے فولاد نرم ہو

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

(15) اللہ غنی وانتم الفقرا

عمدہ ہیں جتنے ہیں کیا شاہ کیا وزیر
اللہ ہی بس غنی ہے میاں اور ہیں سب فقیر
کیا گنج و ملک و مال مکاں تاج کیا سریر
جو مانگنا ہے اُس سے ہی مانگو میاں نظیر

غیر از خدا کے کس میں ہے قدرت جو ہاتھ اٹھائے
مقدور کیا کسی کا وہی دے وہی دلائے

(16) جس کے ہاتھ ڈوئی اس کا سب کوئی

دنیا میں اب بدی نہ کہیں اور نہ کوئی ہے
نا دشمنی و دوستی نا تند خوئی ہے
کوئی کسی کا اور کسی کا نہ کوئی ہے
سب کوئی ہے اُسی کا کہ جس ہاتھ ڈوئی ہے

نوکر نفر غلام بناتی ہیں روٹیاں

(17) جیسی کرنی ویسی بھرنی

جو پار اتارے اوروں کو اُس کو بھی پار اترنی ہے
جو غرق کرے پھر اس کو بھی یاں ڈبکوں ڈبکوں کرنی ہے
شمشیر تیر بندوق سناں اور نشتر تیر نہرنی ہے
یاں جیسی جیسی کرنی ہے ویسی ویسی بھرنی ہے

(18) پانڈے جی پچھتائیں گے وہی چنے کی کھائیں گے۔

دل غریبوں کے جو پیارے تجھ سے اب دکھ پائیں گے
ایک ایک دن تجھ کو بھی خوباں یوں ہی کلپائیں گے
بات کو ہنسنے کو دے دے جھڑکیاں ترسائیں گے
پانڈے جی پچھتائیں گے وہی چنے کی کھائیں گے

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

(19) رہے نام اللہ کا

اب نظیر آگے ترے رہتا ہے حاضر صبح و شام
پیار سے ہنس بول پیارے پی مے الفت کا جام
پھر کہاں یہ دلبری یہ عیش کی باتیں مدام
کچھ نہ رہوے گا رہیگا آخرش اللہ کا نام

مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے
حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے

(20) خدا کی باتیں خدا ہی جانیں

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

(21) سنی کی ناؤ پہاڑ چڑھے

دانا شکل کوئی اٹکی نہیں رہتی
چڑھتی ہے پہاڑوں کے اُپر ناؤ سنی کی

(22) سانچ کو آنچ نہیں

نظیر یار سے کیوں درد دل نہیں کہتا
سُنا نہیں ہے وہ تو نے کہ سانچ کو کیا آنچ

(23) دل کو دل سے راہ ہے

باتیں ہمارے دل کی کہدیں نظیر اُس نے
ہے سچ تو یوں کہ دل کو ہوتی ہے راہ دل سے

(24) باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیرانداز

آدم اک دمڑی کی ٹھقیا کو رہے عاجز سدا
ہم کو کیا کیا تیکواں اور گُڑ گڑی پر ناز ہے
غور سے دیکھا تو اب یہ وہ مثل ہے اے نظیر
باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیرانداز ہے

(25) جوئیدہ یابندہ

مُربّا ابنہ مسرور دوا استلذاذ گردانید و کثرتِ رائحہ لطف سرچنداں بخشید حلاوت و حموضیت جویاے قریں بود بمعنے جوئیدہ یابندہ لذّت دیگر فراہم نمود۔

(26) خانہ احساں آباد

نظیر اکنوں نہ دارد غیر ازیں یاد
کہ باشد خانۂ الطاف آباد

(27) وقت خزاں چو گل بنود خس غنیمت است

قائم ہے جسم گو کہ نہیں کس غنیمت است
جیتے تو ہیں اگر چہ نہیں بس غنیمت است
سو عیش ہم کو گر نہ ملے دس غنیمت است
وقتِ خزاں چو گل بنود خس غنیمت است

پیرے کہ دم زعشق زند بس غنیمت است
وز شاخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

(28) بیٹھے سے بیگار بھلی۔

آؤ پڑوسن .... کھیلیں بیٹھے سے بیگار بھلی

(29) گندم از گندم بروید جوز جو
از مکافات عمل غافل مشو

جو اور کو پھل دیوے گا وہ بھی سدا پھل پاوے گا
گیہوں سے گیہوں جو سے جو چانول سے چانول پاوے گا

(30) ڈھاک کے تین پات

گر بیر بخیلی زہر ہوے یا بخشش میں تریاک ہوتے
یا نخل ہوے پُر میووں کے خالی پاتوں ڈھاک ہوتے۔ الخ

(31) پانی پیجیے چھان کر گرو کیجیے جان کر۔

کھانا جو کھا تو دیکھ کر پانی پیے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر

اب یہاں سے خاص نظیر کی مثلیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ بات تو بطور کلیے کے سمجھ لینی چاہیے کہ اس کی ہر مقبول ناصحانہ نظم کی ٹیپ یقینی ضرب المثل ہے۔

1.

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

2

کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

3

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہاتے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلاتے بڑھاپا

4

پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

5

کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

6

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اِس ہاتھ کرو اُس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

7

اپنا نہ مول کا نہ اجارے کا جھونپڑا
بابا یہ تن ہے دم کے گزارے کا جھونپڑا

8

عاشق ہے تو دل بر کو ہر اک رنگ میں پہچان

9

ٹک دیکھ لیا دل شاد کیا خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

10

کام آتی ہے عاشق کے بہت رات اندھیری

11

اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے

12

اک دم کو آ گئے ہیں مُنہ مت چھپائے ہم سے
ٹک ہنس کے اوپری رُو آنکھیں لڑائے ہم سے

13

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

14

تندرستی کو پلٹ فضل الٰہی بوجھیے
آبرو سے جگ میں رہنا بادشاہی بوجھیے

15

ہیں راگ اُنھی کے رنگ بھرے اور بھاؤ اُنھی کے سانچے ہیں
جو بے گت بے سُر تال ہوتے بن تال پکھاوج ناچے ہیں

16

کونڈی سو نیٹے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

17

پی عاشقوں میں آکر دو بھنگ کے پیالے
جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے چھپر ہالے

18

آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

19

عاشق کو دکھاتی ہے عجب ڈھنگ جوانی

20

گاہک ہی کچھ نہ لیوے تو دلاّل کیا کرے

21

جھمکا نظر آتا ہے ہر اک عیش کی شے کا
دنیا میں عجب روپ جھلکتا ہے روپے کا

22

سب چھوڑ و بات طوطی و پدڑی ولال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

23

نقش یاں جس کے میاں ہاتھ لگا پیسے کا
اس نے تیار ہر اک ٹھاٹ کیا پیسے کا

24

دیکھ لے دنیا کو غافل یہ تماشے پھر کہاں

25

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

26

دنیا کے امیروں میں یاں کس کا رہا ڈنکا

27

پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

28

راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تری رضا ہے
یاں یوں بھی واہ وا ہے اور ووں بھی واہ وا ہے

29

جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

30

جب آتے اس گڑھے میں نکیر اور ہزار من
اوپر سے آکے خاک پڑی تب خبر ہوئی

31

لے آئینے کو ہاتھ میں اور بار بار دیکھ
صورت میں اپنی قدرت پروردگار دیکھ

32

گر ہے فقیر تو تو نہ رکھ یاں کسی سے میل
یاں تو نری نہ بیل پڑا اپنے سر سے .. کھیل

33

خدا کسی کو نہ دکھلاتے غم جُدائی کا

34

چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں

35

دل کی خوشی کی خاطر چکھ ڈال مال دھن کو
گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

36

کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

37

جدھر کو دیکھو اُدھر اک نیا تماشہ ہے
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

38

حسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے بول لے
مان لے کہنا مرا اے جان ہنس لے بول لے

39

نہ یہ چہلیں نہ یہ دھومیں نہ یہ چرچے بہم ہوں گے
میاں اک دن وہ آوے گا نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

40

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

41

جب آئی اجل پھر کوئی ڈھونڈھا بھی نہ پایا
قصوں میں رہے حرف و حکایات تو پھر کیا

42

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی

43

جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

44

ایسے لڑے کہ خوب لڑے خوب ہی لڑے

45

رگ رگ میں جس سے چھٹ گئی عشرت کی پھلجھڑی

46

غیر از خدا کے کس میں ہے قدرت جو ہاتھ اٹھائے
مقدور کیا کسی کا، وہی دے وہی دلائے

47

ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا
یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

48

اس کی بغل میں گپتی تیغ اس کے ہات میں ہے
وہ اس کی فکر میں ہے یہ اس کی گھات میں ہے

49

غل شور بگولا آگ ہوا اور کیچڑ پانی مٹی ہے
ہم دیکھ چلے اس دنیا کو یہ دھوکے کی سی ٹٹی ہے

50

جو خوشامد کرے خلق اس سے سدا راضی ہے
حق تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

51

جب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت نے آکر کام پڑا سب قصے قضیے پاک ہوئے

52

دنیا کے بیچ یارو سب زیست کا مزا ہے

53

ڈرتی ہے روح یارو اور جی بھی کانپتا ہے
مرنے کا نام مت لو مرنا بری بلا ہے

54

سب خوبیاں بنی ہیں یہ آدم کے واسطے
اور دم بنا ہے آہ فقط غم کے واسطے

55

دنیا میں کون ہے جو نہیں مبتلائے زر

56

جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے دن رات ہائے زر

57

اب آ کے بڑھاپے نے کیے ایسے ادھورے
پر جھڑ گئے دُم اڑ گئی، پھرتے ہیں لنڈورے

58

یہ رنڈی پرانی ہے مزا اس کے تو چھل میں
آج اس کے بغل میں ہے تو کل اس کے بغل میں

59

کیا رتبے ہیں فلاح علیہ اسلام کے

نظیر کی نسبت لوگوں کی رائے

نظیرؔ کی نسبت علی العموم لوگوں کی رائے خراب ہے۔ یہاں تک کہ جس کسی سے میں نے ذکر کیا کہ میں نظیرؔ کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں اُنس نے تبسم زیر لبی ضرور کیا۔ لیکن اس

عام مخالفت رائے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ واقع میں نظیر اور اس کا کلام اسی کا مستحق بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض زمانے میں کسی خاص طرز کو خاص مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے — کبھی یہ مقبولیت معقول اسباب پر مبنی ہوتی ہے، اور کبھی فقط ملک اور قوم کا ایک خاص خیال اس مقبولیت کا باعث ہوتا ہے جس کی کوئی بنیاد معقول نہیں ہوتی۔ ہرچند اس قسم کی بے بنیاد مقبولیت چندے جدت کی وجہ سے لوگوں کو فریفتہ رکھتی ہے لیکن بہت ہی جلد اُس کا رنگ دلوں سے محو ہونے لگتا ہے اور آخر مٹ مٹا کر فقط اللہ کا نام رہ جاتا ہے۔ نظیر کے دور اخیر میں بدقسمتی سے ملک کے مذاق نے ناسخ کی غیر طبیعی اور پُر تصنّع طرز شاعری کو پسند کرنا شروع کیا تھا — پبلک اُن دنوں کوئی چیز نہ تھی، جو کچھ تھے اُمرا تھے، انہی کے ہاتھ میں مذاق کی باگ ہوتی تھی — وہ جس طرح چاہتے تھے اُس کا رُخ پھیر دیتے تھے۔ لکھنؤ میں شاعری کی بنیاد گویا سوداؔ سے پڑی۔ وہ کوئی خود مختار شاعر نہ تھا کہ بالکل تقاضائے فطرت پر نظر کرتا۔ تعلق دربار سے اُس کو امرا اور دولت مندوں کی مدحت کرنی پڑی تھی۔ پھر اُمرا اور دولت مند کون؟ جن کا نام یوں معمولی طور پر بھی بے دس گز کے القاب کے لیا نہیں جاتا تھا۔ ایسی حالت میں سوا اس کے کیا چارہ تھا کہ بے انتہا لفاظی سے کام لیا جاتا — سوداؔ کے قصائد قصائد نہیں ہوتے بلکہ عمدہ لفظی رجمنٹیں ہیں جن میں چھنے اور چھنٹے ہوتے سڈول گراں ڈیل جوان شوکت اور دبدبے کی وردیاں پہنے ہوتے موزونی کی پریڈ میں قواعد کر رہے ہیں، آگے تشبیب کا انگریزی باجا ہے اور پیچھے دعا کا نیشنل اینتھم۔ ناسخ سوداؔ کے بعد آیا — ہرچند اُس نے قصیدہ تو نہیں کہا مگر قصیدے کی لفاظی رائج ہو چکی تھی۔ اب وہ عاشقانہ ڈھنگ کے سیدھے سادے پھیکے پھیکے اشعار دلوں کو کب مزہ دے سکتے تھے۔ ناچار اس کو غزل میں بھی قصیدے ہی کی طرز اختیار کرنی پڑی۔ وہ بزم جس میں سچے عاشق دلی سوز و گداز کے ساتھ اصلی معشوقوں سے مصروف حرف و حکایت تھے، وہاں رجمنٹ کے سپاہی گھس آئے۔ رنگ محل بارک ہو گیا — تھوڑے ہی دنوں میں ناسخ کی طرز نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ شرق سے غرب تک اُس کا رواج ہو گیا۔ ہرچند دہلی کے شعرا زیادہ تر میرؔ کی طرز کے پسند کرنے والے تھے، مگر رفتہ رفتہ اُن کے مذاق میں بھی انقلاب آیا۔ شاہ نصیر کے لفاظی کا وہاں بھی رواج ہوا۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ نے ناسخ کی طرز پر بیسیوں غزلیں لکھی ہیں۔ اگر ایک خاص وجہ سے دہلی والوں کو اہل لکھنؤ سے قطعی نفرت نہ ہوتی تو میں جانتا ہوں لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں کوئی تفرقہ باقی نہ رہتا۔ ذوقؔ نے ابتدا میں گو ناسخ کا تتبع کیا مگر آخر اُس کے مذاق سلیم نے دکھایا کہ فقط

لفاظیوں سے کام نہیں چل سکتا — اصلی دلی خیالات کسی قدر تصنع سے دور ہونے چاہیئیں اور ان الفاظ اور ترکیبوں میں ظاہر ہونے چاہئیں جو بے تکلف ہوں — مرزا غالب اور مومن خاں نے گو اپنے مذاق پر ناسخ کا خط نسخ تو پھر نے دیا مگر پھر بھی ان دونوں حضرات پر متاخرین شعرائے فارسی کا مذاق اِس قدر غالب تھا کہ ان کو ہم بمشکل اُردو کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ ایک کے اگر فقط خیالات فارسی ہیں تو دوسرے کے الفاظ اور خیالات دونوں۔

موجودہ مذاق کسی نہ کسی نہج سے انہی شعرا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جنھوں نے باضابطہ قدیم روش پر تعلیم شاعری پائی ہے وہ ضروران ہی ائمۂ فن میں سے کسی نہ کسی کے پیرو ہوں گے۔ ان کا دماغ اس تعلیم کی وجہ سے کسی طرح بے لاگ قائم نہیں کرسکتا۔ ایسی صورت میں نظیر کے اس گروہ میں مقبول ہونے کی کیا شکل — ایک صورت اس کی مقبولیت کی تھی مگر اس میں ایک خاص آفت پیش آگئی — یہ تو سب کو معلوم ہے کہ انقلاب سلطنت سے ہر قسم کے مذاق میں بھی بہت بڑا انقلاب آیا ہے۔ غدر سے اس انقلاب کی ابتدا ہے اور اب شاید انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ مدرسے قدیم معلموں سے خالی ہو گئے۔ کالجوں میں پروفیسر آباد ہیں — مشاعروں کی شمع گل ہے۔ گل دستے مرجھا مرجھا کر رہ گئے دیوان اولاً چھپتے نہیں اور جو چھپتے ہیں، داخلِ دفتر۔ قلم رو نظم نثر کے قبضے میں ہے۔ قافیوں کا قافیہ تنگ ہے۔ فوجِ ردیف بھاگی جاتی ہے۔ ناولوں کا دھاوا ہے۔ افسانے کتب خانوں میں چھپتے پھرتے ہیں۔ شاعری اپنی حفاظت کے لیے فطری مورچے قائم کر رہی ہے۔ معانی کے رسالے الفاظ کے پیادوں کو کھندل رہے ہیں۔ انقلاب کا خاصہ ہے کہ عزیزوں کو قعر مذلت میں گرا دیتا ہے اور ذلیلوں کو بام عزت پر چڑھا لیتا ہے۔ اس قاعدے کے مطابق یہاں بھی بیسیوں عزیز ذلیل اور بیسیوں ذلیل عزیز ہوئے۔ ہمیں امید تھی کہ جہاں اور ذلیل ہوتے ہیں وہاں ہمارا نظیر بھی ہوگا۔ حق یہ ہے کہ موجودہ مذاق کے مطابق اس سے بڑھ کر کسی شاعر کو مقبول عام ہونے کا استحقاق نہ تھا۔ مگر بل یہ آن کر پڑا کہ جن ناقدین کے ذریعے سے اس کے اصلی جوہر روشن ہو سکتے تھے ان کی آنکھوں پر اعراض ذاتی نے بلا کے پردے ڈال دیے۔ ہر چند پوری پوری کتابیں شاعری پر لکھیں مگر اس پر بھی اس کا کہیں ذکر نہ کیا، اور جو کہا تو سرسری طور پر نہایت بے دلی کے ساتھ۔ اصل میں قدرت کو اس بات کا ہوا کہ اگر میں اس کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھوں گا تو جس مرتبے کا میں مدعی ہوں اس کا وہ مستحق ثابت ہو جائے گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں نیچرل شاعری جس کا اب بہت غل ہے، اصل میں اس کی بنیاد نظیر نے قائم کی ہے۔ باوجودے کہ اب لوگ خیالات فرنگ سے مدد لے کر طبع آزمائی کر رہے ہیں، پھر بھی بعض فطری نظمیں اس کی

ابھی تک لاجواب ہیں اور شاید اس وقت تک لاجواب رہیں کہ کوئی اسی مرتبے کا حقیقی شاعر ملک میں پیدا ہو۔

جس عدم مقبولیت کا میں نے ابھی تک ذکر کیا ہے وہ خاص شعرا اور اہل فن سے متعلق ہے، ورنہ علی العموم بایں ہمہ مخالفت بھی نظیر کی مقبولیت بدرجہ غایت ہے۔ اس کثرت سے شعرائے ہند میں شاید کسی کا کلام نہیں پڑھا جاتا اور اس کثرت سے کسی کا کلام مجالس و محافل میں بطور ضرب المثل مستعمل نہیں۔ یہی مقبولیت تھی جس نے اس کا کلیات چھپوایا اور یہی مقبولیت تھی جس نے اس کو ہاتھوں ہاتھ بکوایا۔۔۔ کلیات کو چھپوانے کو کوئی امیر شاگرد نہیں اٹھا تھا، نہ خاندان کے کسی صاحب نے اس طرف توجہ کی تھی۔ باضابطہ دیوان اس کا ابھی تک خاندان کے بعض تنگ خیال لوگوں کی خلوت خوش خیالی میں بند ہے۔ دیوان جو شاگردوں یا خاندان کے لوگوں کے اہتمام سے چھپتا ہے اس میں دیباچہ ہوتا ہے، قطعات تاریخی ہوتے ہیں، تقریظیں ہوتی ہیں۔ یہاں ان چیزوں کا تو ذکر کیا ترتیب بھی ٹھیک نہیں۔ عام مقبولیت سے عام طلب پیدا ہوئی اور تاجرانہ خیال نے طلب کا اندازہ کر کے جس طرح بنا چھاپ دیا۔۔۔

سلیقہ جمع و تالیف چاہتا ہے کہ اس پر بھی اس کے لیے تقریظوں کا ایک معتدبہ مجموعہ فراہم کیا جائے جس سے ظاہر ہو کہ اصلی کمال اپنا صلہ بے لیے نہیں رہتا۔۔۔ اچھا لیجیے۔۔۔

(۱) محمد وزیر خاں مہتمم مطبع احمدی واقع چار سو دروازہ آگرہ کی رائے:۔

"کتاب لطف مآب پسند ہر صغیر و کبیر کلیات نظیر۔۔۔"

(2) شیخ نورالدین بن جیوا خان مہتمم مطبع صفدری واقع بمبئی کی رائے:۔

"(کتاب کی نسبت) کتاب لاجواب پسند خاطر ہر صغیر و کبیر اعنی منتخب نظیر (مصنف کی نسبت) نتیجہ طبع سر دفتر شعرائے زبان خویش و مقتدائے رہ روان سلوک خیر اندیش جناب شیخ ولی محمد صاحب متخلص بہ نظیر۔۔۔"

(3) سید تصدق حسین مصحح مطبع اودھ اخبار کی رائے:۔

"مصنف باکمال نے ہزاروں طرح کے پند و نصائح کو چٹکلوں اور مثالوں میں نظم فرمایا

ہے۔خوابِ غفلت سے دنیا کی میٹھی نیند سونے والوں کو کس کس حسنِ ادب سے جگایا ہے۔حق تو یہ کہ اگلے لوگوں کا کلام بھی عجب پُر تاثیر ہے کہ ہر زمانے اور ہر وقت میں اس کا مداح ہر صغیر و کبیر ہے یہی کلیات ہے کہ اگر چشم ظاہر سے اسے دیکھو تو طرح طرح کی دل لگی کی باتوں اور مذاق کی حکایتوں سے مملو ہے اور اگر دیدۂ حق بیں سے بغور و تامل ملاحظہ ہو تو سراسر دنیائے ناپائدار کی مذمتوں اور چرخ کج رفتار کی شکایتوں کا دریا گویا بہ سبو ہے۔"

(4) کتاب کی نسبت

(حکمت یار خاں ابن حافظ احمد خاں شاگرد جناب منشی نثار احمد بریلوی کی رائے)

"کتاب لاجواب سر دفتر شعرائے زماں سر مشق قلوب عاشقاں۔(مصنف کی نسبت) کہ جس کو سیاح دریائے فصاحت بیانی و غواص بحر فہم و معانی جناب شیخ ولی محمد اکبر آبادی متخلص بہ نظیر نے اپنی صاف طبع سے نکال کر رشتہ تحریر رنگارنگ میں منسلک کر کر جوہریان و نقادان بازار معانی کو مستفیض کیا۔"

(5) حکیم میر قطب الدین باطن مؤلف گلستانِ بے خزاں کی رائے:۔

"(مصنف کی نسبت) پیر مغاں میکدۂ سخن۔جرعہ کش راوقِ مضامین نو و کہن جناب سید ولی محمد نظیر دُرّۃ التاج شہنشاہ سخن دانی۔گوہر یکتائے قلزم فیض رسانی۔سریر آرائے اقالیم سخن وری، اورنگ پیرائے محافلِ شاعری۔شمع شبستاں مکرمت، چراغ دودمانِ عزت، گلدستہ گلستانِ عظمت غنچہ بہار ندرت۔لعل معدنِ علم و حیا۔گوہر گنج اتقا۔خورشید آسمانِ وفا۔ماہ چرخِ صفا۔ بادہ نوش میخانہ مضمون یک رنگی۔رحیق پیمائے مصطبۂ معنی دل نشینی۔مخزن جود و احساں۔ معدن الطافِ بے پایاں۔حلیم الطبع۔خلیق الوضع۔مطلع انوار سواد نظم۔مقطع بیاض تجلیاتِ بزم۔ حریف محفل آشنائی۔ظریف انجمن دانائی۔خلاصۂ خاندانِ بسالت۔سلالۂ دودمانِ اصالت۔چرخ ہمت۔زمین حلم۔دور از جہل نزدیک بعلم۔وحید عصر یکتائے زماں۔یکہ تاز عرصۂ مضمون سخن سنجاں۔آشنائے غوامضِ نکتہ چینی۔دانائے دقائق رنگینی۔عالی فکر، بلند ہمت، رفیع مرتبت۔ بزرگ شوکت۔والا فطرت۔اوج فتوت۔ہادی شعر القب۔صاحب قاعدۂ ادب۔

(شاعری کی نسبت) خیاطِ ازل نے قبائے مضامین نادران کی عقل کے جسم پر قطع کی۔ دبیرِ فلک نے بیاض سخن پردازی و مضمون طرازی ان کے نام بخشی ـــ بلاغت میں سلمان[1] ساوجی بسم اللہ خان و بستان۔ فصاحت میں سحبان وائلِ طفل مکتب ایشاں۔ ان کے چمن فکر میں اس طرح کے گلہائے مضامین کھلے ہیں کہ اگر عین خزاں میں بلبل تصویر کو اس باغ میں لے جاتے تو اُن پھولوں کی بو کار نفس عیسوی کرے۔ نغمہ سرائی عندلیب طبع کی اگر طوطی بے جاں سنے تو ہزار جان سے نوا سنج توصیف و مدّاح ہو کر ان کا دم بھرے۔ جس شاخ پر ایک پھول گلستان سخن ان کے سے کھلا دیکھیں سیاّران شائق عنادل وار جاں نثار کریں۔ گلشنِ جنّت ایک برگِ خزاں رسیدۂ چمنستانِ طبع۔ بہار خلد غنچۂ گلبنِ باغ جنانِ طبع۔ شاعر اس کو کہتے ہیں کہ واقف ہو زمانے کے اطوارات نیک و بد سے ہمہ داں شیریں بیاں ہو بڑھ کے حد سے۔ شعر گوئی کے دقائق سے خوب ماہر ہو۔ شاعری کے سب نکتوں کا فائدہ اُسے ظاہر ہو۔ شاعری کے عملوں کا عامل ہو۔ ہر طرز میں مہارت کامل ہو۔ جیسے ہادیِ شعراء۔ شاعر نام دار عالی مقدار جن کے کلمات شائستہ نے گوش فہم عالم کو عقل سماعت بخشی اور شہر شہر دیہ دیہ قصبہ قصبہ ہر کوچہ و برزن میں ہزاروں فرسخ بجز ذکر واوصاف۔ نظم و نثر اُس جنت آرام گاہ کے کچھ بات نہ سنی۔ ساقی خم خانۂ فیضِ طبع نے تشنہ بادۂ شوقِ سخن کا لب تر کیا ـــ پیر مغانِ طبع نے ہر ایک خشک کام گلو تر کردۂ راوقِ تمنائے سخن کا اپنے دور میں لبالب ساغر کیا۔ کلامِ نظیر شعراء عصر کے لیے نظیر ہے۔ تقریر ماحی بے نظیر ہے ـــ،،

(6) ابوالقاسم میر قدرۃ اللہ قادری صاحب تذکرہ کی رائے:۔

(مصنف کی نسبت) شیخ ولی محمد اکبر آبادی شاعرے است دیرینہ مشق کہ بالفعل 1221ھ دراں نواح علم اوستادی مے افرازد۔ ونرد محبت واخلاص باہر کس مے بازد۔ بسیار سلیم الطبع و خوش اختلاط و نہایت نیک طینت و مستحکم ارتباط شنیدہ مے شود بہ معلمی اوقات گزاری مے کند و بہ کشادہ پیشانی ایام زندگی بسر مے برد ـــ،،

(7) نواب مصطفٰے خان شیفتہ صاحب گلشن بے خار کی رائے:۔

(شاعر کی نسبت) "نظیر خانہ در جوار روضۂ تاج گنج کہ بیرونِ شہر مذکور (اکبر آباد) است

---

[1] سلمان ساوجی ۔ فارسی شاعر (م)

دارد۔ گویند کہ نظیر در حلم و خلق و انکسار بے نظیر روزگار است۔ کم مدت[1] است کہ ازیں خاکداں بہ روضۂ رضواں رفت ــــ (شاعری کی نسبت) اشعار بسیار دارد کہ برزبانِ سوقیّیں جاری است۔ و نظیر برآں ابیات درا عداد شعرانہ شاید ش شمرد۔ اما بہ رعایتِ ابیات منتخب قطع نظر کردہ شد ــــ"

(8) سعادت خاں ناصر صاحب تذکرۂ خوشِ معرکہ کی رائے:۔

"(مصنف کی نسبت) نظیر۔ وضع قلندرانہ۔ مرد آزاد۔ معاش اس کی تعلیم صبیان اور اجرتِ صدا تے فقیراں ــــ"

(9) مولوی محمد حسین آزاد صاحب تذکرۂ آبِ حیات کی رائے:۔

"(اشعار کی نسبت) ہمارے تذکرہ نویسوں کا دستور ہے کہ جب شاعر کا حال لکھتے ہیں تو اُس کے اشعار انتخاب کرکے لکھتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ فیضان سخن رائیگاں نہیں جاتا۔ نظیر کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ میرؔ سے پہلو مارتے ہیں۔ پس اگر نظیر کا ذکر لکھ کر اس کے چند شعر منتخب لکھ دے تو ناواقف سوا اس کے کہ نظیر کو میرؔ کا ہم پلّہ شاعر سمجھے اور کیا تصوّر کرسکتا ہے[2]۔"

(10) مولوی خواجہ الطاف حسین حاؔلی کی رائے:۔

آج کل یورپ میں شاعر کے کمال کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ اس نے اور شعرا سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیے ہیں۔ اگر ہم بھی اسی کو معیارِ کمال قرار دیں تو بھی میر انیسؔ کو اردو شعراء میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے شاید میر انیسؔ سے بھی زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں ــــ مگر اس زبان کو اہلِ زبان کم مانتے ہیں۔ بخلاف میر انیسؔ کے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا

---

[1] یہ تحریر 1248ھ اور 1250ھ کے درمیان کی ہے۔ (ش)

[2] آبِ حیات ضمنی حالات ولی صفحہ 95 (ش)

پڑتا ہے[1]۔

(۱۱) حکیم اصغر حسین فرخ آبادی کی رائے:۔

جس زمانے میں وہ (نظیر) فرخ آباد آتے تھے۔ میرے والد سے اُن سے ملاقات ہوتی تھی۔ میں صغیر السن تھا۔ میں ان کی زیارت سے کبھی مشرف نہیں ہوا۔ مگر قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت موزوں اور چلبلی رکھتے تھے۔ مضامین اپنی فکر واستعداد کے موافق موزوں کیا کرتے تھے۔ جوانی کی ستائش بڑھاپے کی مذمت خوب لکھی ہے۔ بلی نامہ۔ چوہے نامہ۔ گلہری نامہ۔ کوڑی۔ وغیرہ وغیرہ انھی کے نتائج افکار سے ہے۔ بڑھاپے کی ترجیع بند میں مشہور شعر ہے۔

سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہر چند حضرت سلیمؒ چشتی کے عرس کی تعریف میں ترجیع بند لکھا ہے جس کا بند کا شعر ہے ؎

رشک ہے گلشن بہشتی کا
عرس حضرت سلیم چشتی کا

مگر حضرت عباسؓ کے معجزے اور کربلا کے معجزے ایسے موزوں کیے ہیں جن سے مُستفادہ ہوتا ہے کہ استعداد علمی کامل نہ تھی اور امامیہ طریقہ ہو تو عجب نہیں۔ مگر انہوں نے ایک مسدس طویل جنم میں کنھیا کے لکھا ہے جس کا شعر یہ ہے ؎

یوں نیک چھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر اُن کے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم

ان کی تعریف میں ایک مخمس لکھا ہے ؎

میں کیا کیا وصف کہوں یارو اُس شام برن اوتاری کے
سیکشن کنھیا مرلی دھر من موہن کنج بہاری کے

---

[1] مقدمہ دیوان حالی صفحہ 182 (ش)

اور سیکشن کی تعریف اور درگاجی کے درشن اور مہادیوجی کا بیاہ وغیرہ بہت کچھ نظم کیا ہے جو آزادی قید مذہب کی خبر دیتا ہے[1]۔۔۔"

(12) منشی سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ کی رائے:۔

"بعض دہلی کے تذکرۂ شعراء جمع کرنے والوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ ایک مُلّا مکتبی صحت الفاظ سے معرّا۔ پُرگو، اور عوام النّاس کی بلکہ جہلا کی زبان لکھنے والا تھا۔ لیکن میری رائے میں وہ ہندوستان کا شیکسپیر اور فطری اور قدرتی مضامین کے بیان میں یہ طولیٰ رکھنے والا تھا۔ اُس نے ادنا ادنا اور رکیک رکیک مضمونوں کو اس خوبی سے باندھا اور عمدہ نتیجہ نکالا ہے کہ دوسرا نہیں نکال سکتا۔۔۔"

(13) مولوی نذیر احمد کی رائے:۔

میں نے اپنے دوست مولوی بشیر الدین احمد سے پوچھا کہ آپ کے والد نظیر کے کلام کی نسبت کس قسم کی رائے رکھتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ کبھی ذکر آیا ہے تو والد نے نظیر کی نسبت عمدہ خیالات ظاہر کیے ہیں۔

سب سے پہلی رائے اُن کی توبۃ النصوح میں درج ہے۔ اُس کتاب میں کلیم کے کتب خانے کے ذیل میں انہوں نے نظیر کے کلیات کا ذکر کیا ہے اور مناسب مقام اپنی غرض کے لیے دچھوں کا آچار، کا بڑے موقع سے استعمال فرمایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس بحث میں نظیر کو کوئی عمدہ جگہ نہیں ملی۔ لیکن اس میں کچھ نظیر ہی منفرد نہیں۔ وہاں تو اس سرے سے اُس سرے تک تمام شعرا کا صفایا بول دیا گیا ہے۔ اور تو اور اس قتل عام میں حضرت سعدی تک نہیں بچے۔ حالانکہ انھی سعدی کے باب میں کچھ برسوں بعد حضرت نے اپنی موعظۂ حسنہ میں کس قدر بلند رائے ظاہر کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو رائے توبۃ النصوح میں ظاہر کی گئی ہے وہ ان کی واقعی رائے نہیں ہے بلکہ ایک رائے ہے جو انھوں نے گویا کسی تعلیم کی کتابیں منتخب کرنے والی کمیٹی کی خاطر لکھ دی ہے۔ اصلی رائے اُن کی یہی ہے کہ باعتبار شاعری نظیر کو وہ ایک عمدہ شاعر اور مستند

---

[1] منتخب از مراسلہ مورخہ 19 جولائی 1891ء۔

استاد تسلیم کرتے ہیں کلیم کے کتب خانے کا حال لکھا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے شوق کے پردے میں خود اپنا مذاقِ شاعرانہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کتاب فروش نظیر کا دیوان جس پر ہد ہد کے اشعار بھی چڑھے ہوتے ہیں کلیم کے پاس نہیں لاتا بلکہ لاکر خود مولانا نذیر احمد صاحب کے شوق کی لائبریری میں داخل کرتا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں نظیر کا کلیات ہد ہد کے اشعار کے ساتھ نہیں چھپا۔ دہلی کے مشاعروں کی یادداشت نے ہد ہد کے اشعار یاد دلاتے اور ازبس کے نظیر بھی مذاق خوش طبعانہ و شوخ رکھتا ہے۔ تلاحقِ افکار کے طلسم سے دونوں شاعروں کا کلام ایک مجموعے میں چھپ کر جلوہ گر اور پیشِ نظر ہوا۔ شواہد اس بات کے بکثرت ہیں کہ نظیر کا کلام مدتوں مولانا کے پیش نظر رہا ہے اور بہت دور تک اُس نے پسندیدگی کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ کیوں کہ اکثر اشعار اُس کے ان کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ حال میں جو قران شریف کا جو ترجمہ مولانا نے شائع کیا ہے اُس میں بھی اللہ یستہزی بھم و یمدہم فی طغیانہم کے فائدے کے ضمن میں نظیر کے یہ ضرب المثل اشعار موجود ہیں:۔

نیکی کا بدلہ نیک ہے بد کر بدی کو سات لے
کانٹے لگا کانٹے پھلیں، پھل پات بو پھل پات لے
کل جگ نہیں کر جگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہات لے

اِس سے بڑھ کر ایک شاعر کے لیے اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ اس کا شعر ترجمۂ قران جیسی مقدس چیز میں ایک اہم قاعدہ بلاغت کے اثبات میں نقل ہو[1]۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں جو تقریر مولانا نے کی اُس میں نظیر کے ایک شعر کو نہایت لطف سے پڑھا اور اس کی طرف لوگوں کی توجہ کو کسی قدر غیر معمولی طور پر منعطف کیا۔ جس عبارت میں نظیر کا ذکر کیا ہے یہ ہے:۔

"تمھارے آگرے میں ایک صاحب من وجہ بندے کے ہم نام ہو گزرے ہیں، نظیر اکبر آبادی۔ من وجہ میں نے اس لیے کہا کہ نظیر ان کا تخلص تھا اور میرا نام ہے۔ اُن کا تخلص ظا سے تھا، میرا نام ذ سے ہے۔ ایک صلاح وہ بھی بتا گئے

---

[1] ترجمۂ قران صفحہ 5 - (ش)

ہیں — نہیں معلوم ہنسی ہے یا واقعی — دیکھو شاید وہی مفید ہو۔ اُن کی تو یہ اصلاح ہے ۔

کونڈی ختکے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل"

چونکہ مولنا کا مزاج بالطبع شوخ اور ظریفانہ واقع ہوا ہے یہ امر طبعی ہے کہ اُن کو نظیر کے کلام سے خاص اُلفت اور اس کے اشعار کی طرف خاص رغبت ہو۔ مولنا ناولسٹ ہیں — ناولسٹ ہر شخص کے اندرونی خیالات کا تماشائی اور خصوصیات اخلاق کا نباض ہوتا ہے — نظیر گو ناولسٹ نہیں مگر اس کی زبان اس کی قوت مشاہدہ اور تجربے بہت سے معمولی درجے کے ناولسٹوں کے لیے موجب رشک ہو سکتے ہیں۔ پس اس اعتبار سے بھی مولنا نذیر احمد اور نظیر باہم مشارکت رکھتے ہیں۔ عجب نہیں کہ مشارکتِ اسمی کے بیان کرتے وقت کسی قدر مولنا کا خیال اس مشارکت خیالی کی طرف بھی گیا ہو۔ لیکن کانفرس میں اُس کے اظہار کا کیا موقع تھا۔

میری رائے نظیر کی نسبت یہ ہے کہ اُردو کا سعدی ہے لیکن وہ نظم میں اور مولنا نذیر احمد نثر میں۔ سعدی نظیر نذیر احمد حُسنِ اتفاق یہ تینوں جس طرح نصائح میں مشارک ہیں اُسی طرح ظرافت میں بھی۔ میرے ایک عزیز نے کہا کہ شاید سعدی کا کوئی بنایا ہوا قلم کہیں پڑا تھا وہ مولوی نذیر احمد کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ پہلے نظیر اکبرآبادی کو ملا اور بعد ازاں مولنا کو۔ نظیر نے بوستاں کی خوشبو سے اُردو کے دماغ کو معطر کیا۔ مولنا نے گلستاں کے عمدہ پھولوں کا عطر کھینچ کر ناولوں کے ولایتی شیشوں میں بھرا۔ جب یہاں تک ہم رنگی ہو تو پھر نظیر کی تعریف مولنا کی زبان سے ایک نتیجہ طبعی ہے۔

کوئی صاحب سر ولیم میور بہادر کے زمانے میں اُردو کے شعرا کے کلام سے نصیحت خیز اشعار چھانٹنے لگے۔ سودا، میر، آتش، ناسخ، ظفر، ذوق، درد وغیرہ اساتذہ کے ہاں بھی اُس قسم کے اشعار اُن کو بہت کم ہاتھ آئے۔ اخیر ہار کر نظیر ہی کے ذخیرے پر جھکے — غور کر کے دیکھئے تو وہ انتخاب گویا نصف سے زیادہ کلام نظیر سے عبارت ہے۔ نام اس مجموعے کا اچھا رکھا ہے (بلبلوں کے نغمے)

مولوی علی حیدر نظم فرماتے تھے کہ مولوی سید حسین بلگرامی نے بھی کتاب مختار اشعار میں نظیر کی بہت سی نظمیں درج کی ہیں۔ مختار اشعار پر کیا موقوف ہے کوئی تعلیمی مجموعہ میری نظر

سے ایسا نہ گزرا جس میں نظیر کے اشعار بہ کثرت نہ ہوں۔

مولوی بشیر الدین احمد نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا کہ جتنی کتابیں سر ولیم میور بہادر کے زمانے میں تصنیف ہوئیں کل والد کے ہاں رائے کو آتی تھیں اور ہر ایک کتاب پر والد نے ایک مختصر رائے لیکن برجستہ اور مناسب حال رائے ظاہر کی تھی۔ یقین ہے اُن کتابوں کے جنگل میں یہ دبلبلوں کے نغمے بھی ہوں گے اور ہوں گے تو مولٰنا نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اردو کے نصائح آمیز کلام میں نظیر کے بے نظیر کلام کا کیا پایہ ہے۔

(14) مولوی سید محمود آزاد کی رائے:۔

"ایک بزرگ حکیم بنی بخش میر غلام پیر مرحوم کے ہاں آیا جایا کرتے تھے۔ نظیر کا کلام ان کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ بات بات پر اُس کی تعریف کرتے اور کہتے مجھے تو اس کے سوا کسی کے کلام میں مزہ ہی نہیں آتا۔ میں تو جب دیکھتا ہوں اُسی کا کلام دیکھتا ہوں۔ میں ان کی باتیں سُنتا اور ہنستا کہ مردِ خدا کس قدر بد مذاق ہے۔ اُن دنوں ناسخ کے کلام کا مزہ دل میں سمایا ہوا تھا۔ نظیر نظر میں جچتا ہی نہ تھا۔ دل میں کہتا حکیم صاحب کو چونکہ استعداد نہیں ہے اس لیے ایک بد استعداد شاعر کی اس قدر تعریفیں کرتے ہیں۔ لیکن اب حکیم بنی بخش کی باتیں یاد آتی ہیں۔ واقع میں اُن کی رائے مذاقِ سلیم کا نتیجہ تھی نہ نتیجہ بے استعدادی ــــ اب جو دیکھتا ہوں تو میرے خیال میں نظیر کسی طرح میر وغیرہ اساتذہ قدیم سے کم نہیں کلیات ــــ نظیر میں نے حکیم صاحب ہی کے تقاضوں سے منگوایا تھا ــــ"

(15) مولوی شبلی نعمانی کی رائے:۔

جن دنوں شبلی نعمانی حیدر آباد میں وارد تھے، عزیز مرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ عزیز مرزا ہی کی فرمائش سے میں نے نظیر کی سوانح عمری کے مسودات وطن سے منگواتے تھے اور انہی کے تقاضوں سے در پے تکمیل تھا۔ تازہ مضمون تھا۔ انھوں نے اثنائے گفتگو میں اسی کا ذکر چھیڑا۔ اس طرح کہ ہنس کر اُن سے فرمائش کی کہ مضائقہ نہ ہو تو نظیر کی سوانح عمری بھی لکھیے۔

شاعر تو اچھا تھا۔ شبلی اِس فرمائش سے سخت متحیّر ہوتے اور استعجاب کے ساتھ کہا نظیر کی اور سوانح عمری؟ اس کے بعد جب مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے عزیز مرزا کی فرمائش اور ان کے استعجاب کی طرف ایک خفیف شکایت آمیز اشارہ کیا۔ تو شبلی نعمانی نے کہا نہیں میرا استعجاب اور خیال یہ تھا۔ جب معلوم ہوا کہ آپ اس کے حالات لکھ رہے ہیں سمجھ گیا کہ آپ کی نظر کن باتوں پر ہے۔ پھر کہا کہ سید احمد خاں کے ہم عمروں اور معاصرین میں ڈپٹی تراب علی ایک بزرگ آگرے کے ہیں۔ نظیر کے حالات اُن سے سُنے تو بہت ہیں مگر چونکہ ادھر خیال نہ تھا اس سے تفصیل کے ساتھ یاد نہیں۔۔۔ اگر آپ کچھ سوالات لکھ کر دیں تو ممکن ہے کہ اُن سے پوچھ کر جتنے حالات ان کو معلوم ہیں لکھ بھیجوں۔۔۔ ہر چند شبلی نے خود تو حالات لکھ کر نہیں بھیجے مگر دیوانہ رہا ہوے بس ست۔ میں ڈپٹی تراب علی کے سر ہوگیا۔ اور جس طرح بن پڑا اُن سے حالات منگوا کر رہا۔ اس معاملہ میں میر اکبر حسین سب جج آگرہ مرزا محمد علی بیگ وکیل خاص شکریے کے مستحق ہیں۔

16) شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کی رائے:۔

ان سے سوانح عمری نظیر کا ذکر آیا تو یہ متعجب نہیں ہوے بلکہ بہ کشادہ پیشانی تمام اس کے شاعرانہ کمالات اور خوبی کلام کا اقرار کیا بلکہ اس کو ریلسٹک پوئٹ کا خطاب دیا اور اس امر کے ثبوت میں کہ وہ اُس کے کلام کو کسی زمانہ میں دل سے پسند کرتے تھے فی الوقت نظیر کے یہ اشعار پڑھنے لگے:۔

تنِ مُردہ کو کیا تکلّف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مُزیّن یہ تن تھا
کتی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشیّن بدن تھا مُعَطّر کفن تھا
جو قبر کہن اُن کی اکھڑی تو دیکھا
نہ عضو بدن تھا نہ تارِ کفن تھا
نظیر آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو دیکھا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

پھر بعض فرنچ تصنیفات کا حوالہ دیا اور کہا آپ کے لیے نظیر کے حالات ڈھونڈھ کر اُن میں سے نکالوں گا۔ ڈھونڈا تو انھوں نے ہی، مگر بد قسمتی سے وہ جلدیں کتب خانے سے غائب تھیں جن میں نظیر کے حالات مندرج تھے۔

مولوی سید علی بلگرامی نے نظیر کے حالات سننے کو ایک روز خاص کر مجھ کو بلوایا پھر جو کھانے سے فارغ ہوکر بیٹھے تو آدھی رات تک برابر سنتے ہی رہے۔ اس صحبت میں میرزا حیرت بھی شریک تھے جنھوں نے نظیر کے لیے ایک نیا خطاب مرہٹی گو کا تجویز کیا۔ افسوس اس خطاب پر وجد کرنے والا اُس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا مولوی سید علی نے اس صحبت میں وعدہ فرمایا تھا کہ سوانح عمری کو سلسلہ آصفیہ میں لے لوں گا مگر سلسلہ خدمت کے متزلزل ہو جانے سے چونکہ پوری سلسلہ جنبانی نہ ہوسکی لہٰذا وہ وعدہ وعدہ ہی رہا۔ وفا نہ ہوا۔

(17) ڈاکٹر فیلن کی رائے:۔

"تحریری علم ادب میں سب سے زیادہ نظیر کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے۔ صرف یہی ایک شاعر ہے جس کی شاعری اہل فرنگ کے نصاب کے مطابق سچی شاعری ہے۔ مگر ہندوستان کی لفظ پرستی اس کو سرے سے شاعری ہی تسلیم نہیں کرتی۔ صرف نظیر ہی ایسا شاعر ہے جس کے اشعار نے عام لوگوں کے دلوں میں راہ کی ہے۔ اس کے اشعار ہر سڑک اور گلی میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ خصوصاً اس کے خاص شہر آگرہ میں اور واعظین (یا پادری)، جو کہ اس کی نظموں سے بہت اچھی طرح آشنا ہیں، اُس کے اور کبیر کے اقوال کا شارع عام پر وعظ کہتے وقت نہایت نمایاں تاثیر کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ نظیر میں تمام وہ صفتیں دل اور دماغ کی جمع تھیں جو فطری ذکاوت کو امتیاز بخشتی ہیں۔ اُس کی نظمیں آپ اس کی سوانح عمری ہیں، کیوں کہ قالب نظم میں یہ شخص اپنی تمام ذاتی خصوصیتوں کے ساتھ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ اور سامان نہ سہی، فقط انھی نظموں سے اُس کی تصویر کے بعض خط و خال نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ حقیقت میں آزاد طبیعت تھا اور یہی وہ اپنے تئیں بتاتا بھی تھا۔ وہ اصل میں دنیا سے بے تعلق صوفی تھا جس کا اوروں کو صرف دعوا ہی دعوا ہے۔ وہ تقدیر کی دموافقت کی پروا کرتا تھا نہ مخالفت کی۔ وہ

کچھ چاہتا ہی نہ تھا۔ وہ نہ کسی مرد کی پروا کرتا تھا نہ کسی عورت کی — عورتوں سے اگر مطلب تھا تو صرف اتنا کہ دور سے اُن کے حُسن صورت پر غش ہوئے — نہ اقبال سے وہ پھولتا تھا نہ ادبار سے ملول ہوتا تھا۔ جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے وہ "اپنی کھال میں مست" تھا — اُس نے کبھی اپنی کسی تحریر کے حفاظت سے رکھنے کا خیال نہ کیا۔ اُس کی نسبت لوگ روایت کرتے ہیں کہ اس کا معمول یہ تھا کہ نظم لکھتی اور لکھ کر پھینک دی۔ شاگرد یا دوست جن کے لیے وہ نظم لکھی اٹھا کر لے گئے۔ نہایت وسیع معنوں میں وہ اعلا درجے کا آزاد، اعلا درجے کا موحد، اعلا درجے کا حکیم اور اعلا درجے کا جگت دوست تھا۔ اس کی ذکاوت کی رنگا رنگی اُن مضامین رنگا رنگ سے ظاہر ہوتی ہے جن پر اُس نے طبع آزمائی کی ہے۔ جس قسم کے شاعرانہ خیالات اُس نے اُن معمولی چیزوں سے پیدا کیے ہیں جن پر اور ہندوستانی شاعروں نے لکھنا یا تو کسر شان سمجھا یا ان کو لکھنے کی قابلیت ہی نہ تھی — انھی کو ہندوستانی محققین ناواقفیت سے اسی بات کا نہایت یقینی ثبوت خیال کرتے ہیں کہ وہ کوئی شاعر نہ تھا۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اُس نے اس قسم کی متبذل چیزوں پر لکھا ہے، آٹا، دال، ککڑی، مچھر۔ اُس کی طبیعت کی رنگا رنگی اور اس کی تخیل کی قوت علاوہ بریں اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اُس نے ایک ہی چیز کی مختلف نظموں میں مختلف پہلو سے مختلف تصویریں دکھائی ہیں۔ اُس کا دیوان خاصا تصویروں کا ایوان ہے جس میں ہندوستان کے رہنے والوں کے کھیل تماشے، عیش، تفریح، رنج، غم، دل دماغ سب کی بولتی چالتی تصویریں نظر آسکتی ہیں۔

"نظیر طبیعت دفطرت، اور ہر قسم کی انسانیت کے ساتھ ایک گہری ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ ہر چیز میں خوبی پاتا تھا۔ وہ خوش ہے جب گروہ کا گروہ خوش ہے۔ وہ ان کے کھیل تماشوں سے مزہ لیتا ہے — وہ اُن کی مصیبتوں سے دُکھ پاتا ہے۔ صرف یہی ایک شاعر ہے جس نے لڑکوں کے پیار اور محبت کو لکھا ہے اور صرف یہی ایک شاعر ہے جس کو غریبوں، مفلسوں، بے کسوں، مصیبت زدوں اور سب سے کس مپرس خدا کی مخلوق کے ساتھ جوش ہمدردی ہے۔ جیسا کہ اس نے اِس مضمون کو نہایت عمدہ طور سے اپنی اس عمدہ نظم کے مقطع میں ظاہر کیا ہے جو اُس نے آدمی نامے

کے نام سے انسان پر لکھی ہے:۔

اچھے بھی آدمی ہی کہاتے ہیں اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

پاک عشق کی تصویر اس نے جو کھینچی ہے وہ اس کا حصہ ہے اور اسی لیے اس نے کھینچی بھی خاصی ہے۔ اس کے کلام کا سب سے عمدہ حصہ کسی مطبوعہ مجموعے میں نہیں ہے جو اس کے نام سے چھپا ہے۔ اُس کا اس قسم کا کلام صرف رمتے[1] ہوتے فقیروں (آزادوں) اور ناخواندہ اشخاص کی زبانی سنا جاتا ہے جو کہ اپنے سینوں میں اس انسانی فطرت کا کچھ بہتر احساس رکھتے ہیں جس کے نقش و نگار نظیر نے اس خوبی سے دکھاتے ہیں۔ یہ ناخواندہ اشخاص اپنی پسند کی نظمیں زبانی رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے پڑھے لکھے حضرات اپنی پسند کے شعرا کا کلام زبانی نہیں رکھتے۔۔۔ اور ان کی ایک بہت بڑی جماعت ان مقبول نظموں کو رغبت سے سنتی اور متلذذ ہوتی ہے اور اس لذت اٹھانے میں اپنا وقت کہیں زیادہ صرف کرتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ پڑھے لکھے اشخاص کہیں کہیں اپنے ان غیر اصلی اور لفّاظ شعرا پر صرف کرتے ہوں، جن کے مدّاح ہونے کا وہ دم بھرتے ہیں اور پھر ناخواندہ اشخاص کی خوشی زیادہ گہری بھی ہے۔ اس لیے کہ اُن کا سلیقہ فطری زیادہ سچا ہے اور ان کی رغبت کی شے زیادہ قابل مدحت۔

اُس کے دل و دماغ کی صفائی اور اس کی تحریر کی لطافت اس درجے کی ہے کہ جب وہ کوئی فحش خیال بھی پیدا کرتا ہے دجب کہ یہ بات اس تصویر کی صحت خط و خال اور تکمیل کے لیے ضروری ہوتی ہے)، تو فحش پر اس لطافت کے ساتھ پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ خود ہندوستانیوں کو بھی صاف نظر نہیں آتا، جو اس کثرت کے ساتھ ذو معنی الفاظ اور ضلع جگت کا استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ وہ کسی پاک جذبہ دل کی اعلا خوبیاں تعرّف الاشیاء بالاضداد کے اصول پر بیان کرنے کو ہوتا ہے، تو شہوانی خیال کو دماغ میں دیر تک رہنے اور اُس پاکیزہ خیال کے محو کرنے کی اجازت نہیں

---

[1] پھرتا پھرتا جوگی (م)

ہوتی جس کو نظیر بابرام[1] پڑھنے والے کے پیش نظر رکھتا ہے۔

بعض مضامین شدت سے فحش ہیں مگر شوخی جو سچی اور جان دار نقاشی کے لیے ایک جزو ضروری ہے اس طرح اُس کے کلام میں ملی ہوئی ہوتی ہے کہ فحش بالکل نظر نہیں آتا۔ سر سے پا تک ظرافت اور لطافت چھائی ہے اور بڑی دل موہ رہی ہے۔

نظیر نے مادری زبان کے خزانوں پر اپنا سکہ بٹھا دیا ہے۔ اُس نے اس خصوص میں وہ کام کیا ہے جو صرف سلاطین اقلیم سخن، مثلاً چوسر و شکسپیر کر سکے ہیں۔ اُس نے ہندی الفاظ کو تمام اُن خوش نما ترکیبوں میں ظاہر کیا ہے جن میں وہ ظاہر ہو سکتے تھے اور اپنی ذات پر جوان مردانہ اعتماد کر کے جو ذکاوت کا خاصہ ہے، اُس نے لفظوں کے نئی ترکیبوں اور نئے معنوں میں استعمال کرنے کی جرأت کی ہے اور یہ ترکیبیں اور معنی ہمیشہ خوش آیند ہیں :-

جو کچھ نظیر نے لکھا ہے اُس میں مشکل سے کوئی معمولی مصرعہ ہوگا اور جو کچھ اس نے لکھا ہے اس کا ایک بہت بڑا حصہ بجائے خود ایک مشاہدہ ہے۔ اُس کے خیال کی گہرائی اور اس کی ان نادر ترکیبوں کی قوت جن میں کہ ہر لفظ اظہارِ معنی میں دوسرے کا معاون ہے جس قدر غور کیجیے اُسی قدر ظاہر ہوتی ہے۔ علم والے ہندوستانی اُدبا جن کی کوشش صرف الفاظ کے پیچھے صَرف ہے، وہ رسائی خیالات میں اس قدر کوتاہ ہیں کہ اکثر نظیر کی وسعت و خوبیِ معنی کے سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں، اور وہ اس کی ترکیبوں کی خصوصیتِ مناسبت کو بھی نہیں سمجھتے جو وہ ترکیبیں ان تمام معنی کے ساتھ رکھتی ہیں جو اُن سے نکلتے ہیں اور یہی وہ شاعر ہے جس سے قریب قریب تمام یورپین ناظرین بالکل ناواقف ہیں، اس لیے کہ ہندوستانی اُدبا اس کا نام لینا بھی کبھی پسند نہیں کرتے۔

علم والا گروہ جو کہ نظیر کی قدر دانی کی صلاحیت نہیں رکھتا، اُس کی پرستش کی چیز ناسخ ہے ـــــ ناسخ جس کی تشبیہیں نہایت صناعی کے ساتھ مختلف اور

---

[1] بابرام ـــ ابرام بمعنی استواری۔ (م)

صداقت سے بہت زیادہ دور ہیں اور جس کی زبان عربی اور فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا ایک خاصا میلہ ہے جس میں کسی معمولی ہندی لفظ یا حرف کو صرف اُسی صورت میں شریک کیا گیا ہے جب کہ اُس کی شرکت سے گریز نہیں رہا[1] ۔۔۔۔۔

---

[1] ماخوذ از دیباچہ لغات ہندوستانی و انگریزی مصنفہ ڈاکٹر فیلن۔ صفحہ 8 تا 10۔ (ش)

Price : Rs.19